PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

سیّارہ ڈائجسٹ

مارچ 2020

دبستان کُھل گیا

اصغر ندیم سید

نامور تخلیق کاروں کے شب و روز

اس دبستان میں کلاسیکی ادب سے ترقی پسند ادب کی
تمام بڑی شخصیات ذاتی حیثیت میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں!

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

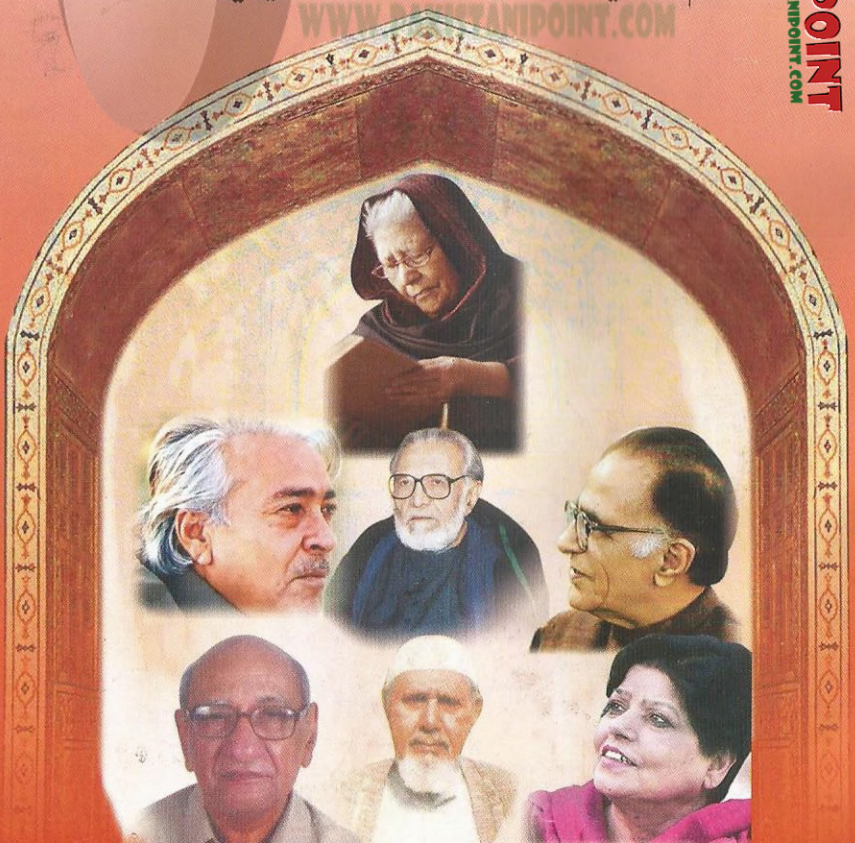

القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الاعراف

تب موسیٰ نے کہا "اے رب، مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرما، تُو سب سے بڑھ کر رحیم ہے۔" (جواب میں ارشاد ہوا کہ) جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا وہ ضرور اپنے رب کے غضب میں گرفتار ہو کر رہیں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلیل ہوں گے۔ جھوٹ گھڑنے والوں کو ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں اور جو لوگ بُرے عمل کریں پھر توبہ کر لیں اور ایمان لے آئیں تو یقیناً اس توبہ و ایمان کے بعد تیرا رب درگزر اور رحم فرمانے والا ہے۔

پھر جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے وہ تختیاں اُٹھا لیں جن کی تحریر میں ہدایت اور رحمت تھی ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اور اس نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو منتخب کیا تاکہ وہ (ان کے ساتھ) ہمارے مقرر کئے ہوئے وقت پر حاضر ہوں۔ جب ان لوگوں کو ایک سخت زلزلے نے آ پکڑا تو موسیٰ نے عرض کیا "اے میرے سرکار، آپ چاہتے تو پہلے ہی ان کو اور مجھے ہلاک کر سکتے تھے۔ کیا آپ اس قصور میں جو ہم میں سے چند نادانوں نے کیا تھا ہم سب کو ہلاک کر دیں گے؟ یہ تو آپ کی ڈالی ہوئی ایک آزمائش تھی جس کے ذریعہ سے آپ جسے چاہتے ہیں گمراہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت بخش دیتے ہیں۔

(آیت 155-150) (بحوالہ تفہیم القرآن۔ از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

الحدیث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دو کے کھانے میں تیسرے کی شرکت

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰنؓ کی روایت ہے کہ اصحاب صفہ غریب لوگ تھے۔ ایک بار حضورؐ نے فرمایا۔

"جس کے گھر دو آدمیوں کا کھانا ہے تو وہ یہاں سے تیسرے کو لے جائے اور جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو تو پانچویں اور چھٹے آدمی کو لے جائے۔

چنانچہ میرے والد ابوبکرؓ اپنے ساتھ تین آدمیوں کو گھر لائے اور حضورؐ اپنے یہاں دس آدمیوں کو لے گئے۔"

حضور گوگوں کے قائد اور پیشوا تھے وہ اگر دس آدمیوں کو اپنے یہاں نہ لے جاتے تو عام لوگ چار چھ اور آٹھ کو خوشی خوشی کیسے لے جاتے۔ قاعدہ یہ ہے کہ ذمہ دار لوگ اگر ایثار و قربانی کریں گے تو ان کے پیچھے چلنے والوں میں ان سے زیادہ قربانی و ایثار کا جذبہ اُبھرے گا اور آگے چلنے والے ہی پیچھے رہیں تو پیچھے چلنے والوں میں اور پیچھے جانے کی ذہنیت اُبھرے گی۔

(بحوالہ فرمانِ رسول ﷺ نمبر سیارہ ڈائجسٹ)

Pakistanipoint.com

اس شمارے میں.....

2 **القرآن** — تفہیم القرآن — قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے!

3 **الحدیث** — ادارہ — دو کے کھانے میں تیسرے کی شرکت!

14 **دستک** — سید امجد حسین بخاری — حکومتی معاشی پالیسیاں اور 20 لاکھ بیروزگار!

49 **"خود جلیں دیدہ اغیار کو بینا کر دیں"** — قلندر حسین سید — ایسی بے مثال تحریروں کا گلدستہ جنہیں چننے کے لئے درجنوں کتابوں کی عرق ریزی درکار ہوتی ہے!

64 **جنگل کا قیدی** — جاوید اقبال — ایک شکاری کا قصہ جو بغیر ہتھیار ایک آدم خور کے نرغے میں آ گیا تھا!

67 **نوشتہ تقدیر** — جاوید راہی — ایک شخص کا فسانہ جس سے ہمیشہ انجانے میں بھول ہو جاتی تھی!

17 **دبستان کھل گیا** — اصغر ندیم سید — اس دبستان میں ادب کی تمام بڑی شخصیات ذاتی حیثیت میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں!

75 **بچوں کیلئے ہمجولی کزنز کی اہمیت** — ڈاکٹر محمد طارق ایڈل — جو بچے کزنز کے ساتھ کھیلتے کودتے اور مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتے بڑے ہوتے ہیں ان کا اپنے گھر اور خاندان کے ساتھ تعلق زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

Pakistanipoint

81 کتاب زیست کا ایک یادگار باب — ایم بی انجم — ایک انسان کی جدوجہد اور کامیابی کی جستجو کی کہانی!

89 وہ کون تھی؟ — ثروت چوہدری — ایک شخص کی کہانی جسے اجنبی خاتون نے آئینہ دکھادیا تھا!

120 خوشی — کرشن چندر — ایک گڑیا کی کہانی جسے بڑوں کے ہاتھوں میں دیدیا گیا تھا!

133 پُرعزم — عاصمہ زیدی — وطن کے سرفروش سپاہی کی کہانی جو تنہا ملک دشمنوں سے ٹکرا گیا تھا!

147 بے جوڑ رشتے — فرحت قادر — ایک اہم معاشرتی مسئلہ کی طرف توجہ دلاتی پُراثر تحریر

96 ٹکراؤ — نواز خان — اس کا نام انتقام تھا۔ وہ عداوت نگر میں رہتا تھا اور اس کا پیشہ قانون شکنی تھا اس کے سینے میں ابدی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

77 بڑھاپا روکنے والی غذائیں — غذا کے ذریعے جلد کے افعال میں بہتری لاکر جوان نظر آنے میں مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔ — حکیم محمد عثمان

129 زمین پر جہنم — عارف محمود ایل — رُوحوں، چمگادڑوں اور سانپوں کا مرکز امیر کی قصبہ، جہاں جاتے ہوئے انسان کی روح لرز جائے!

154 احساسِ زیاں — محمد شبیر خان — ایک شخص کی کہانی جو راستے سے بھٹک گیا تھا

179 بزمِ شاعری — ادارہ — باذوق قارئین کے کلام وانتخاب پر مبنی مقبول ترین سلسلہ!

167 ذلت والی نوکری — محمد بلال رضوی — دنیا میں ایک ملازمت ایسی ہے جسے دنیا کی مشکل ترین ملازمت کہا جاتا ہے!

173 مندر کا حصار — ایس امتیاز احمد — کالی مائی کے ایک مندر کی پراسرار داستان جو انسانوں سے صدیوں کے فاصلے پر چلا گیا تھا!

189 شہرِ پناہ — دھوم کیتو — ایک حسین عورت کی کہانی جو کبھی شکایت نہیں کرتی تھی!

خواتین کارنر

163 ☆ لیاری کی لڑکیاں اور سائیکل کی سواری
☆ بچوں کو ماں کا دودھ نہ پلانے کا بڑھتا رجحان
☆ فگر سکیٹنگ کی ننھی چیمپئن

165 سیارہ کچن کارنر — جویریہ کامران — نئی اور ذائقہ دار کھانوں کی منفرد تراکیب

206 پگڈنڈی (قسط:3) — نوشابہ اختر — وہ جذبات واحساسات میں گوندھی رشتوں کے بندھن کو آشکار کرتی لازوال تحریر

195 حضرت مادھو لال حسینؒ — پروفیسر غلام رسول — اللہ کے سچے ولی کی زندگی کے حالات وکرامات پر مبنی ایمان افروز تحریر!

Pakistanipoint.com

جلد57 : شمارہ3 مارچ 2020ء
رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

www.facebook.com/sayaradigest
Email:editorsayyara@yahoo.com
sayyaradigest@gmail.com
editorsayyara@hotmail.com
Phone:92-042-37245412
Mobile:0300-9430206

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

ماہنامہ سیّارہ ڈائجسٹ لاہور

مدیر اعلیٰ
امجد رؤف خان

مدیر منتظم
کامران امجد خان

مدیر : محمد ثاقب
معاون مدیران : جویریہ کامران۔روفی خان۔فرحان امجد
سرکولیشن منیجر : بشیر احمد
مارکیٹنگ منیجر : خرم احمد خان۔ 0333-4207684
گرافک ڈیزائنر : ہمایوں نثار
نگران پرنٹنگ : خالد محمود۔محمد توفیق
طابع : اللہ والا پرنٹرز شاہراہِ قائداعظم لاہور

شعبہء اشتہارات : خرم احمد خان۔ 0333-4207684
طارق محمود۔ 0300-4144781

مجلس مشاورت
شوکت افضل ریاض آفندی
فیاض عمر عارف محمود اہل

قیمت 120 روپے

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور سے شائع کیا۔

Pakistanipoint.com

''بات اک شعر کی''

محترم جناب مدیر اعلیٰ سیارہ ڈائجسٹ۔ آپ کے موقر جریدہ میں ہمیشہ ایسی تحریریں شائع ہوتی ہیں جنھیں پڑھ کر انسان کو بیش بہا قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور قاری گھر بیٹھے نت نئے تجربات سے گزرتا ہے۔ ان دنوں میں بڑے شوق سے سیارہ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ایم بی انجم صاحب کی آپ بیتی ''کتاب زیست کا ایک باب'' پڑھ رہا ہوں۔ اس کے واقعات اور ان کی تفصیلات پڑھ کر مجھے حقیقتاً بہت لطف آرہا ہے۔ تاہم گذشتہ قسط میں انھوں نے ایک شعر کا حوالہ دیا ہے جو کچھ یوں تحریر فرمایا ہے کہ:

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشا ہے حالی کی طبیعت بھی

انھوں نے اس شعر کو الطاف حسین حالی کی طرف منسوب کیا تاہم میری معلومات و تحقیق کے مطابق یہ شعر حالی کا نہیں بلکہ حسرت موہانی کا ہے اور اصل شعر کچھ یوں ہے:

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
ایک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

امید ہے اس کی تصحیح فرمادی جائے گی۔

(اظہر زیدی)

بہترین ٹیم ورک

جناب محترم کامران امجد خان صاحب۔ السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا!

سیارہ اپنی مثال آپ ہے۔ اور خوب سے خوب تر ہوتا جارہا ہے۔ جو اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اچھے اور خوب سے خوب تر لکھنے والے سیارہ ڈائجسٹ کی ٹیم کا حصہ بن رہے ہیں جو اس کی کامیابی کا مظہر ہیں۔ اس کے بہترین معیار کی وجہ ہی آپ کا بہت اچھا ٹیم ورک ہے۔ ہماری تحریریں لگانے کا شکریہ۔ مزید میٹر آپ کے پاس ہیں۔ ایک کہانی ''پراسرار دھندلکا'' ارسال خدمت ہے قریبی اشاعت میں جگہ دیں آپ کو اور دیگر سٹاف کو سیارہ ڈائجسٹ کے تمام لکھنے والوں اور تمام پڑھنے والوں کو دعا سلام اپنا خیال رکھئے گا۔

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

اجتماعی ڈپریشن

جناب امجد رؤف خان صاحب۔ ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ۔ السلام علیکم!

آپ کا مجلہ شمارہ فروری ملا اور توصیفی مکتوب بھی؛ سوچتا ہوں کہ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں؛ تعاون کا شکریہ۔ اظہار خیال کے صفحات پر محمد بوٹا مجاہد نے میری ادبی کاوش کو سراہا لیکن ڈاکٹر خالدہ یوسف اپنی عدیم الفرصتگی سے انہیں نہ پڑھ سکیں۔ ان کا کہنا بجا ہے کہ آج ہماری قوم اجتماعی ڈیپریشن کا شکار ہے یہ سچ ہے اسے بھلا کون جھٹلائے؟ کاش کہ وہ صفحہ 57 پر فضول سسٹم پڑھتیں ان کا بچوں کے متعلق متفکرانہ انداز بجا ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام ناقص ہے ہمارے معصوم بچوں کو سکول میں اتنا پڑھایا نہیں جاتا جتنا ٹیچر ان کو ہوم ورک دے دیتے ہیں۔ وہ گھر میں آکر اپنے بڑوں سے اس کے متعلق پوچھتے ہیں کہ

بعض اوقات وہ خود بھی اس سے دم بخود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن ایسا یورپ میں نہیں ہوتا اس لئے آج وہ ترقی کے زینہ پر ہم سے آگے ہیں اور ہم تنزلی کی طرف لڑھکتے گامزن ہیں..... کبھی تو ہمارے دن بھی سنوریں گے۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ! نیک خواہشات۔

(والسلام: قلندر حسین سید۔ احمد پور شرقیہ)

جادو، خواتین اور اسلام

محترم امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم۔ سیارہ ڈائجسٹ کے خصوصی نمبر اس کی پہچان بن چکے ہیں۔ قرآن نمبر، رسول نمبر، عکس سیرت نمبر، انبیاء کرام نمبر، خلفائے راشدین نمبر اور بے شمار دیگر خصوصی اسلامی نمبرز لاکھوں قارئین کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل شائع ہونے والا خصوصی نمبر ''جادو، خواتین اور اسلام'' بھی قابل قدر کاوش ہے اور یقیناً وقت کی اہم ضرورت بھی۔ ان دنوں جس طرح نام نہاد عاملوں اور جادوگروں نے گلیوں، بازاروں میں اپنے کاروباری اڈے قائم کر رکھے ہیں اور گھروں کو برباد کر رہے ہیں اس کے لیے ضروری تھا کہ اس طرح کا خصوصی نمبر شائع کر کے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست کی طرف لایا جاتا۔ خاص طور پر ہماری خواتین اس قدر زیادہ جادو ٹونے کے چکروں میں پڑ چکی ہیں کہ گھر گھر تعویذات اور جنوں بھوتوں کے چکر چلتے نظر آتے ہیں اور لوگ بے چارے علم اور عمل نہ رکھنے کے باعث جھوٹے عاملوں کے چکروں میں پڑ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس کاوش کو قبول فرمائے۔ یہ خصوصی نمبر یقیناً ہر گھر کی ضرورت ہے۔

(اشفاق حسین، لاہور)

سیکھنے کا عمل

محترم جناب کامران امجد صاحب! السلام علیکم، امید ہے آپ اور ادارے کے تمام اراکین خیریت سے ہوں گے۔ خوبصورت معلوماتی فکری، اصلاحی اور تفریحی تحریروں سے سجا فروری کا سیارہ ڈائجسٹ سامنے ہے۔ اس بار ٹائٹل دلچسپ لگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ اور ادارے کے تمام اراکین کو ہمت اور تندرستی دیئے رکھے تاکہ آپ سب مل کر اسی طرح رسالے کی آب و تاب اور دلچسپی کو قائم رکھ سکیں۔ اس رسالے کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ جس کمال مہربانی سے نئے لکھنے والوں کو جگہ دیتے ہیں وہ لائق تحسین ہے۔

جب بھی کوئی نیا رائٹر لکھنا شروع کرتا ہے تو اس کی تحریر میں جابجا خامیاں نظر آتی ہیں۔ ابتدائی تحریروں سے ہی کوئی بہترین رائٹر نہیں بن جاتا کہ وہ برگزیدہ سخن ور لوگوں کی فہرست میں شامل ہو جائے ''آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک''

جب پرانے لکھنے والے حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے ہیں تو ایک لکھاری ترقی کی منازل زینہ بہ زینہ طے کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ سیکھنے کا عمل تو ساری زندگی قائم رہتا ہے۔ میری تحریروں ''چنیدہ و پسندیدہ'' کو سیارہ ڈائجسٹ میں جگہ دینے کا بے حد شکریہ۔

(بلال رضوی)

پالیسی سے مطابقت

جناب کامران امجد خان صاحب، مدیر منتظم! ایک تحریر ارسال خدمت ہے، اس تحریر کو آپ کی خدمت میں ارسال کرنے سے پہلے میں نے اس

میں کافی قطع و برید پہلے سے کر لی ہے تاکہ اسے کسی بھی قسم کے تنازعہ کا باعث بننے سے بچایا جا سکے خاص طور پر آخری دو صفحے میں نے بدل دیئے ہیں۔ میں نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ کوئی بات آپ کی مرتب کردہ پالیسی سے تجاوز نہ کر پائے! اگر مجھ سے بھول چوک ہو گئی ہو تو مجھے معاف فرماتے ہوئے غلطی کو درست یا حذف کر دیجئے گا۔ بے حد شکریہ۔

(انجم یوسف۔ لاہور)

نواز خان اور قلندر حسین کی تحریریں

محترم ایڈیٹر صاحب ! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ کو پچھلے ایک برس سے باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ ایک دوست کے ذریعے اس سے تعارف ہوا اور پھر اس نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا۔ مجھے محترم نواز خان اور محترم قلندر حسین سید کی تحریریں بہت پسند ہیں۔ یہ دونوں اس قدر جاندار اور اثر انگیز تحریریں ہم قارئین تک پہنچاتے ہیں کہ قاری ان کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر ان کی تحریروں کا خاصا ہے کہ کردار آپ کو بالکل حقیقی اور اپنے آس پاس موجود محسوس ہوتے ہیں۔ ان دونوں سے ملاقات کی شدید خواہش ہے، اگر کسی طرح ممکن ہو سکے تو ضرور بتایئے۔

(نعیم الحسن۔ پشاور)

آزادی اظہار رائے

محترم امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم! سیارہ ڈائجسٹ ہمارا پسندیدہ شمارہ ہے، میرے ابو خود بھی علم و ادب سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ہمارے گھر میں بہت سے رسائل و جرائد آتے ہیں مگر سیارہ ڈائجسٹ کو ان سب میں خاص مقام حاصل ہے۔ یہ ہمارے گھر میں قریب 25 سال سے آرہا ہے۔ اس کے تمام خصوصی نمبر بھی ابو کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ کا خاصا یہ ہے کہ یہ قارئین کی آراء کو خاص اہمیت دیتا ہے اور میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی ہے کہ آپ تمام قارئین اور لکھنے والوں کو کھل کر آزادی اظہار رائے کا حق دیتے ہیں خواہ اُن کی بات ادارہ کے خلاف ہی کیوں نہ جاتی ہو۔ دوسرے شماروں میں یہ چیز عنقا ہے۔ بہرحال میں یہ کہنا چاہوں گا کہ سیارہ ڈائجسٹ علم وادب کی بے حد خدمت کر رہا ہے۔ مجھے بالخصوص قلندر حسین صاحب کا سلسلہ ''خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں'' بے حد پسند ہے، اُن کے سلسلے سے ہمیں بہت سی معلومات افزاء باتیں حاصل ہوتی ہیں، وہ ایک ہی جگہ بے شمار ''نگینے'' جمع کر دیتے ہیں۔

(محمد رفیق اعظم۔ کراچی)

کارآمد خطوط

محترم مدیر اعلیٰ امجد رؤف خان صاحب! السلام علیکم! اس ماہ بذریعہ ڈاک سیارہ ڈائجسٹ تاخیر سے موصول ہوا۔ سوچا اس میں میری کہانی ہوگی لیکن جب کھول کر دیکھا تو پرچے میں نہ تو میری کہانی تھی اور نہ ہی شاعری تھی۔ میں بڑی حیران ہوئی کہ اس کے باوجود مجھے اعزازی پرچہ ارسال کیا گیا۔ اس عزت افزائی کے لیے میں آپ کی بہت ممنون ہوں اور امید کرتی ہوں کہ اگلے شمارے میں میری کہانی کو ضرور جگہ دی جائے گی۔ اب اگر پرچے پر بات کروں تو سرورق سے لے کر کہانیوں تک سب کچھ بہت اعلیٰ تھا۔ خاص طور پر قارئین کے خطوط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اچھا اب اس اُمید کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ اگلی دفعہ میری کہانی کو جگہ ملے گی۔ اللہ حافظ

(نائلہ انیس)

وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ

(اور ہم نے آپؐ کا ذکر (سب پر) بلند کر دیا۔ القرآن)

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

پیغمبرِ آخر الزماںؐ کی سیرتِ پاک پر **سیارہ ڈائجسٹ** کی طرف سے ایک لاثانی پیشکش

قیمت: ڈیلیکس اڈیشن: 800 روپے
عام جلد: 400 روپے

عکسِ سیرت

''میں نے جب یہ کتاب ختم کی تو اونچی آواز میں، جسے میں بھی صاف سُن سکوں، ایک بار پھر کلمہ پڑھا۔ گویا اپنے آپ سے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔'' (عبدالقادر حسن، مشہور صحافی)

یہ ایمان افروز کتاب خود بھی پڑھیے اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھائیے

سیارہ ڈائجسٹ - 240 مین مارکیٹ، ریواز گارڈن لاہور

فون: 042-37245412

حکومتی معاشی پالیسیاں اور 20 لاکھ بیروزگار!

اخبارات میں عموماً کاروباری دنیا کے معاملات کیلئے ایک صفحہ مخصوص کیا گیا ہوتا ہے، جہاں عام آدمی کو مارکیٹ کے حالات سے باخبر رکھا جاتا ہے۔ لیکن گزشتہ ایک سال سے اوسطاً چھ کاروباری خبریں روزانہ پہلے صفحے یعنی فرنٹ پیج پر نظر آتی ہیں۔ یہ خبریں اچانک اتنی اہم کیوں ہوگئیں؟ اس کا جواب بالکل سادہ ہے کہ حکومت کی ناکام پالیسیوں کے باعث ملکی معیشت منجدھار میں گھری ہوئی ہے۔ آئے روز ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خسارے کی کوئی ایسی لہر چلے گی جو منجدھار میں پھنسی اس معیشت کو خدانخواستہ ڈبو دے گی۔

اکثر سوچتا ہوں کہ حکومت کی پالیسیوں میں اگر بہتری نہ آئی تو پاکستانی مارکیٹ کسی بحران کی زد میں آ کر کریش ہی نہ ہوجائے۔ ماہرین معیشت گزشتہ ایک سال سے حکومت کو مسلسل خطروں سے آگاہ کررہے ہیں۔ لیکن حکومت ہے کہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے اس گمان میں مبتلا ہوگئی ہے کہ سب ہی اچھا چل رہا ہے۔ روپے کی قدر گری تو مارکیٹ میں بھونچال آ گیا، رہی سہی کسر برآمدات اور درآمدات کے عدم توازن نے پوری کردی۔ حکومت نے دعویٰ کیا کہ ملک کی شرح نمو 3.3 فیصد ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ 1.9 فیصد تھی۔ حیران کن امر یہ ہے کہ یہ شرح نمو جنگ زدہ افغانستان سے بھی کم ہے۔ پاکستان شرح نمو میں جنوب ایشیائی ممالک میں سب سے کم ہے۔ ایک جانب پاکستان میں شرح نمو سب سے کم ہے، لیکن یہاں شرح سود دنیا میں سب سے بلند ترین سطح پر ہے۔ ان دو عوامل کے باعث ملک میں افراط زر میں اضافہ ہوا۔ صنعتوں کا پہیہ رُک گیا۔ 10 لاکھ کے قریب لوگ بیروزگار ہوئے۔ ٹیکس کولیکشن میں مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی معاشی اعتبار سے ایسی ناکامیاں اٹھائیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ رواں سال ملک میں شرح نمو 1.3 فیصد رہنے کا امکان ہے۔ یعنی اس سال کم از کم 12 لاکھ مزید افراد بیروزگار ہونے کا خدشہ ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ایک کروڑ نوکریاں فراہم کرنے کا دعویٰ

کرنے والی تحریک انصاف اپنے اقتدار کے دو سال مکمل ہونے پر 22 لاکھ افراد کی نوکریوں کی قربانی لے چکی ہوگی۔

حکومت نے معیشت کو سہارا دینے کیلئے شرح سود بڑھائی۔ کچھ لوگوں نے سرمایہ کاری کی۔ اب پاکستان جونہی شرح سود میں کمی کرے گا، سرمایہ کار بینکوں سے اپنا پیسہ نکلوالیں گے، جس کا نتیجہ ایک اور تباہی کی صورت میں سامنے آئے گا۔ ملک میں چینی اور گندم کی مقدار کم پیدا ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود بیرون ملک برآمد کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ تاجروں نے نہ صرف گندم برآمد کی، بلکہ فائن آٹا، سوجی، پراٹھے اور سویاں بھی برآمد کردیں۔ اپنی زرعی اجناس چند روپوں کے فائدے کیلئے برآمد کی گئی، مگر اب وہی گندم دگنی قیمت پر درآمد کی جارہی ہے۔

اس سال بھی ملک کی زرعی پیداوار ماضی کی نسبت خطرناک حد تک کم ہونے کا خدشہ ہے۔ لیکن تاحال اسے بہتر بنانے کیلئے کوئی اقدامات نہیں کیے جارہے۔ سرکار کی ناقص پالیسیوں کے باعث سرمایہ دار ٹیکس ادا نہیں کررہا، جبکہ حکومت یوٹیلٹی بلز کے ذریعے عوام سے پیسے بٹور رہی ہے۔

حکومت کی جانب سے معاشی اصلاحات کے دعوے تو کیے جارہے ہیں، لیکن اس کے اثرات عام آدمی تک منتقل نہیں ہورہے۔ ماہرین معیشت کے مطابق پاکستان کو شرح سود کو چار سے پانچ فیصد تک لانا ہوگا، جبکہ برآمدات اور درآمدات میں عدم توازن کو بھی ختم کرنا ہوگا۔ اس عدم توازن کو اگر آسان الفاظ میں سمجھا جائے تو جس ملک کی جتنی زیادہ برآمدات ہوں گی، وہاں کی معیشت اتنی تیزی سے بہتر ہوگی۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ پاکستان درآمدات پر انحصار کم کرے، مقامی صنعت کو فروغ دے۔ لیکن درآمدات کو قابو میں رکھنے کیلئے اسمگلنگ کو کنٹرول کرنا بھی لازمی ہے۔ اس وقت ملکی معاشی ابتری کا الزام صرف عمران خان حکومت کو دیا جاتا ہے، لیکن یہ درست نہیں ہے۔ اس معاشی ابتری کا سفر ستر کی دہائی میں شروع ہوا، جو آج تک جاری ہے۔

پاکستان میں پہلے براہ راست انتخابات دسمبر 1970 میں ہوئے۔ ان متنازعہ انتخابات کے نتیجے میں مشرقی پاکستان ہم سے علیحدہ ہوا، ساتھ ہی اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پالیسیوں کے نتائج ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ قیام پاکستان کے پہلے پچیس برس میں یہاں کی شرح نمو 6.8 فیصد سالانہ تھی۔ لیکن بھٹو قیادت کے دوران یہ شرح 4.8 فیصد تک پہنچ گئی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں، جن میں سے چند ایک اس بلاگ میں پیش کروں گا۔

پہلی وجہ، پاکستان کی زراعت ہے۔ قیام پاکستان کے وقت زراعت ہی اس ملک کی بنیاد تھی۔ لیکن بھٹو کی پالیسیوں نے زراعت کے ساتھ صنعت کو بھی مضبوط کیا۔ یعنی اس ملک پر سرمایہ دارانہ نظام کا راج ہوگیا۔ کسان کی زندگی دن بدن اجیرن ہوتی گئی۔ لیکن صنعتکار کی صنعتیں پھلنے لگیں۔ اس ملک پر کسان نہیں بلکہ تاجروں کا راج ہونے لگا۔ ایوان سے لے کر دکان تک ہر پالیسی صنعتکاروں کا تحفظ

کرنے لگی۔ یہ تاجر ملک کے بجائے اپنے مفاد کیلئے سوچنے لگے۔ ایک جانب حکومت سے سبسڈی حاصل کی جانے لگی، جبکہ دوسری جانب کسانوں کو خام مال کی قیمت بھی کم ملنے لگی۔ سرمایہ دار کو خام مال اگر بیرون ملک سے کم قیمت پر ملتا ہے تو اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ مقامی کسان کی فصل ضائع ہو یا وہ اونے پونے داموں بیچ دے۔ نتیجتاً پاکستانی کسان نے فصلوں کی جانب توجہ کم کردی اور ملک کا زیر کاشت رقبہ بھی تیزی سے کم ہونے لگا۔

اسی نظام کی بدولت پاکستان کی درآمدات بڑھنے لگیں۔ مشرف دور حکومت میں پاکستان اگر سو ڈالر کی اشیاء بیرون ملک بھیجتا تو اسے ایک سو پندرہ ڈالر کی اشیاء منگوانا پڑتیں۔ آصف علی زرداری اور نواز شریف کے دور میں یہ فرق تیزی سے بڑھنے لگا۔ آج پاکستان 100 کے مقابلے میں 230 ڈالر کی اشیاء درآمد کرتا ہے۔ یعنی ملک سے سرمایہ تیزی سے بیرون ملک جا رہا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت غیر ضروری اشیاء کی درآمد پر پابندی لگائے۔ عام آدمی کا حکومت پر اعتماد بحال کیا جائے تاکہ وہ ٹیکس ادا کرے۔ ملک میں بہتر معیشت کیلئے ضروری ہے کہ یہاں سیاسی استحکام بھی رہے۔ حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کے ساتھ مسائل کا حل بھی بتایا جائے۔ کسانوں کا معیار زندگی بہتر بنایا جائے۔ صنعت کاروں کے بجائے کسانوں کو سبسڈی دی جائے تاکہ وہ جانفشانی کے ساتھ اس سونا اگلتی مٹی سے اپنا پیار بحال کریں۔ حکومت کیلئے بھی ضروری ہے کہ شرح نمو کو بہتر بنائے اور ماہرین معیشت کے خدشات پر غور کرے، کیونکہ مزید لوگ بے روزگاری کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

(سید امجد حسین بخاری)

Pakistanipoint.com

دبستان کھل گیا

''دبستان کھل گیا'' اصغر ندیم سید کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو اُن کے ادب اور فنون لطیفہ سے شغف کے مختلف تخلیقی میڈیمز (MEDIUMS) سے تعلق رکھتا ہے۔

سب جانتے ہیں سید صاحب فکشن' شاعری' ڈرامہ' فلم اور ٹیلی ویژن کے مختلف شعبوں کا عملی تجربہ رکھتے ہیں اور اسی نسبت سے گزشتہ بیس سالوں سے مختلف یونیورسٹیوں میں ڈرامے اور فلم کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اس لئے یہ مضامین ان کے تخلیقی کینوس کی ہر جہت کی DYNAMICS سے سروکار رکھتے ہیں۔ واقعی عام قاری کے لئے یہ ایک ایسا دبستان کھل گیا ہے کہ وہ اصغر ندیم سید کے ذاتی تجربوں کی دنیا میں قدم رکھ سکتا ہے۔ یہ دنیا ایک عجائب خانہ ہے کہ جس میں فیض صاحب' یوسفی صاحب' نارنگ صاحب' نصرت فتح علی خاں صاحب جیسی عظیم شخصیات کا قرب آپ کو محسوس ہوگا۔ صرف یہاں تک نہیں منٹو' سجاد ظہیر' سبط حسن' منیر نیازی' احمد فراز' انتظار حسین' عبداللہ حسین' قرۃ العین حیدر اور انور سجاد آپ کو اپنی ذاتی حیثیت میں چلتے پھرتے دکھائی دیں گے۔ اس لئے کہ سید صاحب نے ان سب کے ساتھ وقت گزارا ہے اور اس سے بھی زیادہ ان کی فکر کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ میں نے ان مضامین میں کلاسیکی ادب سے ترقی پسند ادب تک کا ایک معنوی ربط محسوس کیا ہے۔ ترقی پسند ادب سے جدیدیت تک اور پھر پوسٹ ماڈرن زمانے تک سید صاحب کو موقع ملا ہے کہ وہ تمام بڑے لکھنے والوں اور بڑے تخلیق کاروں کے ساتھ مجلسی اور عصری حوالوں سے وابستہ رہے ہیں۔ ان مضامین میں ان کی وسعت علمی اور تاریخی صداقتوں سے نئے معنی تلاش کرنے کی جستجو محسوس ہوتی ہے۔

(ایڈیٹر)

منیر نیازی کا آخری دن

منیر نیازی نے اردو کی شعری روایت میں نرگسیت کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ برابر کر دیئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی بذلہ سنجی ان کا اضافی جوہر تھا جس نے نرگسیت کو ہمارے لئے قابل قبول بنائے رکھا۔ آج کل لاہور میں محفلیں منیر نیازی کے جملوں اور باتوں سے آباد ہوتی ہیں۔ جاتے جاتے بھی منیر نیازی لاہوریوں کو محفل آرائی کے لئے بہت سی پھلجھڑیاں دے گئے۔ اب تو ہمارے پاس گزرے وقتوں ہی کی راکھ ہے جس میں سب سے زیادہ چنگاریاں منیر نیازی کے نام کی ہیں۔ انتظار حسین کے لئے تو منیر نیازی گزرا ہوا وقت نہیں ہے آج کی بات ہے کیونکہ انتظار صاحب کے لئے گزرا ہوا وقت گوتم بدھ سے شروع ہوکر 1857ء پر آ کے ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کا زمانہ ان کے لئے گنے کی

پھوک ہے بس ایک ایسا زمانہ ہے جس میں آدمی گم متھان بولایا بولایا سا پھر رہا ہے۔ منیر نیازی اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں پریم چند کی کہانی ''اماوس کی رات'' کا وہ کردار بن کے رہ گئے تھے جو دیوالی کی رات اپنے مہاجن باپ کے کھاتے کھتونیاں کھول کے بیٹھا ہے جس میں لاکھوں روپے کا حساب قرض خواہوں کے نام نکلتا ہے مگر مہاجن کے مرجانے کے بعد وقت بدل چکا ہے۔ ان لاکھوں روپوں کی ادائیگی کرنے والے اب دنیا میں نہیں رہے۔ دوسری طرف اس کی بیمار بیوی کے علاج کے لئے پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ وہ ان کاغذوں کو لے لے کر پھرتا ہے کوئی ان کاغذوں کا مول نہیں لگاتا منیر نیازی بھی اپنی جائیداد کے کاغذات کسی ریاست کے معزول شہزادے کی طرح لے لے کر پھرتے تھے ان کاغذوں میں کیا تھا خود انہیں بھی معلوم نہیں تھا بس اتنا کہتے تھے کہ گوجرانوالہ میں ان سے فراڈ ہوا ہے۔ میرے نام اتنی زمین نکلتی ہے۔ ساہیوال میں رشتہ داروں نے دھوکے سے اپنے نام بہت کچھ کرالیا ہے' خان پور پیچھے چھوڑ آیا تو ادھر پھر سے خان پور نہ مل سکا۔ ایک دن مجھے طلب کیا اور کہا کہ مجھے گورنر صاحب سے ملوا دو میں لے گیا گورنر صاحب نے پوچھا ان کاغذوں میں کیا ہے۔ کہنے لگے پتہ نہیں یہ کسی کو دکھا کے میرا حق مجھے دلوائیں انہوں نے تحصیلدار کو طلب کیا۔ بات چلی مگر زندگی نے وفا نہ کی وہ کاغذ اب بھی کہیں ہوں گے۔

انہوں نے اپنی ایک کابینہ تشکیل دے رکھی تھی جس میں وزیروں کے عہدے وہ حسب منشا حالات کے مطابق بانٹتے اور چھینتے رہتے تھے۔ میں کئی بار اپنے عہدوں سے معطل ہوا پھر بحال کیا گیا۔ یہ میری کارکردگی پر منحصر تھا آخری زمانے میں انہوں نے مجھے بلایا اور کہا' میں تمہیں آج سے وزیر خزانہ بناتا ہوں۔ میں نے عرض کیا ظل الٰہی خزانہ کہاں ہے۔ میں بخوشی اسے سنبھالنے کو تیار ہوں۔ کہنے لگے' بے وقوف آدمی اگر خزانہ ہوتا تو پھر وزیر خزانہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ خزانہ نہیں ہے اسی لئے تمہیں وزیر بنایا ہے کہ خزانہ جمع کرو۔ خزانے میں کچھ ڈالو۔ میں سمجھ گیا' میں نے کہا' عالی جاہ خزانے میں ایک مشاعرے کی کمائی جمع ہوتی ہے تو آپ افراط زر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میں خزانے کا بوجھ کیسے اُٹھاؤں۔ خیر آخری زمانے میں ان کے فلیپ لکھنے' مشاعروں میں جانے اور تقریبات کی صدارت کرنے کی DEAL میں ہی کیا کرتا تھا اور آخر میں بتاؤں گا کہ ایک ایسے ہی دن وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ جب میں صدارت کے لئے لفافے سمیت ان کا انتظار کر رہا تھا..... اشفاق احمد نے بھی آخری دنوں میں مجھے اپنا نائب مقرر کیا تھا کہ میں ان کی جگہ کتابوں کے فلیپ لکھا کروں۔

منیر نیازی کی کابینہ میں فاطمہ حسن داخلہ امور کی وزیر مملکت تھیں اور وہ ان سے ایسے خوش تھے جیسے آصف زرداری' رحمان ملک سے خوش ہیں۔ منیر نیازی کو ہم خاں صاحب کہتے تھے خاں صاحب نے بے شمار لوگوں کو وزیر بے محکمہ بنا رکھا تھا۔ ان میں سے جو لوگ شام کو لفافے میں کچھ لے آتے تھے خاں صاحب فوراً انہیں وزیر بے محکمہ سے وزیر آبپاشی بنا دیتے تھے۔ میں نے پوچھا خاں صاحب یہ وزیر

آبپاشی نہیں وزیر آبکاری ہونا چاہئے۔ کہنے لگے' آبکاری کے سارے قافیے اتنے بُرے ہیں کہ جیسے صوفی کا قافیہ کوفی ہوتا ہے۔ اگر حقیقت میں خاں صاحب کسی ریاست کے نواب یا کسی مملکت کے فرمانروا ہوتے تو ہم جیسوں کی لاٹری لگ جاتی اس لئے کہ خاں صاحب جس سے خوش ہوتے تھے خزانہ لٹانے کی بات کرتے تھے۔ خزانہ چونکہ نہیں ہوتا تھا اس لئے ان کی سخاوت سمجھ میں آتی ہے۔ ایک بات میرے دل میں اٹکی ہوئی ہے کہ خاں صاحب جتنے خوبصورت تھے اور جتنے بڑے اور طرح دار شاعر تھے اتنی ان پر دیویاں مہربان نہیں ہوئیں۔ ان کیساتھ میں فیض اور فراز تھے جن کے قصے ختم ہونے میں نہیں آتے اور قصوں کے کردار زندہ پائندہ موجود ہیں۔ فراز کے معاملے میں مبالغہ بھی کرلیں تو بھی وہ منیر نیازی سے دس قدم آگے دکھائی دیتے ہیں۔ فراز کی وفات سے صرف ایک سال پہلے کا واقعہ ہے کہ محسن احسان' احمد فراز اور میں امریکہ کے ایک مشاعرے میں آرلینڈو کے شہر میں ایک ہی ہوٹل میں براجے' فراز صاحب کو اگلی فلائٹ سے آنا تھا اس لئے میں اور محسن احسان چونکہ ایک کمرے میں تھے اس لئے ہم فراز صاحب کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

میں آرلینڈو کے مقامی وقت کے مطابق گیارہ بجے اپنے تمام تر فرائض منصبی ادا کر کے بستر پر لیٹ گیا تھا کہ اچانک مجھے پتہ چلا محسن احسان نے فون ملا کے ہوٹل کے کمرے میں وہ چینل ڈالرز دے کر حاصل کرلیا ہے جسے اوباش نوجوان بھی برقعہ پہن کے دیکھتے ہیں۔ محسن احسان کا ایک احسان مجھ پر رہیگا کہ انہوں نے SOUND کو دبا کے رکھا۔ اتنے میں دستک ہوئی ..... چھاپہ..... میں کمبل میں سے پکارا۔ محسن احسان نے ہڑبڑا کر ریموٹ سے ٹی وی آف کردیا۔ دروازہ کھولا تو سامنے احمد فراز کھڑے تھے۔ ان کی فلائٹ اب پہنچی تھی ان کا کمرہ ہمارے برابر تھا۔ وہ اندر آئے تو میں نے کہا' فراز صاحب دارو موجود ہے۔ کہنے لگے' میں اپنا مال غنیمت ساتھ رکھتا ہوں۔ اگلے دن صبح میں اور محسن احسان لفٹ میں داخل ہوئے تو ایک حسینہ مرجاں فزا' روح افزا بلکہ ہوش ربا پہلے سے موجود تھی۔ ہمیں انڈین سمجھ کر گویا ہوئی کہ آپ کو جانکاری ہوگی کہ احمد فراج کس کمرے میں ہیں؟ پہلے تو میرا دل چاہا کہ میں کہوں

انتقالِ پُرملال

ہم انتہائی دُکھ اور رنج کے ساتھ یہ اطلاع قارئین سیارہ ڈائجسٹ تک پہنچ رہے ہیں کہ ہمارے دیرینہ ساتھی اور مستقل قلمکار محمد سلیم اختر گذشتہ دنوں راولپنڈی میں انتقال کرگئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ سلیم اختر نے سیارہ ڈائجسٹ کیلئے بے شمار یادگار کہانیاں لکھیں' انکی تحریریں ملک کے دیگر رسائل و جرائد کی زینت بھی بنتی رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کے درجات بلند اور انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں۔ آمین۔ قارئین سے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

(ادارہ)

میرے کمرے میں ہیں' آپ بھی آجایئے مل بیٹھیں گے دیوانے دو مگر وہ تو دیوانی نکلی احمد فراز کی۔ محسن احسان نے طوہاً و کرہاً فراز کے کمرے کا نمبر دے دیا۔ اب ذرا ٹائم کو آگے کرلیں یعنی دن کے تین بجے ہیں احمد فراز ہم سے ملے محسن احسان نے کہا' فراز وہ ایک انڈین لڑکی نما عورت تمہارا پوچھ رہی تھی۔ فراز صاحب نے کہا' ہاں وہ آئی تھی اور وصال کے سارے مراحل طے ہوگئے ہیں۔ محسن احسان کا منہ لٹک گیا۔ انہیں اپنے رات کو خرچ کئے گئے ڈالرز کا بہت ارمان ہوا۔ جب فراز صاحب آگے نکل گئے تو محسن احسان نے کہا' فراز جھوٹ بول رہا ہے کچھ بھی نہیں ہوا۔ میرا تجربہ ہے کہ یہ ہمیشہ ہرافیئر کو مبالغے کے ساتھ بیان کرتا ہے اور اس کے اندر کا ہیرو نچلا نہیں بیٹھتا۔ اب ہیرو تو منیر نیازی میں بھی تھا لیکن وہ تو ہیروئن سے بس یہ چاہتا تھا کہ وہ اسے دیوتا بنا کے پوجتی رہے۔ ریڈیو پاکستان میں ایک بے چاری کرماں ماری اس پر عاشق ہوگئی تھی۔ خاں صاحب اس کو لئے لئے پھرے۔ اس کے بعد خاں صاحب کو پتہ ہی نہیں چلا کہ انہیں محبت کے جذبے کے لئے کس طرح کا اظہار چاہئے۔ جب ان کی پہلی بیگم کی وفات ہوئی تو یہ 1983ء کے آس پاس کی بات ہے۔ میں جب ان سے جنازے کے پاس جا کر گلے لگا تو بے تحاشا روتے ہوئے کہنے لگے' صغریٰ چلی گئی اب کون مجھے سنبھالے گا۔ چہلم کے اگلے روز دوسری شادی کرلی۔ انہوں نے فیصل آباد میں مشاعرہ پڑھا اور اپنی مشہور نظم پڑھ دی' ہمیشہ دیر کردیتا ہوں میں۔ سامعین میں سے کسی دل جلے نے کہا' دوسری شادی میں تو دیر نہیں کی۔ اب اس دل جلے کو کون سمجھائے کہ منیر نیازی خود کو اللہ کی طرح اکیلا تصور کرتا تھا۔ اس نے کئی جگہ کہا ہے کہ میں اللہ کی طرح اکیلا ہوں۔

منیر نیازی نے چڑیلوں اور بھوت پریت سے ہمیشہ بھاگنے کی کوشش کی لیکن یہ سب اسے ساری زندگی چمٹے رہے۔ بات اتنی سی ہے کہ چڑیلیں اور بھوت پریت اس کے اپنے پیدا کئے ہوئے تھے جس سے خوش نہیں ہوتے تھے اسے اسی طرح کا نام دے دیتے تھے۔ انہوں نے انسانوں کے لئے دو درجے رکھے تھے ایک طیب اور دوسرا خبیث۔ مثلاً مجھے سے کہتے تھے امجد اسلام امجد خبیث اور عطاء الحق قاسمی طیب ہے۔ میں کہتا خاں صاحب کل آپ نے یہ بات اُلٹ کر کے کہی تھی۔ کہتے' یار ہوگیا ہوگا پتہ نہیں چلتا کون طیب ہے اور کون خبیث۔

کبھی کبھی اپنے COMMENT میں بہت بے رحم بھی ہوجاتے تھے اور کسی کو نہیں بخشتے تھے۔ ان کے منہ سے بہت کم لوگوں کی تعریف میں نے سنی ہے۔ حساب موقع پر چکاتے تھے ایک بار ایک مضافاتی شاعر ان کے لئے شہد لے کر حاضر ہوا اور اسی بنیاد پر منیر نیازی نے اس کی شاعری بھی سنی اور شہد کے حساب سے داد بھی دی اسے چھوڑنے باہر نکلے تو دہی بڑے کی ریڑھی کے پاس سے گزرے تو شاعر نے کہا' سر ایک ایک پلیٹ ہوجائے۔ جب دہی بڑے لے چکے تو شاعر نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پتہ چلا پیسے لانا بھول گیا ہے۔ اس نے کہا' سر پیسے آپ ادا کردیں میں تو بھول آیا ہوں۔ فوراً ہی اسے کہا' اک

تے توں شاعر بھیڑا ایں دو جا پیسے وی جیب اچ نئیں رکھدا۔

اسی طرح ایک دفعہ 1973ء کی بات ہے' ملتان آئے۔ پی پلا کے فارغ ہوئے تو کہنے لگے مجھے ویران جگہ سے چاند کو دیکھنا ہے۔ اتفاق سے اس روز چودھویں کا چاند تھا۔ میں نے اپنی موٹر سائیکل پر بٹھایا اور قلعہ کہنہ قاسم باغ کے کھنڈرات میں لے گیا۔ اچانک موٹر سائیکل لڑھکتا ہوا کھائی میں گر گیا شدید چوٹیں لگیں گرتے ہی جو پہلا جملہ انہوں نے بولا وہ یہ تھا۔

ایس لئی فیض احمد فیض منڈیا کھنڈیاں نال نئیں پھردا

ایسے بہت سے واقعات ہیں جو سینہ بہ سینہ چلتے رہیں گے۔ اتفاق سے جو منیر نیازی کے ہاتھ سے آخری تحریر لکھی گئی وہ صرف میرے پاس محفوظ ہے۔ شروع میں ذکر کیا تھا کہ ایک ایسے ہی دن جب میں ان کے نام کا لفافہ لئے کھڑا تھا وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ تو وہ واقعہ یہ ہے کہ جس شام منیر نیازی کا انتقال ہوا اس شام سید محمد جعفری کی یاد میں تقریب کے لئے میں نے منیر نیازی کو صدارت کے لئے راضی کر لیا تھا اور ان کی خدمت میں اعزازیہ طے بھی کرا لیا تھا۔ ان کو لینے گاڑی بھیجی جو قدرے تاخیر سے خالی واپس آ گئی۔ ایک کاغذ ڈرائیور نے مجھے دیا جس پر لکھا تھا ''اصغر! میری طبیعت خراب ہے نہیں آ سکتا'' یہ تحریر بالکل اسی طرح لکھی ہوئی تھی جس طرح ای سی جی پر دل کی بے ترتیب دھڑکن آڑھی ترچھی لکیروں میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ تحریر چند لمحوں بعد ایک لمبی لکیر میں تبدیل ہو گئی۔

کشور ناہید کا پورٹریٹ

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ کشور ناہید کو جانتا ہے تو وہ خوش فہمی کا شکار ہے۔ کشور کو کوئی نہیں جان سکتا۔ وہ ہم پر اتنا ہی ظاہر ہوتی ہے جتنا وہ چاہتی ہے کہ ہم اسے سمجھیں۔ باقی جو کچھ وہ ہے آپ کے اندازوں پر منحصر ہے۔ اس لئے اکثر اندازے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ کسی نے چھپن چھری کہا' کسی نے کہا وہ اندر خانے سرکار سے ملی ہوئی ہے۔ یہ دونوں باتیں اسے بغیر جانے کی گئیں اور بُری طرح غلط ثابت ہوئیں اور جو کچھ کشور نے اپنے متعلق خود نوشتوں میں لکھا ہے یہ تو صرف ایک سطح ہے جسے اس نے چھوا ہے باقی کی LAYERS تو اس نے اپنے اندر سمیٹ رکھی ہیں وہ تنہائی میں اکیلی خود سے ان LAYERS کے ساتھ ملتی ہے۔ اس ملاقات میں اس کے بیٹے بھی اس کے ساتھ شریک نہیں ہوتے اس کی خود نوشتیں اس کی نہیں اس کے زمانے اور دوستوں کی ہیں جن کے درمیان وہ بس موجود ہے وہ خود کو کب لکھے گی' اس کا مجھے احساس ضرور ہے علم نہیں ہے۔ اسکا جو بھی پبلک امیج ہے وہ اس نے جان بوجھ کے بنایا ہے تاکہ غیر ضروری اور حسرتوں کے مارے کچے پکے ادیبوں اور شاعروں کو خود سے دور رکھا جائے اس کے دو سینگ ہیں جو کسی کو دکھائی نہیں دیتے۔ دراصل یہ سینگ اس کے وہ جملے ہیں جو SELF DEFENCE کے طور پر ناپسندیدہ لوگوں کے بیٹھنے سے پہلے ہی بول دیتی ہے اور انہیں ان سینگوں پر اُٹھا کر پھینک دیتی ہے۔ ایسا AGRESSIVE انداز اگر وہ اختیار نہ کرتی تو ہر وہ ادیب اور شاعر

جو بیوی سے بھی نہیں کہہ سکتا کہ بھلی مانس میں تم سے شوہر کی حیثیت میں پیار کرتا ہوں' دوسری ملاقات میں کشور کو پرپوز کر دیتا ہے اور جب کشور ہاں کر دیتی ہے تو اُلٹے پیروں سے بھاگ جاتا۔ ایسے لوگوں کے لئے اس نے اپنی شخصیت میں دل پر جبر کر کے ایک ANGRY WOMEN اور AGRESSIVE باغی عورت کا روپ دھارا۔ جو ایسے لوگوں کو اپنے سے دُور رکھنے کا ایک سیلف ڈیفنس میکنزم تھا جو کسی بھی لبرل شاعرہ کو کسی بھی امیج سے لیبل کر کے خود سے اپنی مرضی کا نتیجہ نکال لیتے ہیں۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے اساتذہ فیض' صوفی تبسم' ڈاکٹر نذیر اور پروفیسر اجمل کی تعلیم و تربیت یافتہ یوسف کامران کے ساتھ جب ادب کی دنیا میں آئی تو برصغیر کی ایک بڑی روایت کی نمائندگی کرنے کے لئے اسے اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج جہاں سے خوشونت سنگھ' بلراج' ساہنی' کامنی کوشل' بی آر چوپڑا' پران نیول' ڈاکٹر عبدالسلام' ہر بند کھرانہ (دونوبل لارئیٹ) اور علامہ اقبال کی روایت کی پاسداری تو اسے کرنی تھی۔ اور وہ آج تک اس روایت کی پاسداری نبھا رہی ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ پاکستان INTELECTUALLY وہ نہیں رہا جو کشور ناہید کے گورنمنٹ کالج کے وقت تھا لیکن وہ مسلسل اپنے پاکستان کو اقبال' فیض' صوفی تبسم' شاکر علی اور صادقین کے لائق دیکھنا چاہتی ہے۔ خواتین لکھنے والیوں کے مختلف امیج برصغیر میں رہے ہیں دو کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ایک تو یہ امیج رہا ہے کہ کوئی خاتون شاعری اور افسانہ نگاری میں بڑے تخلیقی جوہر کے ساتھ ابھری اور جلد ہی شادی کے بعد غائب ہوگئی۔ کوئی کوئی غوطہ مار کے پھر نمودار ہوئی مگر وہ پہلے والی بات نہ رہی۔

دوسرا امیج عام ہے کہ یہاں شاعر اور ادیب لڑکیوں کے پیچھے کوئی نہ کوئی مرد اوٹ میں ضرور ہوتا ہے پھر طرح طرح کے افسانے تراشے جاتے ہیں۔ کشور ناہید نے ان دونوں امیجز کو توڑا اور عورتوں کو تخلیقی میدان میں باوقار طریقے سے اپنی جگہ بنانے کا راستہ دکھایا مگر یہ آسان کام نہیں تھا۔ منیر نیازی نے کہا میں اپنی بیوی کا پردہ کشور ناہید سے کراتا ہوں۔ کسی نے کہا' دعوتوں کے زور پر اپنا مقام بنانا چاہتی ہے جبکہ پورے شہر کے ادیب اس کی دعوت میں مدعو ہونے کے لئے تڑپتے رہتے تھے۔ کشور نے جو انداز اختیار کیا اسے عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کا خوبصورت امتزاج کہا جاسکتا ہے۔ تند و تیز جملہ اس نے عصمت سے لیا اور انٹلیکچول GRACE عینی آپا سے لی۔ فیمینیزم کا قصہ ذرا بعد کا ہے۔ اس نے تو انسانوں کے EMANCIPATION کی بات کی ہر طرح کی روایتی سیاسی اور سماجی فرسودگی کیخلاف آزادی کی بات کی۔ اس نے خود کو EMENCIPATE کر لیا مگر رہنا تو اسے مڈل کلاس ادیبوں کے ساتھ تھا انہیں بھی EMENCIPATE کرانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہ بہت بڑا چیلنج تھا اس کے لئے اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے دوست ادیبوں کی بیگمات کو ساتھ بلانا شروع کر دیا۔ مجھے یاد ہے پہلی دعوت میں بڑے تام جھام سے ٹِک سک سے درست طمطراق سے سب اپنی بیگمات کے ساتھ آئے۔ جب بیگمات نے زنانہ ڈبہ بنایا تو کشور نے اسے توڑا۔ اگلی دعوت میں چار

بیگمات غائب' اس سے اگلی میں باقی کی بیگمات فارغ' صرف میری بیگم آخری وقت تک ساتھ رہی جس کا حوالہ کشور کی کتاب میں موجود ہے۔ یہ بیگمات شاید یہ سمجھتی تھیں کہ کشور انہیں SLEEVLES پہنا کر سڑک پر کھڑا کررہی ہے اس ساری کوشش میں وہ صرف اڑھائی مرد EMENCIPATE کراسکیں آدھا تو میں ہوں باقی دو میں ایک انور سجاد ہیں جو اتنے EMENCIPATE ہوگئے کہ بیوی کو طلاق دے کر فن کارہ سے شادی کرلی۔ دوسرے انتظار حسین ہیں جو اتنے EMENCIPATE ہوئے کہ ترقی پسندوں نے انہیں قبول کرلیا۔ کشور نے اپنے دو بیٹوں کے علاوہ ایک اور بچے کو بھی گود لے رکھا تھا جس کا نام زاہد ڈار ہے اپنے بیٹوں سے زیادہ وقت وہ لے جاتا تھا۔ صبح چپکتا تو شام کو گود سے اُترتا تھا۔ ایک دن غصے میں اسے فارغ کردیا۔ زاہد ڈار میرا ہمسایہ تھا کشور کے عاق کرنے کے بعد وہ صبح صبح میرے گھر آنے لگا۔ کتابیں پڑھتا رہتا۔ ایک دن میں نے کشور سے کہا کہ آپ نے اس بے چارے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس پر کشور نے شدید غصے میں ایسا لفظ استعمال کیا جو مجھ سے برداشت نہ ہوسکا میں نے کشور سے بغاوت اور مستقل کٹی کا اعلان کردیا۔ چوتھے روز زاہد ڈار میرے پاس آیا اور کہا' چلو وہ بلا رہی ہے۔ میں نے کہا' یار میں تیری خاطر لڑا اور تُو نے صلح کرلی۔ زاہد کہنے لگا' میرے نال تے روز ای اے ہوندا اے تو خوامخواہ جذباتی ہوگیا ایں' چل او نے کیہا ہے اونوں لے کے آ..... یہی حال کشور نے بھی میرے ساتھ کیا جب جاوید شاہین نے کشور کے متعلق اپنی خودنوشت میں کچھ باتیں لکھیں جو مجھے پسند نہ آئیں تو میں نے جاوید شاہین سے کٹی کرلی۔ چوتھے دن کشور کا فون آیا آجاؤ سب انتظار کررہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہاں سے بول رہی ہیں۔ کہنے لگیں جاوید شاہین کے گھر سے۔ مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے۔ کشور نے اور بھی کئی شاعروں کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔ ان میں حبیب جالب سب سے لاڈلے تھے۔ مارشل لاء کے سخت ترین زمانے میں کوڑوں سے بچانے کیلئے نت نئی کوششیں کرتی رہتی تھیں لیکن وہ اکثر رات کوٹن پکڑا جاتا۔ ایک رات کشور اور ہم دوست تھانے پہنچے ایف آئی آر کٹ چکی تھی اب ساری بچت یورین رپورٹ پر آ پڑی۔ ہم

دُعا

امیدوں کے آگے ٹوٹ جانا اچھا نہیں لگتا
کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اچھا نہیں لگتا
مجھے دینے والوں کی قطار میں ہی رکھنا میرے مالک
ترے در کے سوا کہیں سر جھکانا اچھا نہیں لگتا

(طارق محمود۔ لاہور)

BMA
Since 1952

(زعفرانی)
معجون کبیر

جسم میں بھر دے تازگی اور توانائی

معجون کبیر خالص نباتاتی اجزاء اور زعفران سے تیار کیا جانے والا خاص مرکب ہے جو اعصاب اور اعضائے رئیسہ کو تقویت دیتا ہے۔ طبیعت کے بوجھل پن اور تھکاوٹ کو دور کرتا ہے۔
زائل شدہ قوت کو بحال کر کے جسم میں چستی اور طاقت پیدا کرتا ہے۔

زعفران، شہد اور قدرتی نباتاتی اجزاء سے بنا ایک خاص مرکب
جو جگا دے پُر جوش زندگی کا ایک نیا احساس

info@bmapharma.com www.bmapharma.com
/BMA PHARMA 044-2514023 - 4123

اسے پانی پلاتے جاتے تھے کہ معاملہ DILUTE ہوجائے اور رپورٹ صاف آئے مگر حبیب جالب بار بار کہتے ظالمو نیٹ پانی پلائے جاتے ہو اس میں کچھ ڈالو۔ صبح عدالت میں ضمانت کے لئے پیش ہوئے کشور نے ڈاکٹروں سے ساز باز کرکے یورین رپورٹ بدلوالی تھی۔ عدالت میں جب یورین رپورٹ آئی تو اس میں لکھا تھا حبیب جالب کو اڑھائی مہینے کی PREGNANCY ہے۔ عدالت نے ضمانت لے لی اور لکھا کہ زچہ بچہ کی صحت کا خاص خیال رکھا جائے۔ ایک اور کردار منو بھائی بھی میری مستقل سواری تھی۔ منو بھائی' جاوید شاہین اور احمد مشتاق میرے ہمسائے میں تھے تینوں گھتلاتے تھے جب تینوں بحث کررہے ہوتے تو سننے والوں کا دیوار میں سر ٹکرانے کو دل کرتا۔ ان کا نام کشور نے تھتھوڑا گروپ رکھا ہوا تھا۔ ایک بار ضیاء کے مارشل لاء میں میری مزاحمتی شاعری کے تراجم کی کتاب کی رونمائی کیلئے کشور اور منو بھائی میرے ساتھ ملتان گئے۔ میرے دوست نے اپنے ایک جاگیردار شاگرد کی بڑی کوٹھی میں کشور اور منو بھائی کے ٹھہرنے کا انتظام کیا ہوا تھا جب وہاں پہنچے تو انہوں نے ایک بڑا بیڈ روم کھول دیا جس میں حجلہ عروسی بنا ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک رات پہلے یہاں بارات ٹھہری تھی کمرہ یہ ہی ہے جس میں کشور اور منو بھائی کو اکٹھے رات گزارنی ہے۔ اس پر منو بھائی نے بے ساختہ کہا' لو جی اک واری فیر شرمندہ ہونا پے گا۔ ضیا کے زمانے میں 1983ء میں سبط حسن نے کراچی میں ترقی پسند کانفرنس کی' پورے پاکستان سے ادیب وہاں پہنچے یہاں سے ہم نے ایک بوگی بک کرائی اور دعوت عام دیدی۔ ہم جو سرکاری ملازم تھے بغیر کسی خوف کے شامل ہوئے اس میں کشور اور میرے علاوہ نسرین انجم بھٹی' شائستہ حبیب اور عبدالستار سید خاص طور پر شامل تھے۔ کشور نے پولیس میں اپنے دو دوستوں کی ذمہ داری لگائی کہ راستے میں رات کا کھانا اور صبح کا ناشتہ وہ سب کے لئے تیار کریں۔ بہاولپور سٹیشن پر سب نے کھانا کھایا جب واپس آکر بیٹھے تو فخر زمان نے ظہیر کاشمیری سے کہا کہ کشور نے ہمیں اسٹیبلشمنٹ کا کھانا کھلوایا ہے۔ ظہیر کاشمیری نے غم وغصہ کا اظہار کرنے کے لئے تقریر کی۔ انہوں نے دھوتی باندھ رکھی تھی اوپر سرخ قمیص اور پیلی ٹائی لگا رکھی تھی ہوا میں وہ دھوتی بار بار ادھر ادھر ہوجاتی مگر وہ مست تقریر کرتے رہے۔ رات گزر گئی صبح رحیم یار خان پر پھر پولیس کے ایک افسر کی طرف سے ناشتہ آیا جو میں نے وصول کیا۔ میں نے سب کو باری باری ناشتہ دیا فخر زمان اور حبیب جالب نے ناشتہ لے لیا ظہیر کاشمیری منہ بسورے ایک طرف بیٹھے رہے کشور نے مجھے اشارہ کیا کہ اس کا ناشتہ سنبھال کے رکھ لو اس نے کھانا ہی کھانا ہے۔ آدھ پونے گھنٹے بعد ظہیر کاشمیری نے مجھے اشارے سے بلایا اور پوچھا ناشتے میں کچھ بچا ہوا پڑا ہے۔ میں نے کہا آپ کا حصہ میں نے سنبھال لیا تھا۔ کہنے لگے لے آؤ.....

ان گھر کی دعوتوں کے علاوہ روزانہ چار پانچ لوگوں کا کھانا وہ دفتر بنا کر لے جاتی تھی۔ جہاں پہلے نیشنل سنٹر اور پھر ماہ نو کے دفتر میں ہر دوپہر دسترخوان لگتا تھا۔ پانچ چار ادیب کھانے پر پہنچ ہی جاتے تھے ان دونوں اداروں کو جو عروج کشور کے زمانے میں ملا پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ ماہ نو میں کشور نے تراجم

اور تصاویر کا حصہ اتنا مقبول کرایا کہ باقی کے ادبی پرچے اس تک نہ پہنچ سکے وہ سب کو کام پر لگا دیتی تھی میں نے بہت تراجم اور شاعری اس زمانے میں کی۔ ماہ نو کا دفتر ادیبوں کی بیٹھک بن گیا تھا۔ اس سے پہلے نیشنل سنٹر کراچی سے پشاور تک سے آنے والوں سے ملاقات کا مرکز بنا ہوا تھا ہر شام کوئی نہ کوئی تقریب ہو رہی ہوتی تھی۔ کشور سے بہتر ادبی پرچے کے ایڈیٹر اور بھی رہے ہوں گے مگر کشور کا طریقہ سب سے مختلف تھا وہ اپنے پرچے کو خیالی طور پر ترتیب دیتی تھی اس میں خود سے طے کرتی تھی کہ افسانے میں انتظار حسین' خالدہ حسین اور اسد محمد خان ضروری ہیں تو انہیں حکم لگاتی تھی کہ تازہ افسانہ بھیجو ایسے ہی باقی شاعروں اور لکھنے والوں کا فیصلہ خود لے کر ان کو حکم دے دیتی نتیجہ یہ کہ ہر لکھنے والا کشور پر اعتبار کرتے ہوئے تازہ تحریر پر توجہ دیتا تھا۔ گویا کشور نے ادب تخلیق کرنے کی ترغیب و تحریص کی تھی۔ میں ان میں شامل تھا۔ میں نے پابلو نرودا' ناظم حکمت' محمود درویش' ہرمن ہیس اور ہیمنگوے کے تراجم کشور کے کہنے پر کئے اس کے علاوہ کورین ایمبیسیڈر کی شاعری کے ترجمہ کرنے والے دو تین شاعروں میں' میں بھی شامل تھا۔

ماہ نو کا انتخاب کئی جلدوں میں نادر تصاویر اور پینٹنگز کے ساتھ شائع کرنا ایک ایسا پروجیکٹ تھا۔ جس سے سرکار سے فنڈز نکلوانا صرف کشور سے ممکن ہو سکتا تھا۔ ادب لطیف جو تقریباً اپنی طبعی موت مر چکا تھا کشور نے اسے دوبارہ جاری کیا۔ دو ہی شماروں نے عالمی ادب اور اردو ادب کے عاشقوں کو ایک نئی امید دلا دی۔ ادب لطیف کے تاجر مالکوں کو کسی نے بہکا دیا کہ کشور کو آپ نے ایک سیڑھی فراہم کر دی ہے وہ تو اس کا بہت فائدہ اٹھائے گی۔ جب کسی کی مت ماری جاتی ہے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔ مالکہ نے خود ایڈیٹر ہونے کا فیصلہ کر لیا وہ یہ نہیں جانتی تھی رسالے کا نام نہیں ایڈیٹر کا نام ہوتا ہے بس پھر ادب لطیف اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں ہو یا پی این سی اے جو سرکاری افسروں کا قبرستان بن چکا تھا' کشور کے آنے سے بہت سے بند دریچے کھل گئے۔ سب سے اہم شاکر علی میوزیم فعال ہو گیا وہ میوزیم سے فورم بن گیا کشور پر اداروں کا اعتبار قائم ہو گیا مجھے اور سلمان شاہد کو برٹش کونسل نے لندن بھیجا جہاں میں نے وہاں کی ڈرامہ رائٹر ROXANNE کے ساتھ سکرپٹ پر کام کیا وہ اتنی خوبصورت تھی کہ میں نے اسے کہا' میں تمہیں صرف دیکھوں گا تم لکھتی رہنا۔ وہ ظالم اس پر بھی مسکراتی رہی۔ وہیں میں نے سلمان شاہد کی اس کے والد سلیم شاہد سے آخری ملاقات کرائی۔ سلمان باپ سے ناراض تھا ملنا نہیں چاہتا تھا اس کے والد نے مجھے کہا کہ کسی طرح اسے فلاں سٹیشن پر لے آؤ۔ سلمان نے کہا' اگر میں ساتھ جاؤں اور ملاقات میں بیٹھوں تو وہ جائے گا۔ ایسا ہی ہوا باپ بیٹے کی ایسی ملاقات ایک ڈرامہ لکھنے والے کے سامنے ہو تو پیسہ وصول۔ اس کے بعد کشور نے عورتوں اور اقلیتوں کے حقوق کے لئے جو عملی کام کیا اور جو اب تک جاری ہے اس کا ACCOUNT تو آپ سب کے پاس ہے۔ اپنی شاعری کو عورتوں اور انسانی حقوق کے لئے وقف کر دیا ہے کشور کی شاعری دھیمی آنچ پر کچی مٹی کی ہانڈی

میں پکی ہوئی ہے بعد میں رفتہ رفتہ اس کے مزاج کی گرمی اور لطیعت کی بے تابی نے شاعری کو تیز آنچ پر پکانے کی جلدی کی۔ میری ماں جب تندور میں لکڑیاں جلاتی تو کہتی تھیں آگ انگاروں میں تبدیل ہوجائے تو کم سے کم پندرہ منٹ بعد تندور میں پانی بھیگا کپڑا پھیرو اور پھر روٹی لگاؤ۔ میں روٹی لگانا تو سیکھ گیا نظم اس طریقے سے لکھنا نہیں سیکھ سکا۔ نظم لکھنا بھی تندوری روٹی اپنی مرضی سے نکالنے کا آرٹ ہے۔ یوں تو وہ کشور ہے جو ہم ادیبوں، شاعروں اور دوستوں کے لئے تھی وہ کشور جو بیٹوں کے لئے تھی اور یوسف کے لئے تھی وہ کہاں ہے کیا کشور اس کشور کو لکھ پائے گی ہمیں اس کشور سے بھی ملنا ہے۔ میری ماں نے میرے والد کی محبوبہ سے کہا تھا تم نے میرا حق تو مار لیا میرے بچوں کا حق نہ مارنا۔ کیا یوسف نے بھی کوئی پیغام کشور کو دیا تھا یا جوانی دھوپ میں گزارنے کا مشورہ دے کر چلا گیا۔

اگر آج کے لڑکے لڑکیاں اس رومانس میں مبتلا ہیں کہ وہ کشور کی طرح خاندان سے بھاگ کر شادی کریں تو انہیں یہ سوچ لینا چاہئے کہ ان کے بہن اور بھائی کا کشور کے بہن اور بھائی جیسے شعور اور فراخدلی کا حامل ہونا ضروری ہے۔ نہیں تو یہ رسک نہ لو اس لئے کہ پچھلے چالیس سالوں سے میں نے کشور کی ڈاکٹر بہن اور ڈاکٹر بھائی کو اس پر جان چھڑکتے دیکھا ہے اور افتار زیدی جو ہم سب کے بھائی جان ہیں کشور کے ایک اشارے پر سو دو سو ادیبوں کے کھانے کیلئے لاہور کی فوڈ سٹریٹ پیدا کر دیتے ہیں جن کے گھر میں ملکہ ترنم نور جہاں سے فیض صاحب تک کو آتے دیکھا ہے نہ ایسی بہن دیکھی نہ ایسا بھائی دیکھا افتخار زیدی کے پاس الہ دین کا چراغ ہے جس نے اس کی کوٹھی کو محل میں بدل دیا ہے۔

میرے اشفاق صاحب

اگر میں اپنے حوالے سے اشفاق صاحب کو دریافت کروں تو بات بہت دور تک جائے گی۔ کہ ایک دن ان کا ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ میں نے اپنے سانده روڈ والے گھر میں اس کارڈ کو وصول کیا جہاں میری بیوی فرزانہ کے انتقال پر اشفاق صاحب اور بانو آپا گلیاں پھلانگتے تشریف لائے تھے۔ اس کارڈ میں لکھا تھا، اصغر! رات تمہاری آپا خواب دیکھ کر جاگ گئیں اور مجھے بھی اٹھا دیا۔ خواب میں دیکھتی ہیں کہ فرزانہ اور تم ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہو، کوئی ایسا لمحہ ہے کہ جو سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ خواب دیکھ کر تمہاری آپا دیر تک جاگتی رہی ہیں اللہ تم دونوں کو سلامت رکھے۔ یہ پوسٹ کارڈ میں نے اور فرزانہ نے پڑھا ہمت نہ ہوئی کہ اشفاق صاحب کو فون پر اس پوسٹ کارڈ کے ملنے کی گواہی دیں لیکن یہ بات دل میں رہی اور جب میں جرمنی میں تھا اور میں نے بالکل یہی خواب فرینکفرٹ کے نواح میں ایک گھر میں دیکھا تو مجھے اس خواب نے چونکا دیا لیکن میں نے اللہ کی قدرت کا بھروسہ کیا اور سو گیا لیکن چند دنوں بعد جب فرزانہ مجھ سے جدا ہوگئی تو مجھے اشفاق احمد اور بانو آپا کا وہ خواب اور وہ پوسٹ کارڈ بہت یاد آیا۔ انسان اور اس کا شعور اور تحت الشعور اس کے سب سے بڑے مخبر ہوتے ہیں مگر وہ انسان کو کچھ دے نہیں سکتے صرف اسے اطلاع دے سکتے ہیں۔ ایسے ہی کئی خواب میں نے دیکھے جن میں خان

صاحب میرے آس پاس ہیں ان کی زیارت ہو رہی ہے وہ کچھ فرما رہے ہیں اور پھر جو خواب کا مقدر ہوتا ہے کہ خواب کسی اور خواب میں گم ہو جاتا ہے ایسے ہی ہوا کہ خاں صاحب مجھے اپنے دیدار سے خوابوں میں مستفید کرتے رہے لیکن حقیقت میں بھی وہ مجھے طریقے طریقے سے رجھاتے رہے۔ اپنی شفقت اور اپنے سائے میں بٹھاتے رہے اور میں بیٹھا رہا۔ مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ اشفاق صاحب اور بانو آپا مجھ سے کیوں پیار کرتے تھے یہ معمہ ہے جو شاید میں اب کبھی بھی سمجھ نہیں پاؤں گا۔ تو اگر اس راستے سے اشفاق صاحب کو سمجھنا چاہوں تو اور بھی مشکل ہے کہ میرے جیسے بے شمار انکی محبت میں دبے ہوئے ہوں گے۔ ایک دنیا ہوگی کہ جن کو انہوں نے اپنے ہاتھ کی گرمی میں لپیٹ کے رکھا ہوگا۔ حیرت کی بات ہے کہ میں دنیا دار ہوتے ہوئے ہر ادیب یا اپنے ہر دوست کے متعلق یہ ضرور سوچتا ہوں کہ اس کی گزر اوقات کیسے ہوتی ہوگی۔ لیکن کبھی خاں صاحب کے متعلق دھیان ہی نہیں گیا کہ ان کے اتنے ڈھیر سارے خرچے کیسے پورے ہوتے ہوں گے۔ ملازمت یا ٹی وی کے چیک سے ہونے والی آمدنی تو مجھے معلوم ہی ہے ان کا رکھ رکھاؤ اور گھر داری اس آمدن سے ممکن نہیں تھی لیکن کبھی اس طرف سوچا ہی نہیں تھا۔ بس یوں لگتا تھا کہ ایک دربار ہے جہاں لنگر چلتا ہے یا ایک مہاتما ہے جو بیٹھا ہے اور سارا نظام ہستی بس خود بخود چل رہا ہے۔ پاکستان میں ادیبوں کے مالی حالات کبھی اچھے نہیں رہے لیکن گزشتہ بیس پچیس سالوں میں کچھ تبدیلی ضرور آئی ہے کہ کراچی' لاہور اور اسلام آباد کے ادیبوں کو اپنی محنت سے مالی حالات بہتر بنانے کے مواقع ضرور ملے جن ادیبوں اور شاعروں کو اللہ نے صلاحیت دی انہوں نے محنت کر کے اور ان مواقع کا فائدہ اُٹھا کر پاکستانی ادیب کا امیج بہتر بنایا۔ یہاں تک کہ بھارت کے ادیب ہمارے بیشتر خوشحال ادیبوں کو رشک سے دیکھتے پائے گئے۔ ان ادیبوں میں اللہ کے فضل سے اشفاق احمد اور بانو آپا نے نہ صرف پاکستانی ادیبوں کے وقار میں اضافہ کیا بلکہ دوسرے شعبوں کے مقابلے میں ادیب کو ایک رول ماڈل کی حیثیت دیدی لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کے لئے دونوں کو کتنی قربانیاں دینی پڑیں کتنی محنت کرنی پڑی اشفاق احمد چاہتے تو صرف تلقین شاہ کے زور پر ساری زندگی حکومت کرتے رہتے یا چاہتے تو سرکاری افسر کے طور پر ساری زندگی جوڑ توڑ میں لگ کر آسودہ زندگی گزار جاتے یا چاہتے تو ایک کمرشل ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ہر ایرے غیرے کو سیریل لکھ کر نوٹ چھاپ سکتے تھے یا چاہتے تو ہر مہینے ایک کتاب لکھ کر پبلشر سے ہر ماہ لگا بندھا پیسہ وصول کر سکتے تھے انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ محنت سے' جستجو سے' کاوش سے' جدوجہد سے زندگی کا نئے سے نیا روپ دریافت کرنے کے کشٹ میں لگے رہے۔ اشفاق صاحب کو میں نے زندگی میں ایک ہی دفعہ صاحب فراش دیکھا اور وہ ان کے آخری وقت میں جب انہی خود بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اللہ اپنی رحمت کی چادر میں انہیں لپیٹ کے لے جانا چاہتا ہے میں نے دو ایک دفعہ حاضری دی اپنے لائبریری والے کمرے میں بیٹھے ہوتے تھے۔ نیم دراز' سوچوں میں گم' خاموش' ایسی ہی خاموشی کو توڑتے ہوئے میں نے

لائبریری کی کتابوں کو دیکھا' سب پر خاکی کاغذ چڑھا ہوا تھا اور کانے کی قلم سے خوشخطی میں کتاب کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا' خاں صاحب آپ نے اچھا کیا جوان کتابوں پر خاکی کاغذ چڑھوالیا اس طرح کتابیں محفوظ ہوگئی ہیں اشفاق صاحب نے میری طرف نیم ناراضگی سے دیکھا اور کہا چڑھوائے نہیں چڑھائے ہیں۔ تب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اشفاق صاحب تو ان بزرگوں میں سے ہیں جو مکتب مدرسے کو بہت مقام دیتے ہیں اور اس طرح کے کام تو وہ ہاتھ سے کیا کرتے تھے بلکہ گھر میں بھی ہر کام خود کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ کچھ لوگوں کے کام ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی شخصیت عام دنیاوی سطح سے ماورا دکھائی دیتی ہے اس لئے کبھی محسوس ہوا نہ سوچا کہ اشفاق صاحب کو بھی کوئی بیماری لگ سکتی ہے یا وہ ہم میں نہیں رہیں گے بس لگتا تھا ناک پر ہاتھ مارتے رہیں گے اور داستان گو کی طرح باتیں کرتے رہیں گے' باتیں کرتے وقت چہرے پر کئی دفعہ بہانے بہانے سے ہاتھ پھیرتے تھے یہ ان کی خاص ادا تھی اور جس سے مخاطب ہوتے تھے ایک خاص قسم کی لنک بات میں پیدا کرتے تھے تاکہ جس سے بات کررہے ہیں اس سے دلی اور جذباتی رابطہ پہلے قائم ہوجائے اور پھر وہ ان سے بات کریں۔ مثلاً اس طرح بات شروع کرتے تھے اے توں گل سن' ذرا میرے کول آ' اس الف ب کے بعد وہ جو بھی بات کرنی ہوتی تھی کرتے تھے کسی کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ محض رواداری اور میکانکی قسم کے رشتے سے بات کررہے ہیں مجھے حیرت ہوتی تھی کہ خاں صاحب اپنی مروت کی وجہ سے کتنے دکھ اٹھاتے ہیں سارا شہر ان کا دیوانہ تھا ہر محفل' ہر انجمن ہر ادارہ ان سے وقت مانگتا تھا اور وہ پہنچ جاتے تھے اتنے لحاظ خورے کے چھ چھ گھنٹے فضول اور بور قسم کی گفتگوئیں برداشت کرتے رہتے تھے' کہتے تھے بیبا۔ میرے توں ناں نئیں ہوندی۔ میں اپنی زندگی دیکھتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرے پاس نہ تو کسی تقریب کے لئے وقت ہے نہ کسی یونیورسٹی یا کالج کے لئے وقت ہے نہ کسی کھانے اور ضیافت کے لئے وقت ہے اشفاق صاحب اور میرا کیا مقابلہ وہ تو بڑے بڑے کام کررہے تھے پھر بھی وہ لوگوں کے لئے وقت نکال لیتے تھے آخری دو تین سالوں میں اشفاق صاحب نے مجھے اپنا سسٹنٹ بنالیا تھا مجھے کہا' میں کتابوں کے فلیپ اور تقریبات کے لئے اب تمہارا نام آگے کردیا کروں گا تم میری جگہ ڈیوٹی دے آیا کرنا میں نے خوشدلی سے ان کی جگہ ڈیوٹی دینے کی حامی بھر لی۔ کئی لوگ مسودے لے کر آئے کہ خاں صاحب نے آپ کی طرف بھیجا ہے میں ان کے فلیپ لکھتا رہا۔ کئی لوگ آئے کہ خاں صاحب نے آپ کا نام دیا ہے کہ ان کو بلالیں وہ میری جگہ آجائیں گے میرے لئے یہ بے حد سعادت کی بات تھی لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ لحاظ خوری میں انکار نہیں کرسکتے تھے اور ان لوگوں کو کوئی نہ کوئی نام خانہ پری کے لئے دے دیتے تھے۔ میں خاں صاحب کی پراکسی پر ہوتا تھا پراکسی سے یاد آیا کہ میرا ڈرامہ نگار بن جانا بھی اشفاق صاحب ہی کا مرہون منت ہے۔ یہ واقعہ کسی کو معلوم نہیں ہے میں ان کی پراکسی ڈرامہ نگار بنا ہوں اور ایسی برکت انکے نام کی وجہ سے پڑی کہ اللہ نے اس میں بہت عزت بخشی ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ ضیاء الحق کا شدید ترین خوف کا دور تھا سارا نزلہ پی ٹی وی پر گرتا تھا اس لئے اس وقت کا پی ٹی وی بے حد سہما ڈرا ہوا تھا۔ ہر پروڈیوسر اندر سے خوفزدہ تھا ایسے میں ضیاء الحق نے قوم کی توجہ حقائق سے ہٹانے کے لئے 14 اگست کو سرکاری سطح پر بہت اہتمام سے منانے کا منصوبہ دیا اور سارے محکمے اس پر لگ گئے پی ٹی وی پر 14 اگست کو خصوصی کھیل آٹھ بجے ٹیلی کاسٹ ہونا تھا ظاہر ہے ہیڈ کوارٹر نے بے حد سوچ بچار کے بعد خاں صاحب کا نام منظور کیا شاید وہ سمجھتے تھے کہ خاں صاحب اسلامی تعلیمات کو ادب میں پیش کرتے رہتے ہیں اس لئے ان سے بہتر کون ہوسکتا تھا اور پھر ڈرامے کا سب سے بڑا نام بھی تھا تو حکومت کو خوش کرنے کا اس سے بہتر نام ہو ہی نہیں سکتا تھا وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ خاں صاحب کے اندر ایک صوفی درویش بھی رہتا ہے جو اکثر اپنی گدڑی میں سے نکل آتا ہے یہی ہوا کہ خاں صاحب کا لکھا ڈرامہ جب لاہور ٹیلی ویژن کے لوگوں نے پڑھا تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ اس میں تو کچھ ایسے پہلو نکلتے ہیں جس سے شاہ وقت کے ماتھے پر شکن آسکتی ہے اور جو بادشاہ کو ننگا کہنے والا معصوم بچہ (خاں صاحب) کے اندر تھا وہ شاید باہر آ گیا تھا چنانچہ ٹی وی والوں کو وقت پڑ گیا ادھر وقت کم سے کم ہوتا گیا ایسے میں اس وقت کے جنرل منیجر کنور آفتاب احمد کو یہ بات سوجھی کہ اگر اشفاق احمد کی جگہ کسی ایسے ڈرامہ نگار سے لکھوایا جائے جو دوسری' تیسری صف میں آتا ہے تو بات نہیں بنے گی البتہ بالکل نئے رائٹر سے لکھوائیں گے تو شاید کوئی نئی بات مل جائے چنانچہ مجھے ایسے ہی راہ چلتے پکڑ لیا گیا۔ یہ پراکسی میں نے بولی اور اللہ نے اشفاق احمد کی برکت سے مجھے کامیاب کر دیا۔ جب میں اس شعبے کی طرف آیا تو مجھے ڈرامہ لکھنے میں بہت مشکل پیش آئی کیونکہ یہ بے حد مشکل فن تھا جو اشفاق احمد کے لئے اتنا آسان تھا جیسے وہ باتیں کر رہے ہوں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ اتنی آسانی سے بات کیسے ڈرامے میں کہہ جاتے ہیں پھر ان کے سکرپٹ پڑھتا رہا میرے کچھ پلے نہ پڑا خیر الٹا سیدھا جیسا سیکھا وہ تو سب کو معلوم ہے البتہ اس عمل میں مجھے ایک حیرت یہ ہوئی کہ اشفاق احمد جب چاہیں ایک کامیاب اور کمرشلی ہٹ سیریل دے سکتے ہیں تو پھر وہ ایسا کیوں نہیں کرتے ہر بار مشکل سے مشکل انداز کیوں اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً: ''اچے برج لہور دے'' جس نے بھی دیکھا ہے وہ میری بات کی تصدیق کرے گا کہ وہ اسی انداز کو جب چاہیں استعمال کر کے ایک کامیاب سیریل نکال سکتے تھے لیکن انہوں نے دوبارہ اس انداز کو اختیار ہی نہیں کیا پھر جب انہوں نے ایک محبت سو افسانے لکھا تو میرا خیال تھا وہ دوبارہ اسی فارمیٹ کو استعمال کر کے اپنی مقبولیت میں اضافہ کریں گے لیکن انہوں نے یہ انداز ایک طرف رکھ دیا اور ڈرامے لے کر آ گئے۔ اس میں نئی سے نئی جہت پیدا کی اور پھر کسی اور طرف نکل گئے۔ وہ مقبولیت کے عام معیار کو پسند ہی نہیں کرتے تھے اس لئے وہ ٹیلی ویژن کو لیبارٹری سمجھتے تھے۔ جس میں وہ کہانی پر تجربے کرتے رہتے تھے ان کی پہلی محبت داستان سے تھی داستان اور کتھا کی گود میں ان کی پرورش ہوئی تھی اتفاق سے انتظار حسین کی پرورش بھی داستان نے کی لیکن دونوں کے راستے الگ الگ

تھے۔ اشفاق احمد نے اس لئے گھر کا نام داستان سرائے رکھا اور جو پرچہ نکالا اس کا نام بھی داستان گو رکھا وہ خود کو ایک قصہ گو سمجھتے تھے جو زبانی قصہ سناتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کی تمام تر گفتگو اور تمام تر تحریریں ایک قصہ ہیں ایک کہانی ہیں' ایک داستان ہیں میں یہ بات بے حد دعوے سے کہہ رہا ہوں کہ اشفاق احمد کا ہر بولا ہوا لفظ داستان کا لفظ ہے اور ان کا ہر لکھا ہوا لفظ قصے کا لفظ ہے۔ ضیاء الحق کا زمانہ اشفاق احمد کے لئے بے حد مشکل زمانہ تھا کہ ان کی باتیں اوپر کی سطح پر فوراً ضیاء الحق کے خیالات کی ترجمانی محسوس ہونے لگتی تھیں جبکہ بات ایسی نہیں تھی ایسے میں ہماری شوخ قسم کے ترقی پسندوں نے جو خود بھی ترقی پسندی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے اشفاق صاحب پر رجعت پسندی اور آمریت کی حمایت کرنے کے الزامات لگا دیئے۔ اشفاق صاحب مسکراتے رہے فیض احمد فیض کی طرح کسی کو جواب نہیں دیا فیض صاحب اور اشفاق صاحب میں یہ مشترک صفت تھی دونوں نے اپنے اپنے خیالات کو یقین میں ڈھالا ہوا تھا اس لئے دونوں زندگی کو اپنی اپنی نظر سے دیکھتے رہے دونوں ہی بڑے مہاتما تھے دونوں سے عقیدت محض لفظی یا اوپر اوپر کی نہیں ہے میں نے دونوں کو اندر سے صوفی پایا ہے صوفی باعمل اگرچہ ایک اور ملامتی صوفی ممتاز مفتی نے مجھے بہت سر چڑھایا بہت پیار دیا شاید وہ اور لوگوں سے بھی ایسا انداز رکھتے ہوں مجھے معلوم نہیں لیکن میرے ساتھ تو وہ لہلوٹ والی شفقت کرتے تھے اگرچہ میں نے کبھی اس کی نمائش نہیں کی ان کے خطوط میرے پاس ہیں جنہیں میں شائع کرا کے اپنے لئے بڑائی کا موقع پیدا کر سکتا ہوں لیکن یہ میرے اور مفتی جی کی آپس کی بات ہے تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مفتی جی اور طرح کے صوفی تھے تھوڑے سے تاڑ باز تھوڑے سے اللہ لوک' تھوڑے سے یملے' تھوڑے سے شرارتی' تھوڑے سے دنیا باز (دنیادار وہ نہیں تھے) تھوڑے سے من چلے' تھوڑے سے لاڈلے' تھوڑے سے کج ادا' تھوڑے سے تھڑے باز' تھوڑے سے عشق باز' وہ شاید سب کچھ تھے لیکن اشفاق صاحب سب کچھ نہیں تھے بس یہی بات انہیں سب سے الگ کر لیتی ہے۔ یوں کہنے کو تو اشفاق صاحب کو لوگوں نے مجمع باز کہا' دنیا دار کہا' زمانہ ساز کہا لیکن وقت نے یہ ثابت کیا کہ وہ یہ سب کچھ نہیں تھے۔ ڈگڈگی ان کے پاس بھی تھی لیکن وہ مجمع لگانے کے لئے نہیں تھی دنیا کو جگانے کے لئے تھی وہ ڈگڈگی بجاتے رہے کبھی زاویہ پروگرام میں' کبھی اپنے ڈراموں میں' کبھی اپنے افسانوں میں' کبھی اپنی گفتگوؤں میں لیکن لوگوں کو اب اس ڈگڈگی میں مزہ آنے لگا تھا۔ وہ اس کا نشہ لینے لگ گئے تھے اور اس نشے کے عادی ہو رہے تھے ان کی باتوں پر غور کرنے کے بجائے اس سے لطف اٹھانے لگے تھے ان کے اندر کا تلقین شاہ آخری وقت تک ان کے اندر جیتا جاگتا تھا البتہ یہ تلقین شاہ تھوڑا سنجیدہ ہو گیا تھا اس میں عام آدمی کے لئے درد اور تشویش زیادہ تھی۔ عام آدمی سے یاد آیا کہ اشفاق صاحب نے عام آدمی سے دانش لے کر اسے کئی گنا زیادہ بڑھا کر واپس وہی دانش اس عام آدمی تک پہنچا دی۔ لوہار' موچی' نائی' چپڑاسی' کسان' مزدور' پنکچر لگانے والا' منجن بیچنے والے' فٹ پاتھیے' سڑک چھاپ نجومی' بساطی کنجڑے' بزاز' یہ سب معزز پیشے اشفاق

احمد کو پسند تھے وہ بچپن کی یادوں میں ان پیشوں سے وابستہ لوگوں کو اپنی گٹھڑ میں لئے لئے پھرتے رہے وہ ان پیشوں کی عزت نفس کے لئے بولتے رہے وہ ان لوگوں کو اپنی یادوں کی گٹھڑی سے اکثر نکال لیتے تھے اور ان سے باتیں کرتے تھے وہ شاہ حسین کو خراج پیش کررہے تھے جس نے کہا میں نمانڑاں میں جولاہا میں فقیر ان کی باتیں جب وہ لوگوں کو سناتے تھے تو دراصل وہ ان سے بہانے بہانے سے بات کررہے ہوتے تھے یہ سب جیتے جاگتے کردار ان کی باتوں میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ اب لگتا ہے اشفاق کے بعد یہ پیشے یتیم ہوگئے ہیں بے آبرو ہوگئے ہیں بے عزت ہوگئے ہیں۔ ان کی عزت نفس کی حفاظت کرنے والا نہیں رہا مجھے اب کوئی آ کر یہ نہیں کہتا کہ فلاں تقریب کے لئے اشفاق صاحب نے آپ کا نام دیا ہے یا کوئی ادیب نہیں آتا جو کہے اشفاق صاحب نے بھیجا ہے فلیپ لکھ کردیں۔ میں ان کی پراکسی بولنے کا عادی ہوگیا تھا۔ اب بھی مجھے لگتا ہے کہ میں زندگی کی کلاس کے باہر کھڑا ہوں اشفاق صاحب نہیں ہیں ان کی پراکسی بولنے کا انتظار کررہا ہوں۔

حمید اختر
خود یاد بن گیا

حمید اختر ترقی پسند تحریک کے آخری سپاہی اور کارکن تھے۔ ان معنوں میں تحریک کے تمام رہنما ان سے پہلے ایک ایک کرکے چلے گئے اور حمید اختر کو یادیں رکھنے کا فریضہ سونپ گئے جو وہ آخری سانس تک نبھاتے رہے۔ آخر آخر میں تو اپنے کالم کو یادوں کی پٹاری بنالیا تھا اور اسے لبالب بھرنے کے چکر میں بہت کچھ دہرانے لگے تھے شاید وہ اس عجلت میں تھے کہ کوئی راز سینے میں رہ نہ جائے اگرچہ سینہ تو وہ کب کا کھول چکے تھے اور بیماری کو دعوت مبارزت دے چکے تھے مگر بیماری نے دل پروار کرنے کے بجائے سیدھا آن کے گلا ہی پکڑ لیا یہ بیماری ایسے گلے پڑی کہ حمید اختر نے جھٹکنے کے بڑے جتن کئے اور جس بہادری سے وہ اپنی بیماری سے لڑے ایسے میں نے کسی ادیب اور شاعر کو لڑتے نہیں دیکھا شاعر غریب کی تو اوقات ہی کیا ہے۔ شاعر تو بیماری کے سامنے گویا ریت کی دیوار کھڑی کرنے سے زیادہ کی سکت ہی نہیں رکھتا۔ حمید اختر شاعر نہیں تھے سو بیماری سے نباہ کرنے میں ثابت قدم رہے یادیں ان کے اندر بہت غل مچاتی تھیں یہی وجہ ہے کہ عام سی سیدھی بات کرتے ہوئے بھی نئی یادیں اپنا راستہ بنالیتی تھیں۔

وفات سے چند دن پہلے میں نے اپنی یونیورسٹی میں فیض صاحب کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں ایک تقریب رکھی شمیم حنفی صاحب بھی اس میں مدعو تھے۔ صدارت کے لئے میں نے فون کیا فون خلاف معمول ان کی بیٹی صبا حمید نے اٹھایا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ حمید اختر کی طبیعت کہیں زیادہ خراب تو نہیں ہوگئی کہ کراچی سے بہت سے سیریل چھوڑ کر ان کی بیٹی لاہور آگئی ہیں اس لئے کہ چند دن پہلے حمید اختر نے ''ایکسپریس'' میں ایک بے حد جذباتی کالم لکھا تھا جس کی مخاطب ان کی اولاد تھی جس نے انہیں تنہا

چھوڑ دیا ہے۔ میرا وسوسہ اسی بنیاد پر تھا حمید اختر کا بیٹا گورنمنٹ کالج میں میرا شاگرد تھا اور اسے پتہ تھا میرا حمید اختر سے کیا رشتہ ہے اس لئے وہ کبھی کلاس سے غیر حاضر نہیں ہوا تھا۔ وہ امریکہ میں آباد ہوگیا تھا۔ صبا حمید نے میرا نام سنا تو حمید اختر کو فون پر لے آئیں حمید صاحب نے میری دعوت پر کہ آج ہی میرے گلے کی تھیراپی مکمل ہوئی ہے میرا علاج ہوتا ہے تو میں کئی دن بولنے سے محروم رہتا ہوں آج مجھے آواز ملی ہے میں کل آجاؤں گا اور پھر وہ آئے صدارت کا خطبہ دیا اور ایسے واقعات سنائے کہ سب کے کانوں کی لویں سرخ ہوگئیں صرف ایک واقعہ جو انہوں نے سنایا ایک ایسی محفل تھی جس میں ملکہ ترنم نور جہاں، فیض احمد فیض، حمید اختر اور موسیقار خورشید انور ایک ساتھ تھے محفل کے بعد میڈم نور جہاں نے سب کو گھروں میں DESPATCH کرنے کی ذمہ داری لی اور جب گاڑی ریگل کے آس پاس کہیں پہنچی تو حمید اختر اور خورشید انور نے کہا ہمیں یہاں ہی اُترنا ہے۔ گاڑی رُک گئی وہ دونوں اُترے ساتھ ہی فیض صاحب بھی اُتر گئے اور دونوں سے کہا' گاڑی میں بیٹھو کیا تم مجھے میڈم نور جہاں کے حوالے کرنا چاہتے ہو' فوراً اندر بیٹھو۔ بقول حمید اختر انہیں فیض صاحب کی حفاظت کے لئے بیٹھنا پڑا۔ اس گفتگو میں حمید اختر نے کھل کر ایسے واقعات سنائے جیسے پھر نہ سنا سکیں گے اور ایسا ہی ہوا تقریب کے بعد میں نے حمید اختر سے کہا کھانا کھا کر جائیں وہ نہیں رُکے اور چلے گئے اور ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔

یہ تو مجھے آخر میں کہنا چاہئے تھا لیکن آج کل فلم کی تکنیک ہی کچھ ایسی ہے کہ کسی بھی کہانی کو کہیں سے بھی شروع کردو شروع ہوجاتی ہے تو میں حمید اختر کی بات یہاں سے شروع کرتا ہوں۔

یہ بات ہے 1977ء کی جب ضیاء الحق نے پاکستان کے مستقبل کو ہمیشہ کے لئے اندھیروں میں ڈالنے کی بنیاد رکھ دی۔ جب وہ ملتان میں جی او سی تھے تو شام کو ٹہلتے ہوئے امروز کے آفس میں مسعود اشعر کے پاس آجاتے تھے مارشل لاء لگ چکا تھا کالونی ملز میں مزدوروں کی ہڑتال ہوئی اور ان پر سامنے سے گولیاں برسائی گئیں۔ ایک جلیانوالہ باغ ہو چکا تھا ایک مزدور نے اپنے خون سے دیوار پر مارشل لاء مردہ باد لکھتے ہوئے دم توڑا تو امروز کے فوٹوگرافر نے وہ تصویر لے لی اور مسعود اشعر نے صفحہ اول پر وہ چھاپ دی میں اس وقت امروز میں کالم نگار تھا اگلے دن امروز ملتان سے مسعود اشعر اور ترقی پسند صحافیوں کو اخبار سے نکال دیا گیا۔ وہ جو مسعود اشعر کی ناک کے بال تھے اور میرے ساتھ بے حد دلی شفقت سے پیش آتے تھے انہوں نے امروز پر قبضہ کرلیا میری مراد اقبال ساغر صدیقی سے ہے مسعود اشعر اور ان کے ساتھیوں نے ہڑتالی کیمپ ڈال دیا میں اس وقت پنجاب لیکچرر ایسوسی ایشن کا جائنٹ سیکرٹری تھا میں نے ایک ٹیلی گرام ضیاء الحق کے نام اپنے نام اور عہدے کے ساتھ دیدیا۔ میری انگریزی آج بھی مشکوک ہے انوار احمد نے میرے خاکے میں لکھا ہے کہ میں نے بی اے دو دفعہ کیا ہے لیکن مجھے یاد ہے ٹیلی گرامی میں نے لکھا RESTORE THE HONOUR OF MASSOD ASHAR

اس سے اگلے دن میں نے بھوک ہڑتالی صحافیوں کو اردو اکادمی کے سیکرٹری کی حیثیت سے لنچ دیا آج بھی یاد ہے دیگیں کھلیں اور سڑک پر صحافیوں اور اخبار کے کارکنوں نے کھانا تو کھایا لیکن یہ علامتی RESTORE ضیاء الحق کے ایوان میں گونج گیا نتیجہ یہ کہ مجھے شکر گڑھ ٹرانسفر کر دیا گیا میں وہاں گیا اور میں مارشل لاء کے خلاف نظمیں لکھنے لگا میرے ایک کولیگ نے کہا' باز آ جاؤ فوجی تمہیں یہاں سے تبدیل کر دیں گے میں نے کہا یہ شکر گڑھ ہے یہاں سے آگے تو ہماری فوج نہیں جا سکتی تھی مجھے کہاں پھینکیں گے' حوالہ 1971ء کی جنگ کا تھا۔

خیر اگلے دن پتہ چلا حمید اختر امروز ملتان کا چارج لے چکے ہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا' میرا ماتھا انتظار حسین کو FOLLOW کرتا ہے۔ بات بے بات ٹھنک جاتا ہے۔ حمید اختر کے ہم زلف فہیم جوزی میرا لاہور کے زمانے کا دوست ہے۔ وہ ملتان ریڈیو تبدیل ہو کر آ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا یہ حمید اختر یہاں کیا کرنے آیا ہے حمید اختر صاحب نے ترقی پسند صحافی پر کیسا حملہ کیا ہے۔ فہیم جوزی نے کہا کل میرے ساتھ چلو اور جا کر خود پوچھ لو۔ میرا کالم ظاہر ہے رُک گیا تھا میں فہیم جوزی کے ساتھ اسی دفتر پہنچا جہاں مسعود اشعر بیٹھتے تھے حمید اختر وہاں موجود تھے انہیں معلوم تھا کہ میں نے کالم لکھنا بند کر دیا ہے میں نے پہلی دفعہ حمید اختر کو دیکھا تھا کہنے لگے کالم لکھو گے میں نے کہا پہلے یہ بتائیں کہ آپ بھی ترقی پسند ہیں اور جو باہر بیٹھے ہیں وہ بھی ترقی پسند ہیں پھر آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ انہوں نے کہا میں تین سال سے پروگریسو پیپر سے نکالا گیا تھا اور بے روزگار تھا مجھے یہ آفر ہوئی کہ میں یہ چارج لوں اور مجھے میری ساری تنخواہیں مل جائیں گی میں اس لئے آ گیا ہوں کوئی اعتراض؟ ظاہر ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

حمید اختر اول سے آخر تک کہانی کار تھے جو بھی بولتے وہ کہانی ہوتی تھی۔ اب ضیاء الحق کے مارشل لاء کی ایک اور کہانی سنیں جو پکڑ دھکڑ فیض صاحب کی سالگرہ منانے پر ہوئی اس میں اداکار محمد علی کے ساتھ حمید اختر' معراج خالد' شعیب ہاشمی' اعتزاز احسن کے ساتھ کچھ اور نام بھی تھے البتہ ایک نام غلطی سے رہ گیا۔ وہ تھے اداکار حبیب' حمید اختر کہتے ہیں حبیب کبھی ترقی پسند تحریک یا سیاست سے وابستہ نہیں تھے انہیں کچھ بھی پتہ نہ چلا کہ وہ کس لئے دھر لئے گئے ہیں لیکن اتنے شریف انسان ہیں کہ خاموش رہے اور سب کے ساتھ جیل پہنچ گئے بعد میں معلوم ہوا کہ حبیب جالب کے شبے میں پکڑے گئے ہیں ایسے ہی ہمارے ڈاکٹر انوار احمد ملتان میں انڈر گراؤنڈ ہو گئے تو چار انوار احمد مختلف کالجوں سے پکڑے گئے انوار احمد میرے شاگرد مہدی لنگاہ کے بنگلے کے تہہ خانے میں روپوش ہوئے تھے جو مسلم لیگ ن کے ایم پی اے ہیں۔ اس بنگلے کا ایک یادگار واقعہ ہے اسی ضیاء الحق مارشل لاء کے شروع کا ہے میری ترقی پسند عالمی شاعری کے ترجموں کی کتاب ''زمین زاد کا افق'' شائع ہوئی۔ اس کی تقریب ملتان میں انوار احمد نے کی۔ مارشل لاء کے خلاف سب ادیب' شاعر' صحافی' سیاسی کارکن اُمڈ

آئے۔ اس تقریب میں لاہور سے میں' کشور ناہید اور منو بھائی کو لے کر آیا تھا۔ اب رات کو ان کو مہدی لنگاہ کے بنگلے میں ٹھہرایا گیا۔ جب ہم سب اس بنگلے میں پہنچے تو میزبان ہمیں ایک بڑے بیڈ روم میں لے گئے جس میں عروسی بیڈ لگا ہوا تھا انوار احمد نے بتایا کہ ہم سے یہی کمرہ ہی ممکن ہوسکا ہے اس کے ڈبل بیڈ پر کشور ناہید اور منو بھائی کو رات گزارنی تھی اور دو دن پہلے اسی حجلہ عروسی میں ایک دولہا' دلہن سہاگ رات گزار چکے تھے اب جب منو بھائی نے اس حجلہ عروسی کو دیکھا تو کشور ناہید کی طرف منہ کرکے یہ کہا' اک وار فیر شرمندہ ہونڑاں پے گا۔ (ایک دفعہ پھر شرمندہ ہونا پڑے گا) اس وقت جو موجود تھے قہقہوں میں لوٹ پوٹ ہوگئے۔

اب حمید اختر کے اس بیان پر آتے ہیں جو انہوں نے اس جیل کے تجربے کے بعد بیان کیا۔ فیض کی سالگرہ کے مجرم کوٹ لکھپت جیل میں تھے محمد علی کے گھر سے بریانی کی ایک دیگ روزانہ جیل میں آیا کرتی تھی فیض کے مہمان مستفید ہوتے جو بچ جاتا وہ مشقتیوں کے کام آتا ایک دن کچھ خبری ہوگئی اور دیگر کی تلاشی لی گئی بریانی کی دیگ کی تہہ میں بڑی کاری گری سے دو سکاچ کی بوتلیں اس طرح رکھی جاتی تھیں کہ بریانی کی گرمائش ان پر اثر انداز نہ ہو۔ اب کیا تھا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر فیروز پور روڈ کا ماتھا ٹھنکا اور علی بھائی کو عین موسم گرما میں میانوالی جیل کی راہ دکھا دی گئی جہاں سے علی بھائی نے ضیاء الحق کو معافی نامہ بذریعہ اسکی بیٹی زین جو کہ فین تھی علی بھائی کی بھجوا دیا۔ علی بھائی گلبرگ اپنے بنگلے واپس پہنچ گئے فیض سے رومانس مہنگا پڑا اب جب سب لوگ ضمانت پر باہر آئے تو معراج خالد سے نہ رہا گیا محمد علی کے کسی بیان پر معراج خالد نے بیان دیا کہ جو لوگ معافی نامہ لکھ کر رہا ہوتے ہیں انہیں بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ روزنامہ جنگ کے صفحہ اول پر محمد علی کا بیان چھپا کہ مجھے طعنہ دینے والے بھول گئے کہ وہ روزانہ میری بریانی اور شام کی سوغات سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ حمید اختر کو یہ بیان بہت برا لگا انہوں نے زبانی تبصرہ کیا کہ فیض کے چاہنے والوں کے دو طبقے ہیں ایک وہ جو فیض کی چاہت کو سٹیٹس سمبل سمجھ کر استعمال کرتے ہیں دوسرے وہ جو کشتہ فیض ہیں۔ حمید اختر کسی بھی محفل یا جلسے میں ہوں وہ یادیں بیان کرنے کا موقع خود ہی آسانی سے نکال لیا کرتے تھے۔ یہ ہنر صرف داستان گو کا ہوتا ہے ان کے اندر ایک قصہ گو موجود تھا کمیونزم کے زوال پر کمبھیر فلسفیانہ گفتگو میں بھی وہ یہ قصہ نکال لیتے تھے کہ ماسکو میں فیض صاحب کے ساتھ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے لوٹس کی ادارت سے پہلے کا ذکر ہے کیونکہ لوٹس کی ادارت کے وقت جب فیض صاحب ماسکو آئے اور روسی حکام ان کے خطوط کو خاطر میں نہیں لائے تو وہ تفصیل لڈ بیلا نے لکھی ہے یہ پہلے کا احوال حمید اختر بتاتے ہیں کہ ہم نے اپنے کمرے میں سوڈے اور برف کا آرڈر دیا کوئی دینے نہیں آیا تو فیض صاحب کا ماتھا ٹھنکا ایک تو انتظار حسین ہر جگہ ہوتا ہے قصہ گو جو ہوئے اور فیض صاحب نے کہا' سوویت یونین کو مغربی دنیا میں ہونیوالے اعتراضات کا جواب اس طرح تو نہیں دینا چاہئے کہ سوڈا اور برف ہی غائب کردیں.....

حمید اختر کا NARRATIVE کمال کا تھا۔ وہ بمبئی میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کے کارکن یا آفس بیریئر طور پر خدمات انجام دے رہے تھے تو ایک قمیص سکھاتے تھے اور اسی کو پھر پہنتے تھے۔ ترقی پسندوں میں سے کئی ادھر ادھر ہوئے بلکہ احمد ندیم قاسمی صاحب کہیں بیچ میں ٹھگ لئے گئے اور فتح محمد ملک نے اپنی کتاب میں قاسمی صاحب کے جو خطوط چھاپے وہ قاسمی صاحب کو جنت میں چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ ایسا ملک صاحب نے خصوصی طور پر کیا ہے یہ مجھے معلوم نہیں کہ کیوں کیا ہے؟ اس لئے کہ ایک خط میں قاسمی صاحب نے بے بسی میں لکھا ہے کہ ملک صاحب مجھے نہیں معلوم کہ میں کون ہوں ترقی پسند مجھے نہیں مانتے اور دائیں بازو والے مجھے گالیاں دیتے ہیں۔ ہماری ادبی سماجی اور معاشرتی تاریخ میں ایسے مغالطے مورخ کے ہیں یا خود ہمارے ہیں کہ لیاقت علی خان نے ایسا کیوں کیا؟ قائداعظم محمد علی جناح نے ایسا کب کہا' مجھے تو مورخ نے بتایا ہے کہ پاکستان میں تاریخ دان بے بس ہے تاریخ دان ان کرداروں کے ہاتھوں یرغمال ہے جو اپنی مرضی کی تاریخ لکھواتے ہیں۔

معاملہ حمید اختر کا ہے جو خود چلتی پھرتی سیاسی' سماجی' ادبی اور ثقافتی تاریخ تھے ترقی پسند تحریک میں حمید اختر کسی قسم کے گلیمر اور پہلی صف کے لکھنے والوں سے دور رہے آخری صف میں کارکن بن کر جمے رہے۔ گلیمر کس کس کے حصے میں آیا۔ یہ سب جانتے ہیں۔ انقلاب تو نہیں آسکا مگر انقلاب کے راستے میں خرچ ہونے والوں کا حساب کون رکھے گا۔ سجاد ظہیر کا مجھ جیل کا حساب کون دے گا۔ اس کی چھوٹی بیٹی نور ظہیر اپنی کتاب میں باپ کو یاد کرتے ہوئے پوچھتی ہے حمید اختر کا پورا خاندان معاشی اور معاشرتی سطح پر کہاں کہاں مایوس ہوا اور کہاں کہاں چھوٹی عمروں میں گھر چلانے کے لئے کام پر نکل پڑا کسے معلوم ہے ہاں مگر مجھے معلوم ہے 1987ء میں میرا سیریل آسمان پی ٹی وی پر شروع ہوا ایک جھونپڑ پٹی میں ایک عورت عزت بچانے کے لئے قتل کر دیتی ہے عمر قید ملتی ہے جیل میں بیٹی پیدا ہوتی ہے اور وہ بیٹی ماں کے ساتھ جیل میں بڑی ہوتی ہے۔ اس نے دنیا نہیں دیکھی۔ یہ ماں بیٹی کا کردار حمید اختر کی بڑی بیٹی صبا حمید اور سب سے چھوٹی بیٹی لالہ رخ نے ادا کیا اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ یہ ماں بیٹی نہیں' دو بہنیں ہیں اور ان بچوں کے لئے حمید اختر نے اتنا لمبا سفر طے کیا شاید ہمارے لئے بھی۔ ہم جو خود کو ترقی پسند کہتے ہیں تو کیا ہم اس پاکستان میں اگر دیوار سے لگتے جا رہے ہیں تو کیا اس میں حمید اختر کا قصور ہے یا ہمارا۔ حمید اختر تو کسی سے ڈرے نہیں جیل گئے اور کسی بھی قسم کی سزا سے نہیں ڈرے۔ اب سوچنے کی بات ہے کہ ترقی پسند لکھنے والوں سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئیں احمد ندیم قاسمی ساری زندگی فیض کے REACTION میں زندہ رہے فیض صاحب تو قطعی ان کے REACTION میں نہیں تھے۔ قاسمی صاحب نے اپنی وفات سے ذرا پہلے جو مضمون لکھا وہ فیض صاحب کی شراب نوشی کے حوالے سے بالکل غلط PERCEPTION تھا اور احمد ندیم قاسمی آخری سانس تک نہ سمجھ سکے کہ وہ غیر ترقی پسند مفاد پرست لکھنے والوں میں گھر چکے ہیں اور انہی کے درمیان انہوں نے جان دی..... حمید اختر کا سفر

صاف سیدھا اور کسی وسوسے کے بغیر طے ہوا۔ ہاں مگر ایک بار میں نے حمید اختر کو مضطرب پایا۔ یہ واقعہ بہت حساس ہے پردہ داری بھی ضروری ہے چونکہ میں اس میں ایک کردار تھا اس لئے بس اتنا بتاؤں گا کہ حمید اختر پر حملہ اچانک بھی ہوا اور نامناسب بھی حملہ آور کون تھا؟ میں کہانی روکتا ہوں اور آپ کو کچھ دیر کے لئے اور NARRATIVE پہ لے کر جاتا ہوں کہ پاکستان فلم انڈسٹری بیٹھ چکی ہے اس کے تیس مار خان ایک ایک کر کے فارغ ہو چکے ہیں ایسے میں فلم کے اداکار تھیٹر کا سہارا لیتے ہیں اور تھیٹر والے ٹی وی والیوں کو بھی لپیٹ لیتے ہیں اب کہانی رُک نہیں سکتی' کہانی حمید اختر کے گلے تک آ جاتی ہے گلا تو پہلے ہی بیماری نے دبوچ رکھا ہے اب حمید اختر مجھ سے کہتا ہے یہ جو پنجابی فلموں کا فلمساز' اداکار اور خود ساختہ گلوکار میرے گلے پڑ رہا ہے تو میں کیا کروں؟ میں نے کہا حمید اختر صاحب میں بھی اسی منڈی کا آدمی ہوں جب کوئی چھوٹا گلے پڑ جائے تو عزت بچانی چاہئے اب معلوم نہیں حمید اختر کوئی زخم دل پر لے کر گئے یا عزت بچا کر گئے یہ میں نہیں بتا سکتا۔

جلالی اور جمالی
قدرت اللہ شہاب

ہمارے ادب میں بہت شان و شوکت اور تام جھام والی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں۔ جن سے آنکھ ملانے کا حوصلہ مشکل سے ہوتا ہے۔ خود ہمارے اپنے زمانے میں ساٹھ' ستر کی دہائیوں میں بڑی گونج تھی بڑا طنطنہ تھا۔ اخباروں میں ادبی پرچوں میں ایسی اشرافیہ کا جن کا تعلق کسی نہ کسی سطح پر حکومتی اداروں' سرکاری عہدوں یا براہ راست حکومت وقت سے تھا' ان میں دو طرح کی شخصیات تھیں ایک وہ جن سے ملنے کو جی چاہتا تھا اور دوسری وہ جن کے قریب جاتے ہوتے باادب باملاحظہ ہوشیار کا سامنا کرنا پڑتا تھا پہلی قسم کی شخصیات میں اختر ریاض الدین' ابن انشاء' ن۔م راشد وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں اور دوسری قسم کی شخصیات میں قدرت اللہ شہاب اور الطاف گوہر کا نام آتا ہے۔ جب ہم نے پڑھنا لکھنا شروع کیا تو ان دونوں شخصیات کا طوطی بول رہا تھا۔ کراچی' لاہور اور اسلام آباد کے جغادری اور ثقہ ادیب دونوں کی قربت حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتے تھے دونوں کی ایک ٹیلی فون کال کے لئے ہمارے بعض ادیبوں نے گھروں میں پہلی دفعہ ٹیلی فون لگوا لئے تھے دونوں کے متعلق مختلف معجزاتی اور کراماتی واقعات گردش کرنے لگے کالم نویسوں نے الگ سماں باندھا۔ ادبی پرچوں نے الگ ہوا باندھی انہی دنوں یہ واقعہ عام ہوا کہ قدرت اللہ شہاب سلیمانی ٹوپی پہن کر اسرائیل کا دورہ کر آئے ہیں۔ بعد میں شہاب نامہ نے اس واقعہ کی تصدیق کر دی۔ اس ادبی فضا میں اچانک رائٹرز گلڈ بن گئی اور پھر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا گروہ بندیاں ہونے لگیں مراعات حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ ہونے لگی غیر ملکی دوروں اور ہوائی جہاز کی سیر کا سلسلہ عام ہوا جسے الطاف گوہر اور قدرت اللہ ہاب نے ایک نظر دیکھ لیا۔ وہ پھولے نہیں سماتا تھا پھر وفود بننے لگے۔ کوئی ڈھاکہ جا رہا ہے اور کوئی ڈھاکہ سے

آ رہا ہے۔ سیاسی بے اعتدالیوں کو ادیبوں کے ذریعے اعتدال پر لانے کا عمل شروع ہوا جو 71ء کی جنگ کے بعد اپنے انجام کو پہنچ گیا لیکن اس سے قبل بہت کچھ ہوا کئی سیمینار' کئی دورے' کئی پلاٹ' کئی عہدے دونوں کے اثر و رسوخ سے حاصل ہونے لگے اور طرح طرح کی کہانیاں سننے کو ملنے لگیں پھر ادبی انعامات نے ماحول کو بہت گرمایا زور دار قسم کی گروہ بندیاں ہوئیں کسی کا انعام کسی کی جھولی میں گرا بس یہاں سے ہمارے ادیبوں نے کسی حد تک سرکاری اور غیر سرکاری مراعات میں حصہ دار بننا شروع کر دیا جس کا سلسلہ بہت دُور تک چلا جاتا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ غیر معترضہ تھا۔ ہم ذکر کر رہے تھے الطاف گوہر اور قدرت اللہ شہاب کی کرشمہ سازیوں کا۔ الطاف گوہر تو خیر میڈیا کو کنٹرول کرنے میں مصروف ہو گئے لیکن قدرت اللہ شہاب جانتے تھے یہ سرکار دربار زیادہ دیر وفا نہیں کرتا۔ اس لئے کچھ سامان اگلے پڑاؤ کا بھی کر لینا چاہئے یہ خیال الطاف گوہر کو بہت بعد میں آیا جب انہوں نے اسلامیات کے شعبے میں کام کیا۔ قدرت اللہ شہاب تو خیر اپنے دو افسانوں ''یا خدا'' اور ''ماں جی'' کی وجہ سے اردو افسانے کا مستقل حوالہ بن چکے تھے پھر بھی انہیں ضرورت تو تھی کہ اپنی تخلیقی وسعت کو دریافت کریں زندگی کے بھرپور تجربے کا اثاثہ تو ان کے پاس تھا ہی جب ذرا کاروبار دنیا سے فرصت ملی تو وہ دوبارہ افسانے کی طوف لوٹ کے نہیں گئے۔ شاید ایک خوف سا تھا کہ ماں جی اور یا خدا میں افسانے کو جہاں چھوڑا تھا وہاں سے اٹھائیں تو کیسے اٹھائیں اور بیچ بیچ بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا تھا افسانے کی دنیا میں رونق لگ چکی تھی کہیں انتظار حسین کا تانگہ دوڑ رہا تھا کہیں اشفاق احمد نے گھیٹھر لگا رکھا تھا۔ کہیں احمد ندیم قاسمی کا چھابہ لگا ہوا تھا کہیں ترقی پسندوں نے دکان سجا رکھی تھی تو کہیں جدید علامتی افسانے کی شعبدہ بازیاں موضوع بنی ہوئی تھیں ایسے میں قدرت اللہ شہاب نے مناسب سمجھا کہ دوبارہ اس کوچے کا رخ نہ ہی کیا جائے تو اچھا ہے تو پھر کیا کریں ایک بڑی واردات اور بڑے تجربے کا ناول لکھیں اس کے لئے خود اپنی زندگی کو حوالہ بنائیں یا اسی تپسیا میں سے کوئی کندن نکالیں واقعہ نگاری اور حقیقت نگاری تو ان کے تخلیقی جوہر میں شروع سے شامل تھی جس پر سرخ فیتہ کچھ دیر کے لئے لگ گیا تھا' اب جو سرخ فیتہ کھلا تو کتاب زندگی کے سارے باب کھل گئے۔ قدرت اللہ شہاب نے کئی بار سوچا ہوگا کہ ناول لکھوں یا آپ بیتی کیا لکھ ہوگا یا کیا آ گہی ہوگی کہ شہاب صاحب کو لگا ناول میں ان کی ذات اور زندگی کے کھرے تجربے اپنا جلوہ نہیں دکھا سکیں گے اور سب سے بڑھ کر ان کی شخصیت اور ان کی ذات کا طلسم کیسے بندھ پائے گا یہ سوچنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ آپ بیتی اردو ادب کو نئے حقائق اور نئی انسانی کیفیات سے آشنا کر سکے گی۔ آپ بیتی ہمارے معاشرے میں ذرا سوچ سمجھ کے لکھی جاتی ہے معاشرے کی قوت برداشت تو بس اتنی سی ہے کہ طوائف اور شرب کو کئی برقعے پہنانے پڑتے ہیں اور پڑھنے والوں کو اپنے تخیل کا سہارا لے کر مطلوبہ نتائج حاصل کرنے ہوتے ہیں ایسے میں جوش ملیح آبادی تو اپنی دبنگ شخصیت اور شاعری کا الاؤنس لے کر بخشے گئے ورنہ ان کی کتاب تو ضبط ہو ہی جاتی اس کے

ساتھ ان کی زندگی کی بچی کھچی سانسیں بھی ضبط ہونے کا اندیشہ تھا ایسے میں قدرت اللہ شہاب کیسے کوئی معرکہ انجام دے سکتے تھے۔ انہیں کس چیز نے بچالیا یا ان کی گٹھڑی میں ایسا مال تھا جو عام طور پر آپ بیتیوں میں نہیں ہوتا۔ قدرت اللہ شہاب کو سرکاری فائلیں سلیقے سے رکھنا اور انہیں نمٹانا آتا تھا انہیں معلوم تھا کس فائل کو کتنی دیر روکنا ہے اور کس کونے میں رکھنا ہے۔ اپنی زندگی کے واقعات کی فائلیں بھی انہوں نے بہت سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں اس کا پتہ ''شہاب نامہ'' پڑھ کے ہوتا ہے البتہ حیرت کی بات یہ ضرور ہے کہ آپ بیتی جن باتوں سے مقبول ہوتی ہے ان میں سے ایک بھی بات شہاب نامہ میں نہیں ہے۔ اس کے باوجود شہاب نامہ نے مثالی مقبولیت حاصل کی۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ سنگ میل پبلی کیشنز نے قدرت اللہ شہاب سے یہ آپ بیتی حاصل کرنے کے لئے بہت بھاری قیمت پیش کی تھی۔ یہ تو سنگ میل کے جناب نیاز احمد کی کاروباری بصیرت تھی کہ انہوں نے پہچان لیا تھا کہ یہ آپ بیتی ان کے ادارے کی نیک نامی میں اضافہ کرے گی اور پھر یہی ہوا کہ مہینے میں ایک ایڈیشن ایسے بکتا تھا جیسے تازہ جلیبیاں بکتی ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ روایتی فارمولے اور مصالحے کو استعمال کئے بغیر شہاب نامہ اتنا کیسے مقبول ہوگیا۔ نہ اس میں عورتوں کے دل لبھانے والے قصے ہیں نہ اس میں زندگی کی بے اعتدالیوں کے سخت مقامات آتے ہیں۔ نہ مقدس رشتوں پر بے رحم حقیقت نگاری کے چھینٹے پڑے ہوئے ہیں پھر کون سے تجربے ہیں جنہیں اردو ادب کے قاری نے اپنے طرز احساس کے ساتھ جڑتے ہوئے محسوس کیا ایک بات یہ بھی اہم ہے کہ جب شہاب نامہ آتا ہے قدرت اللہ شہاب گوشہ گمنامی میں جاچکے تھے بس ان دنوں کی یاد ہی گردش کررہی تھی ان کا وہ اثر ورسوخ اور دبکا باقی نہیں رہا تھا وہ ایک درویش کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی آپ بیتی ادب کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ روحانیات کی کرشمہ سازی تھی بیان کا انوکھا پن تھا یا تجربوں کا تنوع تھا یا شخصیت کا سحر تھا۔ آخر کیا تھا۔ شہاب نامہ کی فضا میں ایک پراسراریت ایسی تھی کہ پڑھنے والوں کو مسلسل نئی حیرت کی امید دلاتی تھی اور اپنے ساتھ ساتھ لئے جاتی تھی قدرت اللہ شہاب نے تو اپنی کامیاب واپسی کا راست تلاش کرلیا تھا اس کے ساتھ ہی الطاف گوہر نے قرآن مجید کی تفسیر کے ذریعے نہ صرا پنی نجات کا سوچا تھا بلکہ اپنی علمیت کا ثبوت دینے کی کوشش بھی کی میں جن سے ساٹھ ستر کی دہائی میں ہیں مل سکا تھا یا ان کے رعب کا سامنا نہیں کرسکتا تھا ان کے آخری دور میں قریب بیٹھنے کا موقع حاصل کرسکا۔ الطاف گوہر نے اپنی یادداشتیں بھی تحریر کرنی شروع کردی تھیں۔ اسے کیا پذیرائی ملے گی یہ ابھی دیکھنا ہے۔ قدرت اللہ شہاب تو لگتے تھے کہ کوئی صوفی اپنی بے نیازی کے حجرے سے نکل کر آپ کے سامنے آکر بیٹھ گیا ہے۔ سفید کرتے شلوار میں سفید بالوں کے ساتھ جب وہ آکر بیٹھتے تھے تو لگتا تھا ایک زمانہ ابھی کروٹ لے گا اور کسی پرانی یاد سے ہمیں ملادے گا وہ ان خوش قسمت ادیبوں میں سے تھے جنہیں زندگی میں بے پناہ انوکھے تجربوں کا بے پناہ تنوع کے ساتھ موقع ملا۔ یہاں کے ادیبوں کی بدقسمتی ہے کہ روزی روٹی کے

چکر میں وہ اپنے مختصر سے دائرے میں گھومتے رہتے ہیں سفر اور زندگی کے وسیع کینوس کا مشاہدہ نصیب نہیں ہوتا صرف اپنے طبقے تک محدود رہتے ہیں۔ عشق تو دوسری بات ہے عورت کو جاننے کے لئے لمحے بھر کا قرب بھی نصیب نہیں ہو پاتا۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو باہر کے ملکوں میں جانے کا اب موقع ملا ہے۔ اس کی حقیقت بھی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے میزبان کے گھر سے ایئرپورٹ تک بس یہی ان کی کل کائنات ہوتی ہے ایسے میں قدرت اللہ شہاب کو اقتدار کے ایوانوں سے لے کر دنیا کے عجائبات تک ہر شے دیکھنے کا موقع ملا اس لئے شہاب نامہ انوکھے تجربوں کی دستاویز بن گیا لیکن کیا یہ کافی ہے کہ آپ نے اتنے انوکھے تجربے کئے ہوں ایسا تو ہوسکتا ہے بے شمار اور لوگوں نے بھی کیا ہے۔ اصل طلسم شہاب صاحب کے بیان کا ہے یا بیان کرنے کے یقین کا یہ دو مختلف باتیں ہیں۔ بیان کا حسن اور بات ہوتا ہے اور بیان کے پیچھے بیان کرنے والے کا یقین کچھ اور ہوتا ہے قدرت اللہ شہاب جو بات بھی کرتے ہیں پڑھنے والا یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اگر خود کو صوفی اور کرامتی سے بڑھ کر کسی فرقہ باطنیہ کا سربراہ منوانا چاہتے تو منوا سکتے تھے۔

شہاب صاحب کا کمال کیا یہ کم ہے کہ بابوں کے سپیشلسٹ اشفاق احمد کو اپنا مرید بنا لیا۔ اشفاق صاحب ہوشیار قسم کے بابا سپیشلسٹ ہیں۔ وہ اپنے بابے بدلتے رہتے ہیں جیسے بعض سیاستدان پارٹیاں بدلنے میں مشہور ہوتے ہیں جیسا زمانہ ہوتا ہے ویسا ہی اشفاق صاحب کا بابا ہوتا ہے۔ چونکہ اشفاق صاحب کو تمام عقل کی باتیں وہ بابا بتاتا ہے اس لئے زمانے کے مطابق وہ اپنا بابا اسی حساب سے رکھتے ہیں ان کی مہربانی ہے کہ وہ ہمیں وقتاً فوقتاً اپنے بابوں سے ملاتے رہتے ہیں۔ کبھی مغل پورے کا بابا' کبھی شیخوپورہ کا بابا' کبھی ننکانہ صاحب کا بابا' ایک زمانہ تھا اشفاق صاحب حضرت واصف علی واصف کی صحبت میں گیان حاصل کرتے تھے۔ پھر پتہ چلا قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی ان کے گرو ہو گئے ہیں مفتی جی تو خیر بے حد عوامی قسم کے گرو تھے ہمیں بھی اکثر آشیر باد سے نوازتے رہتے تھے البتہ قدرت اللہ شہاب جلالی اور جمالی قسم کے پیشوا قسم کے گرو تھے اور اشفاق صاحب نے آخری وقت تک انہیں قبول کئے رکھا۔ ہمیں یاد ہے شہاب صاحب کی برسی کی قرآن خوانی بڑی باقاعدگی سے اشفاق صاحب اور بانو آپا کے لان میں ہوتی رہی ہے جہاں بکرے کے گوشت کی دیگیں اور پلاؤں کے ساتھی موسمی میوہ جات کا بہت اہتمام کیا جاتا تھا۔

قدرت اللہ شہاب نے کیا کمال کیا کہ اپنے اقتدار کے زمانے میں جتنا اپنے پڑھنے والوں سے دور رہے اقتدار سے دور ہونے کے اور پھر وفات کے بعد اتنا ہی اپنے پڑھنے والوں کے دلوں میں آباد ہو گئے۔ یہ کرشمہ پاکستان میں تو کبھی نہیں ہوا کرتا شان و شوکت والے دور میں صرف مراعات پسند ادیبوں کے نرغے میں رہتے تھے اور وفات کے بعد ایک ہجوم عاشقاں اپنے پیچھے چھوڑ گئے کیسا نسخہ انہوں نے سرخ فیتے میں لپٹی فائل میں رکھ چھوڑا تھا یہ سوچنے والی بات ہے۔

ایک رومانوی کردار اور سیلون ٹی

اس نے ڈرامہ لکھنے کی بہت کوشش کی۔ پی ٹی وی پر ابھی میں گھٹنوں کے بل چل رہا تھا وہ اپنی وجاہت' متانت اور شرافت کو خوبصورت میچنگ کوٹ پتلون اور جوتوں کے ساتھ سنبھال کر چلتے ہوئے پروگرام منیجر کے کمرے میں داخل ہوتے اور واپسی پر اترا ہوا چہرہ لے کر رخصت ہو جاتے۔ معلوم نہیں تھا یہ اے حمید ہیں جن سے وابستہ رومانوی باتیں ریڈیو پاکستان سے خوشبو کی طرح نکلتی تھیں اور پی ٹی وی میں پھیل جاتی تھیں وہ ریڈیو کے زمانے کے تھے مگر ٹی وی کے زمانے میں کیوں نہ آباد ہو سکے جبکہ اشفاق احمد' انور سجاد اور شوکت صدیقی بھی تو ریڈیو کے راستے سے ٹی وی پر آئے تھے اور بہت سے فنکار بھی اسی راستے سے ٹی وی میں پہنچے تھے پھر اے حمید کی کہانی ٹی وی میں عینک والا جن پر آ کر کیوں ختم ہوئی اس پر میں نے اس وقت بھی سوچا تھا جب میں نیا نیا ڈرامہ نگار بنا تھا آج یہ عقدہ مجھ پر کھل گیا ہے اس لئے میں براہ راست اے حمید سے رجوع کرتا ہوں کہ کیا شاندار ادیب اور نثر نگار امرتسر سے لاہور آیا جبکہ لاہور سے امرتسر آنے جانے والے تو سنا ہے سائیکلوں پر روزانہ آ جا سکتے تھے۔ آج جب میں واہگہ کے راستے امرتسر کی زمین پر پاؤں رکھتا ہوں تو سامنے کی نئی کالونی کے ایک بلاک میں میرے دوست کا گھر ہے مشکل سے دس منٹ لگتے ہیں یہ سرحد عبور کر کے اس کے ڈرائنگ روم میں چائے پینے میں تو ایسے میں اے حمید بھی لاہور میں ایسے ہی آ کر بس گیا ہوگا مجھے اے حمید تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا جب میں ریڈیو پاکستان لاہور میں کبھی کبھار فہیم جوزی' شائستہ حبیب اور نسرین انجم بھٹی سے ملنے جاتا تھا تو وہاں کینٹین پر اے حمید بھی اپنی پسند کی چائے کے لئے آ کر بیٹھتے تھے اور اپنے گرد بیٹھے موسیقاروں' شاعروں' صداکاروں' سازندوں اور چانس لینے والے رنگروٹوں سے باتیں کرتے ہوئے سیلون کی چائے کے باغوں' برما کے جنگلوں' ہندوستان کی جھیلوں' گھاٹیوں اور وادیوں کے قصے سنایا کرتے تھے حاضرین مبہوت ہو کر سنتے تھے کہ یہ کیسا داستان گو آ گیا ہے۔

ریڈیو پاکستان لاہور میں کئی داستان گو ایک وقت میں اکٹھے ہو گئے تھے اور ان کے لئے سننے والے کم پڑ گئے تھے اس لئے اے حمید صبح کی نشست میں اپنے سامعین سنبھالتا تھا تو دوپہر کی نشست میں اشفاق احمد اپنے سامعین سنبھالتا تھا اور سہ پہر کے وقت منیر نیازی' انتظار حسین اور شہزاد احمد اپنی قصہ خوانی کا جادو جگاتے تھے اس بیچ امانت علی خان' فتح علی خان اور مہدی حسن اپنی ڈگڈگی بجا کے جا چکے ہوتے تھے یہ تھا ریڈیو پاکستان لاہور ایسے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ صبح سات بجے ریڈیو پاکستان لاہور سے سازوں پر راگوں کا پروگرام چلتا تھا اس کے بعد آٹھ بجے کلاسیکی سنگیت ہوتا تھا جو استاد فتح علی خان اور امانت علی خان پرفارم کرتے تھے ایک دن وقت سے پہلے استاد فتح علی خان اور امانت علی خان آ گئے اور جو سازوں کا پروگرام چل رہا تھا سننے لگے اتفاق سے وہ بے سرا بجا رہے تھے تو امانت علی خان نے بڑے بھائی سے پوچھا' پاجی اے کی وجا ریا اے (یہ کیا بجا رہا ہے) بڑے بھائی نے جواب دیا

اے اٹھ وجاریا اے (یہ آٹھ بجا رہا ہے)۔

اب اے حمید ریڈیو پاکستان لاہور کا مستقل قصہ گو تھا ایک کمرے سے دوسرے کمرے دوسرے سے تیسرے کمرے اس کی ٹیپ چلتی تھی وہ ٹیپ ایک بار میں نے بھی سنی۔ جب میں امرتسر میں تھا تو وہاں یک باغ میں صبح ایک مور اترتا تھا پھر بولتا تھا اور پنکھ پھیلاتا تھا پھر قمریاں اترتی تھیں پھر فاختائیں' پھر لالیاں' پھر چڑیاں اور پھر باغ چہکتا تھا۔ واضح رہے یہ جلیانوالہ باغ نہیں تھا۔ اگرچہ یہ وہی باغ تھا یہ اے حمید کی حقیقت کے خلاف بغاوت تھی رومانوی بغاوت۔ اب میں اے حمید سے کیسے ملا یہ بھی بتانا اس لئے ضروری ہے کہ اے حمید کو دیکھنا اس سے سلام لینا۔ آٹوگراف لینا اور بات ہے اور جاننا اور بات ہے ب ایسا ہوا کہ بمں ضیاء الحق کے مارشل لاء کا شکار ہوا تو تبادلہ شکر گڑھ میں اور پھر شیخوپورہ میں ہوا۔ میں ہاں پہنچا تو پہلے سے احمد عقیل روبی گزشتہ دس برسوں سے وہاں گھوڑے بیچ کر براجمان تھا اور نئے آنے الوں کے لئے گاڈ فادر کا درجہ رکھ چکا تھا۔ چنانچہ ان کے چرنوں میں ہم نے آشیرواد لیا۔ اگلے دن وہ ھے جغرافیہ کے استاد کی لیبارٹری میں لے گئے اور کہا کہ یہاں ہم روزانہ چائے پیتے ہیں ایک بہت بصورت اور وضع دار پروفیسر نے مجھے بٹھایا' پائپ سلگایا کش لیا اور پھر پانی کی کیتلی ہیٹر پر رکھی خوبصورت پیالیاں سامنے رکھی تھیں احمد عقیل روبی نے بتایا یہ رنگروٹ ملتان سے آیا ہے مارشل لاء کے غضب کا شکار ہوا ہے۔ اب بھی باز نہیں آ رہا اور مارشل لاء کے خلاف نظمیں لکھتا ہے وہ خوش ہوئے اور کہا صحیح آدمی کو لائے ہو اب تو روز نشست ہوا کرے گی۔ یہ تھے ارشاد غالب جو اے حمید کے چھوٹے ائی تھے۔ اب اے حمید سے روزانہ ملاقات ہونے لگی جو ارشاد غالب کا بھائی تھا۔ باتیں چلتی رہیں امرتسر میں اے حمید کے والد کی مسلمانوں کے محلے میں دودھ دہی کی دکان تھی جہاں پیڑوں والی لسی ان کے والد خود بلوتے تھے اور صبح ناشتے میں دہی کلیجے اور بند ڈبل روٹی کے ساتھ لسی کا رواج عام تھا۔ اے حمید کو آوارہ گردی کا چسکا لگ چکا تھا ہاتھ نہیں آتا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے کا زمانہ امرتسر میں بہت سی خصیات سے چہک رہا تھا فیض صاحب تاثیر صاحب تو تھے ہی سعادت حسن منٹو بھی باری علیگ کے ساتھ روسی ادب کے ترجمے کرنے میں لگا ہوا تھا۔ سیف الدین سیف' شہزاد احمد اور شاد امرتسری بھی ہیں کہیں اڑنا سیکھ رہے تھے اے حمید کو شروع ہی سے کہانیاں گھڑنے کا چسکا لگا ہوا تھا خیالی کہانیاں نانے کی بہت مشق ہوگئی تھی خوبصورت باغ' پھولوں سے بھرا لان' ایک لڑکی درختوں اور طرح طرح کی بلوں کے نام اور بس کہانی تیار ہونی تھی۔ باقی کی کسر اس دور کے افسانہ نگاروں نے پوری کردی تھی جو آمدوں کھجریل کی چھتوں' ناریل کے درختوں' بوگن بیلا کی بیلوں اور رات گئے کے راستوں کو اپنی ہانیوں میں رومانوی انداز سے بیان کررہے تھے۔ اے حمید گھر سے بھاگ جاتا تھا دہلی پہنچ جاتا تھا سی نئے ادیب کے ہاں ٹھہر جاتا پھر واپس آجاتا بچپن میں اسے ملائی کھانے کی عادت پڑ گئی تھی جب ہی کے کونڈوں میں والد دہی جماتے تھے تو آدھی رات کے بعد اے حمید اٹھتے تھے اور کونڈوں کے اوپر

جمی ملائی اتار کر کھا جاتے تھے صبح ننگی دہی کو دیکھ کر باپ نے راتوں کو پہرہ دینا شروع کیا اور پکڑ لیا مار کھانے کے بعد پھر کسی لمبے سفر پر بھاگ گیا۔ سنایا کرتے تھے کہ میں برما چلا گیا۔ وہاں کے جنگلوں کی خوشبو مجھے کھینچ کر لے گئی تھی وہاں چائے کا چسکا لگ گیا۔ چائے کی خوشبو اسے کہیں بھی لے جاسکتی تھی۔ ایسے میں سیلون ٹی کے لئے سری لنکا بھی نکل گیا معلوم نہیں کہاں کہاں چائے کے باغات میں بھٹکا پھرا۔ ان کی کہانیوں میں یہ سب ماحول جیتا جاگتا موجود ہے معلوم نہیں وہ یہ سفر سچ میں کرتا تھا یا سب خیالی تھا میں اس راز سے پردہ نہیں اٹھا سکتا البتہ مجھے شک ہے وہ یہ سب سفر آنکھیں بند کر کے ایک جگہ بیٹھے ہوئے کر لیتا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد لاہور اور خاص کر ریڈیو پاکستان لاہور' روزی کمانے کے لئے ایک معزز اور آسودہ راستہ تھا سوائے سعادت حسن منٹو کے جس پر ریڈیو پاکستان لاہور کے دروازے نہ کھل سکے۔ فحش نگاری کا لیبل اس کے ماتھے پر لگا دیا گیا تھا۔ اے حمید' مختار صدیقی' شہزاد احمد' اشفاق احمد' ناصر کاظمی' انتظار حسین' منیر نیازی جو ذرا بعد میں ساہیوال سے آئے شامل ہوگئے۔ اور بھی قلم کان پہ رکھ کر گھر سے نکلنے والے بہت سے لکھنے والے تھے جو اس ریڈیو پاکستان میں سما گئے مگر ان سب میں شہزادہ اے حمید ہوتا تھا۔ خوب بن ٹھن کے سگریٹ کی ڈبی اور ماچس ریڈیو کی عمارت کے پھاٹک کے پاس بیٹھے ہوئے پان لگانے والے سے لے کر داخل ہوتے اور خراماں خراماں داخل ہوتے پہلے مختلف کمروں کا چکر لگاتے جہاں کوئی ٹکڑی جمی دیکھی بیٹھ گئے چائے سگریٹ چلتی رہی کسی نے آ کے پکڑ لیا کہ فیچر لکھ دیں دوسری میز پر بیٹھ کر فیچر لکھ کے فارغ ہوئے اور نہیں تو کینٹین پر چلے گئے جہاں کبھی امانت علی خان' کبھی فتح علی خان سلامت نزاکت' کبھی حسن لطیف کبھی استاد نذر حسین' کبھی روشن آرا بیگم کبھی ملکہ پکھراج کبھی زاہدہ پروین' کبھی نسیم بیگم' کبھی نئے ابھرتے فنکاروں میں مہدی حسن اور غلام علی اپنی شہرت کے ستاروں کے پیچھے لپکتے ہوئے دور کی کوڑی لانے میں مصروف رہتے فنکاروں اور صداکاروں کی ایک کہکشاں ادھر پڑاؤ کئے رہتی تھی۔ ایسے میں اے حمید سب کو انوکھی کہانیاں اور اپنے سفر کے قصے سناتے سناتے شام پڑے واپسی کے سفر پر چل پڑتے پھر پاک ٹی ہاؤس کافی ہاؤس اور بیچ میں لارڈز اور کچھ اور چائے خانے بھی آتے تھے بس یہ دن بھر کا سفر تھا اے حمید کا بلکہ ان جیسے اور ادیبوں کے بھی یہی معمولات تھے۔

میں جب اے حمید سے ملا اور قریب آیا تو یہ میرا ٹی وی کا زمانہ ہے کہ میں ریڈیو پاکستان لاہور میں پہلے نہیں گیا۔ ٹی وی پر ڈرامے لکھنے کے بعد بلایا گیا اور جن پروڈیوسروں سے دوستی ہوئی ان میں ایکٹر جمیل ملک جو پروڈیوسر بھی تھے موسیقار خیام کے بھائی عبدالشکور بیدل اور دوسرے بھائی جو پی آئی اے میں تھے مشتاق ہاشمی' ریاض محمود جو اشفاق احمد کے خاص دوست اور پروڈیوسر تھے فہیم جوزی' شائستہ حبیب' نسرین انجم بھٹی' اعظم خان (موسیقی کا بڑا پروڈیوسر) خالد شیرازی' (میرا یار غار) اور الطاف

الرحمٰن (اداکار اور صوتی اثرات کا ماہر) شامل تھے۔ اے حمید کو میرے سیریل پسند آئے خاص طور پر ''دریا'' ''پیاس'' اور ''خواہش'' بس اس کے بعد اے حمید سے یاری ہوگئی اکثر ان کے گھر ملاقات ہوتی جونہی داخل ہوتا' پہلا سوال لیمن ٹی' جیسمین ٹی' سیلون ٹی یا پھر لپٹن ٹی میں چائے کا شوقین نہیں ہوں اے حمید ان میں سے کوئی چائے نہیں بناتا تھا انگریزی چائے (TWINNINGS) کا ڈبہ لے کر آتے اور کہتے یہ آج پلاؤں گا معلوم نہیں وہ چائے کے باغ میں پیدا ہوئے تھے یا پھر چائے کے پودے کی جڑیں اے حمید کے اندر بسرام کرتی تھیں اے حمید نے بہت لکھا پبلشروں نے بھی انہیں بہت لفٹ کرائی کہ ان کی کتاب نکل جاتی تھی انہوں نے یادنگاری' خاکہ نگاری' افسانہ نگار' ناولٹ نگاری اور سفرنامہ نگاری میں کوئی میدان خالی نہیں چھوڑا۔ یاد لکھنے کے وہ ماہر تھے ایک ملاقات بھی کافی ہے۔ اس پر کتاب لکھ سکتے تھے۔ وہ جو شعر زندگی بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے۔ اے حمید سب کا دوست نہیں تھا لاہور میں بس گنے چنے لوگ تھے جن سے وہ ملتے تھے میری خوش قسمتی کہ میں ان چند میں شامل تھا اے حمید کو لوٹنے والوں میں نوائے وقت کا مالک مجید نظامی شامل تھا۔ اتنا ظالم انسان میں نے نہیں دیکھا کہ جب اے حمید بیمار ہوئے اس نے کوئی مدد نہیں کی۔ اور صرف تین سو روپے ایک قسط کے ادا کرتا رہا جبکہ دوسرے اخبار ہزروں لاکھوں کے پیکیج دے رہے تھے یہ ذکر بعد میں آئے گا۔

اے حمید کو قریب سے دیکھنے کا موقع چین کے پندرہ روزہ سفر میں مجھے ملا۔ یہ 1998ء ہے نذیر ناجی اکادمی ادبیات کے چیئرمین تھے اور میرا نام مظہر الاسلام نے کئی مرحلوں میں منسٹری سے منظور کرایا تھا جو اکادمی کے ڈائریکٹر جنرل تھے۔ نذیر ناجی کا میں کبھی بھی پسندیدہ نہیں رہا۔ اس کی وجہ خود نذیر ناجی ہے جو اپنے مفاد کے بغیر کچھ نہیں دیکھتا مظہر الاسلام نے اس کے ہاتھ پاؤں کیسے باندھے یہ تو وہی بتا سکتا ہے خیر اس وفد میں سربراہ عبداللہ ملک تھے ان جیسا دبنگ صحافی اور ادیب کم ہی پیدا ہوا ہوگا۔ میں ڈپٹی لیڈر تھا اور وفد میں محسن احسن' اے حمید' زاہدہ حنا' بلوچستان سے نادر قمبرانی' فاٹا سے عنایت اللہ فیضی اور سندھ سے امر جلیل شامل تھے۔ آخری دنوں میں امر جلیل نے جانے سے منع کر دیا تو نذیر ناجی نے اپنے دوست شہزاد احمد سے کہا آپ چلے جاؤ۔ شہزاد احمد تیار ہوگیا اور اس طرح قافلہ روانہ ہوا۔ اب ایسا ہوا کہ شہزاد احمد چلے تو گئے مگر سرکاری طور پر چین کے ادبی ادارے کو کوئی خبر نہیں تھی کہ امر جلیل کی جگہ شہزاد احمد آرہے ہیں چنانچہ ہر تقریب میں سب کے ناموں کی تختی لگی ہوتی تھی اور شہزاد صاحب کو امر جلیل کی کرسی پر بیٹھنا پڑتا تھا ایک دن شہزاد احمد نے غصے کا اظہار کیا کہ یہ کیا ہے میرا نام یہاں کیوں نہیں ہے میں نے اپنے لیڈر کو پیغام پہنچایا کہ شہزاد صاحب نے گلہ کیا ہے اور وہ کھانے میں شامل نہیں ہیں عبداللہ ملک نے کہا سنو اصغر کھانا وہ کھالے گا اس کے بغیر اس کے پاس چارہ نہیں ہے اور یہی ہوا شہزاد صاحب نے کھانا ذرا بعد میں لے لیا اس کے بعد عبداللہ ملک شہزاد صاحب کے پاس گئے اور کہا جب آپ دوسروں کے ٹکٹ پر سفر کرتے ہیں تو پھر یہ سب برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اے حمید میرے ساتھ جہاز میں اصرار کر کے بیٹھے کہ آپس میں مزے کی باتیں ہوں گی پہلی بات یہ ہوئی کہ اے حمید نے جہاز کا ٹکٹ دیکھا اور مجھ سے پوچھا یہ ٹکٹ کتنے کا ہے۔ میں نے بتایا کہ یہ ستر اسی ہزار کا ہے۔ اے حمید نے کہا یار یہ پیسے مجھے دے دیتے تو میں چین کیوں جاتا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ آگے چل کر اے حمید کیا حساب کتاب کریں گے۔ اب ہم بیجنگ کے ہوٹل آ رہے تھے میں نے ایک گلی میں سکاچ وہسکی ایک سٹور میں دیکھ لی ساتھ ہی گاڑی ہمارے ہوٹل کی طرف مڑی اور ہم اتر گئے۔ جب کاؤنٹر پر آئے تو لگا چند منٹ لگیں گے۔ یہ شام کے قریب کا وقت تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ چینی چھ بجے ڈنر لگا دیتے ہیں اور مجھے تو رات کے لئے کچھ لینا تھا میں نے دیکھا کہ کاؤنٹر سے چابی ملنے میں ذرا دیر ہو سکتی ہے تو میں نے پاسپورٹ دکھا کر کرنسی تبدیلی کرائی اور عبداللہ ملک سے نظر چرا کر بغلی سڑک پہ چلا گیا۔ یہ میری چین میں پہلی شام تھی۔ اے حمید سے البتہ پوچھ لیا اسے تو کچھ نہیں چاہئے اس نے کہا چار بیئر کے ڈبے پکڑ لینا واپس آیا تو میرے کمرے کی چابی تیار تھی۔ سب اپنے کمروں کو جا چکے تھے جونہی لفٹ میں داخل ہوا عبداللہ ملک سکول ٹیچر کی طرح پیچھے سے آئے اور پکڑ لیا کیا لے کر آئے ہو تلاشی دے دی کہنے لگے رات کو چھاپہ ماروں گا اب جاؤ۔

خیر پہلی شام خوبصورت تھی اے حمید اور میں ان کے ہی کمرے میں بیٹھ گئے اپنی اپنی ڈرنک لے لی باتیں تو پھر کوئی اے حمید کی سنے اب وہ برما کے جنگلوں سے شروع ہوئے اور ساگوان کے درختوں سے

انفرادی جستجو اور سوچ بچار

میرا تجربہ ہے کہ دوسرے پر پوری طرح اعتبار کر لیا جائے تو شاذونادر ہی مایوسی ہوتی ہے۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو اس اعزاز کے قابل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

کسی کام کو سپرد کرتے وقت میں ادائے فرض کی ساری ذمہ داری اس پر چھوڑ دیتا ہوں۔ کبھی یہ نہیں پوچھتا کہ کام کس طرح کرو گے اسے قابلیت یا بے سلیقگی سے سرانجام دینا اور تحسین وتحقیر کا مستحق ہونا خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ ہم سب کا طرزِ عمل جُدا جُدا ہے۔ دو آدمی ایک کام کو ایک طرح سے کبھی نہیں کرتے۔ ہر ایک نئے طریقے سے جانچتا ہے اور تکمیل کے لیے نیا راستہ نکالتا ہے۔ چنانچہ انفرادی جستجو اور سوچ و بچار بڑی اہمیت رکھتے ہیں اس طرح نئی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اور طرح طرح کے پہلو نکلتے ہیں۔ ایک دفعہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ ہر شخص میں خوبیاں پوشیدہ ہیں۔ اور ڈھونڈنے پر ایسے ایسے اوصاف ملتے ہیں۔ جن کا گمان تک نہیں ہوتا۔ تو انسان کی فہم وفراست میں اضافہ ہوگا زندگی کی افادیت بڑھ جائے گی اور دنیا بہترین بن جائیگی۔ محبت اندھی نہیں ہوتی۔ یہ آنکھ کی بے توجہی ہے۔ جسے دوسروں کی خوبیاں نظر نہیں آتیں۔ (چارلز۔ ایچ پرسی)

(مرسلہ: تسنیم انور سلیمی۔ رحیم یار خان)

ہوتے ہوئے صندل اور مہاگنی تک پہنچے ہی تھے کہ گھنٹی بج گئی بلاوا آیا کہ ڈنر نیچے لگ چکا ہے اور کم
کمروں پہ دستک کے بعد یہاں پر آپ دونوں پکڑے گئے ہو۔ڈنر پر آئے تو ہم زیادہ لیٹ بھی نہیں
تھے ڈنر میں چینی کوزین کے جلوے دیکھ کر آنے والے پندرہ دنوں کے مزے تالو سے لپٹ گئے الد
عبداللہ ملک نے آیندہ کا لائحہ عمل طے کردیا کہ کوئی کسی بھی جگہ ایک منٹ بھی لیٹ ہوا تو اسے پور
وفد کو فی کس دو ڈبے بیئر پلانے ہوں گے اور اگر پھر بھی کسی نے اسے آسان لیا تو اسے پاکستان واپس
بھجوا دیا جائے گا اور مجھے وفد کا مانیٹر بنا دیا۔اب میری تو اے حمید سے نہیں بن سکتی تھی۔ میں نے ا
حمید سے خود کو الگ کرلیا اور محسن احسان سے یاری کرلی محسن سے یہ یاری اس کے آخری سانس تک چ
کیا کمال کا انسان تھا امریکہ کے سفر میں اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں تو مارا جاتا یہ کہانی پھر سہی۔

اب یہ ہوا کہ اے حمید نے خود کو ہوٹل کے کمرے میں بند کرلیا ناشتے پر آتے مگر دن بھر کی مصروفیات
کے لئے بہانہ بنا لیتے کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے یہاں تک کہ جب دیوار چین دیکھنے کے لئے ہم نے ج
تھا تب بھی بہانہ بنا دیا میں نے کہا بھی کہ دیوار چین دنیا کا عجوبہ ہے اور آپ تو برما سیلون اور امریکہ
یاترا کر چکے ہیں یہ نوائے وقت کے سنڈے ایڈیشن کے لئے آپ کے لئے ایک تازہ رپوتاژ ہوگا۔ ک
لگے دیکھنا میں بغیر دیکھے جو لکھوں گا وہ تم دیکھ کر بھی نہیں لکھ سکتے میں نے کہا وہ تو میں مانتا ہوں مگر ا
تجربے سے آپ محروم رہ جاؤ گے۔ جواب دیا تجربہ مجھے کیسے ہوتا ہے یہ تم نہیں جان سکتے۔لو جی وہ نہیں
آئے اور پھر انہوں نے نوائے وقت میں دیوار چین پر جو لکھا وہ ایسے ہی تھا کہ برما کے جنگلوں سے سید
دیوار چین پر آ کر اُترے اور وہاں سے سری لنکا چلے گئے اب اگلے دن مجھے عبداللہ ملک نے طلب
اور ایک خط چینی ادیبوں کی انجمن کی طرف سے رکھ دیا۔ خط میں لکھا تھا کہ آپ کا ایک رکن اے حمید
تقریب اور ٹور میں شریک نہیں ہو رہا اس پر چینی حکومت کا روز کا اتنا خرچہ ہو رہا ہے اگر اسے شامل نہیں
ہونا تو اسے پاکستان واپس بھیج دیا جائے اب مجھے وہ بات سمجھ میں آئی جو اے حمید نے جہاز میں بیٹ
کہی تھی کہ اگر مجھے جہاز کا کرایہ دے دیا جاتا تو میں چین کیوں آتا۔ عبداللہ ملک نے کہا' جاؤ اسے
دکھا دو۔ میں نے دکھا دیا اے حمید نے کہا چینیوں سے کہو اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں نے یہ با
چینیوں کو بتائی انہوں نے پہلے دن ہدایت نامہ ہم سے سائن کرایا تھا۔ وہ سامنے رکھ دیا جس میں لکھا
اگر کوئی پاکستانی ممبر بیمار ہوگا تو وہ اپنے خرچ پر ہسپتال جائے گا اور فارغ ہوکر پاکستان واپس بھیج
جائے گا۔ اے حمید نے وہ پڑھا اور کہا نہیں میں بالکل بیمار نہیں ہوں تو عبداللہ ملک نے کہا پھر کمر
میں کیا انڈوں پر بیٹھے ہو۔ بس اس دن کے بعد اے حمید طوہاً و کرہاً ہر جگہ پہنچنے لگا۔ لیکن میری دوستی مح
احسان سے ہوگئی اے حمید کو میں ہر جگہ دوستی دیتا رہا چین کے ایک شہر میں محسن احسان نے زبردس
غلطی کی۔ مجھے بتایا نہیں کہ اسے وہسکی پینی ہے انہوں نے فریج میں رکھے منی ایچر کی چھوٹی شیشیوں
ایک شام میں فریج خالی کردیا۔ اگلے دن ان کو دو سو ڈالر کا بل دینا پڑا۔ میں نے محسن احسان کو جب

Pakistanipoint.com

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیش کش

بناتِ رسولؐ نمبر

پیارے رسولؐ کی پیاری بیٹیوں کی حیاتِ جاوداں

★ جنہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں اپنا بچپن گزارا

★ جنہیں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے سلیقہ منداور باشعور بنایا

★ جن کے لیے تقدیر بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ دشمنانِ اسلام کے گھر رہیں

★ شرم وحیا، عفت ومعصومیت، صبر وقناعت، عزم واستقلال اور سادگی وسنجیدگی سے منور پاک بیبیوں کے حالاتِ زندگی

ہر مسلم گھرانے کی ضرورت

سیارہ ڈائجسٹ 244 ریواز گارڈن لاہور فون: 042-37245412

کہ بھائی جان یہ حرکت بین الاقوامی ہوٹلوں میں نہیں کرتے جب بازار میں کھلے عام مشروبات ملتی ہوں تو شہزادہ چارلس نہیں بنتے۔ یہ بات محسن احسان کو سمجھ آ گئی اور اس کا فائدہ پندرہ سال بعد امریکہ کے دورے میں میرے ساتھ انہیں ہوا اور ہم باضابطہ طور پر جا کر بوتل خرید آتے تھے اور ہوٹل کے کمرے میں اپنی بار سجاتے تھے تو خیر اے حمید ہر جگہ موجود ہوتے لیکن ان کا دل نوائے وقت میں اٹکا ہوتا تھا جہاں ان کا ہفتہ وار سنڈے فیچر چھپتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے وفات سے ایک ماہ پہلے پوچھا کہ مارکیٹنگ کے اس زمانے میں مجید نظامی آپ کو کیا ادا کرتے ہیں تو بولے صرف تین سو روپے فی قسط میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میں نے لاکھ کہا کہ آپ یہ تعلق توڑ دیں وہ شخص آپ کی قبر کھود رہا ہے مگر اے حمید نہ مانا اور تین سو روپے پر لکھتا رہا۔ آخر کو یہ وقت بھی آیا کہ مجھے معلوم ہوا اے حمید بیمار ہو گیا ہے اے حمید نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ میرے حالات اچھے نہیں ہیں۔ میں اس وقت الحمرا آرٹس کونسل کے بورڈ آف گورنرز میں تھا اور عطاء الحق قاسمی صاحب چیئرمین تھے۔ عطاء الحق قاسمی سے بات ہوئی تو ہم دونوں ان کے گھر سمن آباد گئے کہ اپنے یار کو مل آئیں ہم داخل ہوئے تو پہلا جملہ تھا اصغر سیلون ٹی یا جیسمین ٹی' میں نے کہا سیلون ٹی آواز دی ریحانہ اصغر آیا ہے سیلون ٹی کے لئے پانی رکھ دو۔ ریحانہ ان کی بیگم ہیں خیر عطاء نے پانچ لاکھ کے لئے کہا میں نے کہا دس لاکھ ہونا چاہئے۔ عطاء نے کہا تم یہ تجویز بورڈ میں دینا' ظاہر ہے میں قبول کرلوں گا۔ ایسا ہی ہوا اور ہم نے اے حمید کو الحمرا بلایا کہ یہ مجبوری تھی ان کے ساتھ شام منانے کے بہانے ان کی مدد کرنے کی۔ وہ میری گاڑی میں آئے اور راستے میں بہت سی باتیں ہوئیں یہ فرض پورا ہوا اور پھر اے حمید خوش خوش گھر لوٹے اے حمید کے اکلوتے بیٹے نیشنل کالج آف آرٹس میں لیکچرر اور شادی شدہ ہیں انہوں نے باپ کی ذمہ داری نہ لی کوئی بات نہیں یہ ہمارا فرض تھا پورا ہوا اور پھر اچانک خبر آ گئی کہ اے حمید اب سری لنکا اور برما کے جنگلوں اور چائے کے باغوں کی باتیں کرنے کے لئے نہیں رہے۔ سخت گرمی کا دن تھا انتظار حسین اور حمید اختر کے ساتھ اور بھی دوست آئے عطاء قاسمی بھی آئے ہم دیر تک کھڑے رہے باتیں کرتے رہے کہ ایک اجنبی نے مجھ سے بات کی کہ تمہیں یاد ہوگا ہم سماوار کا ذکر کرتے تھے جو چائے بنانے کے لئے روایتی برتن ہے میں نے مڑ کر دیکھا کچھ جانا پہچانا چہرہ تھا میں بولا ارے یہ تو ارشاد غالب ہے اے حمید کا چھوٹا بھائی۔ جغرافیے کا پروفیسر شیخوپورہ کالج میں ہم دونوں زمانے بعد مل رہے تھے وہ بھی اے حمید کے جنازے پر۔ اب میں نے کہا کرشن مہاراج جی ماکھن چور تھے یا اے حمید ارشاد غالب ہنستے ہنستے رو دیا کہ دونوں تھے۔ ایک ماکھن چراتا تھا اور دوسرا دہی کے کونڈے سے ملائی چراتا تھا۔ میں نے کہا مگر مجھے تو سیلون ٹی کا چور چاہئے جو مجھے پہلے کہانی سنائے پھر سیلون ٹی پلائے۔ ارشاد غالب نے کہا یہ دونوں باتیں اب ممکن نہیں ہیں۔ میں دوسری جانب چل دیا کہانی کا سماوار آگ پر رکھا ہوا ہے۔

"خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں"

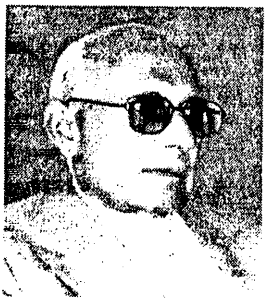

husain_sayyed2001@yahoo.com

قلندر حسین سیّد سیارہ ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل قلمکار ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے وہ ایسی بہترین تحریروں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد پسند کی جا رہی ہیں اور جن کے حصول کے لیے بے شمار کتب، جرائد اور انٹرنیٹ سے استفادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جناب سیّد نے قارئین سیارہ ڈائجسٹ کیلئے اپنے گہرے مطالعہ اور تحقیق کے نچوڑ کیساتھ ساتھ دنیائے ادب کی چنیدہ کتب و جرائد سے اخذ اقتباسات پر مشتمل انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، لیموں کی کھٹاس، گوڑ تما کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش ہے۔!!

حاصل مطالعہ

O ادب انسان کی بہترین میراث ہے۔ (حضرت علیؓ)

کب اشک بہانے سے کٹی ہے شب ہجراں
کب کوئی بلا صرف دعاؤں سے کٹی ہے
(نواب زادہ نصراللہ خان)

O تعلق برقرار رکھنا ہو تو اچھائی بیان کرتے رہو اور تعلق ختم کرنا ہو تو سچائی بیان کر دو۔

O ہم اتنے امن پسند ہیں کہ ہمارے سب سے بڑے اخبار کا نام جنگ ہے۔

O اتنے مصروف ہو گئے ہو تم کہ دل دکھانے بھی اب نہیں آتے۔

O اصل طاقت پیر کی کرامت میں نہیں مرید کی جہالت میں ہے۔ جب تک مرید جاہل ہے پیر کرشمے دکھاتا رہے گا۔

O خوشی قطرہ شبنم کی مانند پائیدار ہے کہ مسکراتے ہی فنا کی گھاٹیوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ (رابندر ناتھ ٹیگور)

O باپ کی لائف گزر جاتی ہے بیٹے کی لائف بنانے میں اور بیٹا لکھتا ہے .....(MY WIFE IS MY LIFE)

O ہمارے ہاں حکومتی سطح پر ایک ہی فصل کی کاشت کا

اہتمام ہوتا ہے اور وہ فصل ہے ہتھیلی پر سرسوں اُگانا۔

O دولت اور عہدے انسان کو عارضی طور پر بڑا کرتے ہیں لیکن انسانیت اور اچھا اخلاق انسان کو ہمیشہ بلند درجے پر رکھتا ہے۔

O ایک دیا دوسرے دیئے کو روشن کرسکتا ہے صرف اس صورت میں جب دوسرے دیئے میں تیل ہو۔

O زندگی میں صرف دو چیزیں ٹوٹنے کے لئے ہوتی ہیں سانس اور ساتھ سانس ٹوٹنے سے انسان ایک دفعہ مرتا ہے اور ساتھ ٹوٹنے سے بار بار۔

O طنزیہ لہجے' منافق دل' جھوٹے وعدے اور دلوں سے کھیلنے کا فن' اے ابن آدم! کیا تُو واقعی اشرف المخلوقات ہے؟؟

O دھوکے ایسے نہیں ملتے بھلا کرنا پڑتا ہے لوگوں کا۔ (جون ایلیا)

O بچوں میں سوچنے سمجھنے اور سوال کرنے کی جستجو اور خواہش پیدا کریں' رٹنے کی نہیں!

O افراد کے شعور کو اپاہج کرنا سرمایہ داری نظام کی سب سے بڑی لعنت ہے! ہمارا سارا تعلیمی نظام اس لعنت کا شکار ہے۔ طلباء میں بے تحاشہ مقابلہ بازی کی سوچ ڈالی جاتی ہے اور مستقبل کے کیریئر کی تیاری کے دوران پیسے اور دولت کی پوجا کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ (البرٹ آئن سٹائن)

O وہ کہنے لگے ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے باپ کے قدموں تلے کیا ہوتا ہے؟ تو میں نے کہا کہ باپ کے قدموں میں ایک پھٹا ہوا جوتا ہوتا ہے جو اولاد کی خاطر رزق حلال کمانے میں دربدر ہوتے گھس جاتا ہے۔ (مستنصر حسین تارڑ)

O

"معاشیات"

اکاؤنٹنٹ کی بیوی نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ یہ افراط زر کیا ہوتا ہے؟

اکاؤنٹنٹ پہلے تمہاری عمر 21 سال' کمر 28 انچ اور وزن 50 کلو تھا' اب تمہاری عمر 40 سال' کمر 38' اور وزن 70 کلو ہے۔

یعنی اب تمہارے پاس سب کچھ پہلے سے زیادہ ہے لیکن پھر بھی ویلیو کم ہے اور یہی افراط زر ہے۔

معاشیات اتنی مشکل نہیں اگر صحیح مثال دے کر سمجھایا جائے۔

O

"احمدی نژاد"

کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایران کے صدر احمدی نژاد 8 سال صدر رہنے کے بعد اپنے ذریعہ معاش کے لئے ایک سکول میں بطور ٹیچر ملازمت کررہے ہیں اور ان کا ذریعہ سفر عام بس سروس ہے۔

کیا ہمارے ملک میں کوئی ایسا سیاستدان ہے یا ہوگا جو کسی سکول میں بچوں کو پڑھائے .....نہیں نہیں کبھی نہیں.....!

O

"ان شاء اللہ"

ایک لفظ اکثر ہم غلط لکھا کرتے ہیں جس کو درست کرنا بہت ضروری ہے میں نے کسی بات کے جواب میں انشا اللہ لکھا تو ایک صاحب نے مجھے لکھا کہ لفظ انشا اللہ ٹھیک نہیں۔ پھر میں نے اپنے علم کے مطابق انہیں کہا کہ میں نے فلاں سورۃ میں ایسے ہی لکھا دیکھا ہے آپ غلط کیسے کہہ سکتے ہیں۔

خود سے تحقیق کی تو ثابت ہوا کہ وہ صحیح فرما رہے تھے.....!!

اگر انشاءاللہ جس طرح لکھا ہوا ہے مطلب دیکھا جائے تو اس کا مطلب بنتا ہے اللہ تخلیق کیا گیا "نعوذ باللہ....."

لفظ ان شاء اللہ (جس طرح لکھا گیا ہے) اس کا مطلب ہے کہ اگر اللہ نے چاہا۔

O

"ٹیوشن"

ایک بی اے کا لڑکا جب میرے پاس انگریزی کی ٹیوشن کے لئے آیا تو میں نے پوچھا کہ کوئی ہیلپنگ بک (HELPING BOOK) ہے آپ کے پاس؟ کہنے لگا جی سر! میں نے پوچھا کہ اس کے رائٹر کا کیا نام ہے؟ تو بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے زور دے کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ سر کوئی بشیر احمد مُحد صاحب ہیں یہ سن کر مجھے بھی شرمندگی ہوئی..... میں نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر دیکھا تو لکھا تھا:

BASHIR AHMED PH.D

O

"گفتار و کردار"

قائداعظمؒ کھانا بہت کم کھاتے تھے۔ مرض الموت میں جسمانی کمزوری بہت بڑھ گئی۔ زیارت میں قیام کے دنوں میں ڈاکٹر الٰہی بخش نے تشویش ظاہر کی کہ کم خوراکی کی وجہ سے ان کی حالت زیادہ تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ ان کی رائے تھی کہ شہر لاہور میں جو دو باورچی کپورتھلہ برادرز کے نام سے مشہور ہیں انہیں زیارت بھیجا جائے کیونکہ ان کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا قائداعظم کو مرغوب ہے۔ کپورتھلہ کے باورچی بھائیوں کی تلاش ہوئی وہ لاہور چھوڑ کر لائل پور چلے گئے تھے۔

لائل پور سے زیارت پہنچے' کھانا پکایا اس روز قائداعظم نے چند لقمے شوق سے کھائے' کھانے کے بعد اپنے پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین کو بلایا کھانے میں فرق کی وجہ دریافت کی' وجہ بتائی گئی۔ وہ ناخوش ہوئے۔ چیک بک منگوائی باورچیوں کے آنے جانے کے خرچ کا حساب کیا اور اس رقم کا چیک کاٹا' رقم سرکاری خزانے میں جمع کرائی۔ باورچی رخصت کئے اور کہا کہ یہ حکومت یا ریاست کا کام نہیں کہ وہ گورنر جنرل کو اس کی پسند کا کھانا (سرکاری خرچ پر) فراہم کرے۔

(سعید احمد راشد علیگ کی کتاب سے)

O

زخم جو دکھتے نہیں' دُکھتے بہت ہیں!!

O

LAUGHTER IS THE BEST MEDICINE BUT YOU LAUGH FOR NO REASON YOU NEED MEDICINE.

O

آج کل کے بچے کو سبزی پسند نہ آئے تو ماں کتنے آپشنز (OPTIONS) دیتی ہے..... مگی کھالو' بریڈ پر جیم لگا دیتی ہوں' پیزا منگوا دیتی ہوں اور ہماری ماں کے پاس دو ہی آپشنز ہوتے تھے..... سبزی کھانی ہے یا چھتر اور ہم دونوں ہی کھا لیتے تھے پہلے چھتر پھر سبزی۔

O

"چیک کی گارنٹی"

لین دین کے معاملات میں وہ چیک جس کی پچھلی سائیڈ پر گارنٹی چیک لکھا ہوا ہو باؤنس ہونے

کی صورت میں اس پر ایف آئی آر درج نہیں ہوسکتی لہٰذا لین دین کے موقع پر ایسا چیک لیا جائے جس کی اگلی اور پچھلی سائیڈ پر صرف چیک دینے والے کے دستخط موجود ہوں اور اس کے علاوہ مزید کوئی تحریر موجود نہ ہو۔ دریں اثناء اس چیک کے ساتھ ایک تحریری پرونوٹ بھی بنوالیا جائے تو آپ کا پیسہ قانونی طور پر مزید محفوظ ہوجاتا ہے۔

(از: جمیلہ ناز خاں ایڈووکیٹ۔ نوائے اوج سے ماخوذ)

O

''صرف چار ٹیسٹ''

زندگی رب لم یزل کی عظیم اور حسین ترین نعمت ہے جس میں عہد شباب یعنی جوانی کو اس لئے فوقیت حاصل ہے کہ زیادہ تر افراد اسی دور میں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں متعدد خاندان ایسے ہیں جو شادی سے قبل بظاہر صحت مند و توانا تھے لیکن بعدازاں جینیاتی مسائل کا شکار ہوگئے تو کسی کی اولاد تھیلی سیمیا اور دیگر امراض میں مبتلا ہوگئی۔ اس تناظر میں شادی کرنے والے جوڑوں کیلئے چند اہم احتیاطی تدابیر اور میڈیکل ٹیسٹ ناگزیر قرار دیئے جارہے ہیں۔ یہ چار ٹیسٹ جینیاتی 'موروثی جراثیمی اور بانجھ پن کے ہیں۔ ڈاکٹرز کے مطابق متذکرہ طبی معاملات کے معائنے سے مستقبل میں مختلف پریشانیوں سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ موروثی بیماریاں بسا اوقات شادی کے بعد سامنے آتی ہیں اور زندگی بھر ساتھ رہتی ہیں۔ بعض بیماریاں قابل علاج ہیں تاہم چند اولاد تک میں بھی منتقل ہوجاتی ہیں۔ شادی شدہ افراد کیلئے ایچ آئی وی' ہیپاٹائٹس اور ازدواجی تعلقات سے نمو پانے والی بیماریوں کے ٹیسٹ بھی ضروری ہیں جن کا بروقت علاج مسائل کو حل کرسکتا ہے۔ جینیاتی بیماریوں میں تھیلی سیمیا یعنی خون کی کمی کی بیماری سب سے زیادہ ہے جس کا ابھی تک کوئی موثر علاج دریافت نہیں ہوسکا اور پاکستان میں ہر سال 5 ہزار بچے اس کی وجہ سے لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ کزن میرج ہی نہیں بلکہ غیر کزن والدین میں بھی یہ جراثیم موجود ہوتا ہے۔ موروثی بیماریاں ہر انسان میں اپنی ہسٹری رکھتی ہیں خاندان میں کوئی ذہنی یا جسمانی معذوری ہو تو ٹیسٹ کروایا جانا چاہئے۔ بانجھ پن کا ٹیسٹ دنیا کے متعدد ملکوں میں رائج ہے جبکہ ہمارے ہاں مرد ایسا ٹیسٹ کروانا مردانگی کے خلاف خیال کرتا ہے۔ شعور کے باوجود ہمارے ہاں شادی سے قبل یہ ٹیسٹ نہیں کروائے جاتے جن کا کروایا جانا دنیا کے بیشتر ممالک میں لازم ہے۔ اس سلسلے میں عوام کو شعور دینے کی ہی نہیں موثر قانون سازی کی بھی ضرورت ہے تاکہ ہماری آئندہ نسلیں تندرست و توانا ہوں۔

(جنگ ڈاٹ کام 19 جنوری 20ء سے اقتباس)

O

'اپنی زبان''

وائسرائے ہند مولانا ابو الکلام آزاد سے ملنے ان کی رہائش گاہ آتا ہے مولانا آزاد کے ساتھ ترجمان بیٹھا ہوتا ہے۔

وائسرائے جو بات کرتا ہے ترجمان اس کا ترجمہ کرکے مولانا آزاد کی ہر بات کا ترجمہ انگریزی میں کرکے وائسرائے کو بتاتا ہے۔ پھر یوں ہوا کہ ترجمان کچھ ان کی کہی بات کا ترجمہ درست نہ

سیّارہ ڈائجسٹ کے عظیم الشان اسلامی نمبرز

240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون نمبر: 042-37245412 پوسٹ کوڈ نمبر۔ 54000
Email:sayyaradigest@gmail.com

طبِ نبویؐ نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
جسمانی اور روحانی امراض کا نبویؐ طریق علاج

قرآنی وظائف نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
ہر گھر کی پریشانیوں اور الجھنوں کے حل کیلئے وظائف۔

اسلامی معلومات نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
دین کی جامع معلومات، طالب علموں کیلئے خصوصی تحفہ!

انبیاء کرامؑ نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
پیغمبرانِ خدا کی حیات کے روح پرور تذکرے

فرمانِ الٰہی نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
اللہ کے احکامات و قرآنی فرمودات پر مشتمل ایمان افروز پیشکش!

صحابہ کرامؓ نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
عظیم ہستیوں کی کہانی جنہوں نے حضورؐ کی معیت میں زندگی بسر کی

صدقاتِ خیرات نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
صدقہ ہر بلا ٹال دیتا ہے اسکی اہمیت و حقیقتوں بارے مکمل معلومات!

اخلاقِ رسولؐ نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
حضورؐ کی پاکیزہ زندگی کے پاکیزہ واقعات مشتمل دستاویز

جادو، خواتین اور اسلام
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
جادو کی حقیقت اور علاج قرآن و احادیث کی روشنی میں!

فہم دین نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
سماجی زندگی اور عبادات کے بنیادی مسائل کا حل

عباداتِ رمضان نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
رمضان کی عبادات جو بزرگیدہ ہستیوں کا معمول تھیں!

ازواجِ مطہراتؓ نمبر
1 جلد۔ قیمت =/250 روپے
امہات المومنین کی پاک زندگی کے واقعات

قرآن نمبر
3 جلد۔ قیمت =/600 روپے
ایمان افروز عقل پرور اور عمل آفرین پیشکش

اولیاء کرام نمبر
4 جلد۔ قیمت =/800 روپے
اللہ کے برگزیدہ بندوں کی ایمان افروز داستانیں

رسولؐ نمبر
(دو جلدوں میں۔ قیمت: 400 روپے)
سیرت پاک پر ایک جامع دستاویز

حقوق العباد نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
دوسرے انسانوں کے حقوق اور فرائض بارے نادر و نایاب معلومات

دعا نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
دعا تقدیر بدل دیتی ہے۔ حدیث رسولؐ!

حج، عمرہ اور زیارات نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
حج اور عمرہ کی سعادت حاصل کرنیوالوں کیلئے رہنما گائیڈ

عکسِ سیرت نمبر
1 جلد۔ قیمت =/350 روپے
حضرت محمد مصطفیٰؐ کی حیات طیبہ پر مبنی نایاب کتاب!

توبہ نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کے آداب اور اسکی اہمیت

خلفائے راشدینؓ نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
خلفائے راشدینؓ کی بے مثال قربانیوں کا ذکر!

صحابیاتؓ نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
محترم خواتین جنھیں آنحضورؐ سے سیکھنے کا شرف حاصل ہوا

فرمانِ رسولؐ نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
عاشقانِ رسولؐ کی خدمت میں ایک بے مثال تحفہ!

اسلامی حکایات نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
قوت ایمانی سے سرشار سبق آموز تحیر خیز حکایات کا مجموعہ

معجزاتِ رسولؐ نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
سرورِ کونینؐ کے سینکڑوں معجزات پر مشتمل دستاویز!

والدین نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
ماں باپ کی تعظیم و فرمانبرداری اُجاگر کرنے کی منفرد کاوش

نقوشِ اسلام
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
اسلام کی روشن تاریخ سے ایمان افروز واقعات!

آثارِ قیامت نمبر
جلد۔ قیمت =/200 روپے
آیاتِ قرآنی و احادیث کی روشنی میں قیامت کی نشانیوں بارے معلومات

قصص القرآن نمبر
1 جلد۔ قیمت =/200 روپے
واقعات جو اللہ تعالیٰ نے بتانا ضروری سمجھے۔

شرعی احکام نمبر
جلد۔ قیمت =/200 روپے
مومن زندگی کیسے گزارے شرعی تعلیمات پر مشتمل جامع رہنمائی

کرسکا تو مولانا آزاد نے اس کی غلطی درست کرکے کہا کہ یوں کہو۔

ملاقات کے اختتام پر وائسرائے نے مولانا آزاد سے کہا کہ جب آپ کو انگریزی آتی ہے تو پھر ساتھ ترجمان کیوں بٹھایا؟

مولانا آزاد نے کہا:

''آپ پانچ سو میل چل کر اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتے ہیں' میں گھر بیٹھے ہوئے اپنی زبان چھوڑ دوں۔

O

''جرم''

فرعون کا جرم کیا تھا؟ قارون کا جرم کیا تھا؟ سامری کا جرم کیا تھا؟ ہامان کا جرم کیا تھا؟' سب لوٹ کھسوٹ والے تھے۔

O

''محبت''

ابن حبان نے اسے محبت کے زہر سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر طرح کے علم کی لذت سے آشنا کردیا تھا اور علم کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں شہزادے کو کسی طرح کی کشش محسوس ہوتی۔ اس موقع پر ابن حبان کو ایک بات یاد آئی اپنے مصر کے قیام میں اس نے ایک یہودی سے پرندوں کی زبان سیکھی تھی اس یہودی تک یہ علم حضرت سلیمانؑ سے منتقل ہوکر آیا تھا اور حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا سے حاصل کیا تھا۔ ابن حبان نے جب احمد سے نئے علم کا ذکر کیا تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس نے اس انہماک سے اس نئے علم کی طرف توجہ کی کہ بہت جلد اس میں اپنے استاد کی سی مہارت پیدا کرلی۔

جنت الصریف کا برج اب اس کے لئے تنہائی کی قید نہیں رہا تھا۔ برج کے آس پاس اب اس کے بے شمار شناسا تھے جن سے باتیں کرکے وہ اپنا جی بہلا سکتا تھا۔ اس کا پہلا شناسا ایک باز تھا جس نے قصر کی فصیل پر ایک بہت اونچی جگہ اپنا آشیانہ بنایا تھا۔ شہزادے کو اس کی ملاقات میں ذرا بھی لطف نہ آیا اس کی باتوں میں قزاقی کی بو آتی تھی وہ لوٹ مار اور دور جھپٹ کے علاوہ کوئی بات نہ جانتا تھا اس کی شیخی خوری سے شہزادے کو نفرت سی ہوگئی۔

اس کی دوسری ملاقات ایک الو سے ہوئی جس کے بڑے سر اور گول گول آنکھوں سے دانشمندی ہویدا تھی۔ وہ دن بھر دیوار کے ایک روزن میں بیٹھا کن انکھیوں سے ادھر ادھر دیکھتا اور آنکھیں جھپکاتا اور رات کے وقت سیر وگشت کے لئے گھر سے نکلتا اسے اپنی دانائی کے متعلق خاصی غلط فہمی تھی۔ وہ نجوم کے علم اور چاند کی باتیں کرتا اور اشاروں اشاروں میں طلسم وسحر کا ذکر چھیڑتا۔ وہ عموماً بعد الطبیعیاتی مسائل میں غرق نظر آتا اور احمد کو اس کے خیالات اور تصورات ابن حبان کی فلسفیانہ تقریروں سے زیادہ خشک اور بے مزہ معلوم ہوتے۔ اس کا اگلا شناسا ایک چمگادڑ تھا جو سارا دن گنبد کے ایک تاریک گوشے میں الٹا لٹکا رہتا اور شام ہوتے ہی چپکے سے باہر نکل جاتا۔ ہر موضوع پر اس کے خیالات شفق کی روشنی کی طرح سرسری اور عارضی تھے۔ چیزوں سے مکمل واقفیت حاصل کئے بغیر ان کا مذاق اڑانا اس کا شیوہ تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اسے زندگی کی کسی چیز یا کسی بات میں لطف نہیں آتا۔

اس کے علاوہ ایک ابابیل تھی جس نے شروع شروع شہزادے کو اپنی طرف بے حد متوجہ کیا اس کا انداز گفتگو بڑا دلکش تھا لیکن ایک طرح کی بے چینی'

بے قراری اس کی سرشت تھی۔ وہ برابر ہوا میں اُڑتی رہتی اور کسی موضوع پر تھوڑی دیر بھی جم کر باتیں نہ کرتی۔ رفتہ رفتہ شہزادے کو اندازہ ہوگیا کہ وہ محض باتونی ہے چیزوں کی اوپری سطح پر نظر رکھنا اور کسی چیز کا علم نہ رکھنے پر بھی عالم ہونے کا دعویٰ کرنا اس کی عادت ہے۔

ان چار پرندوں سے باتیں کرکے شہزادے کو اپنے سیکھے ہوئے علم کو آزمانے کا موقع ملا۔ دوسری چڑیاں گنبد کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتی تھیں شہزادہ بہت جلد ان نئے ساتھیوں سے اُکتا گیا۔ ان کی باتیں نہ ذہن میں گھر کرسکتی تھیں نہ دل میں اور اس لئے بہت جلد اس نے اپنی تنہائی میں پناہ لی۔ سردیاں گزر گئیں اور بہار تازگی اور شگفتگی اور فرحت و انبساط کا پیغام لے کر آئی۔ چڑیوں کے چہچہانے اور گھونسلے بنانے کے دن آگئے اور جنت العریف کے گلشنوں اور کنجوں سے جیسے نغموں کا ایک سیلاب ابل پڑا اور اس کی لہریں برج کی بلندیوں میں شہزادے تک پہنچنے لگیں۔ ہر نغمے کا موضوع ایک تھا' ہر زبان محبت کا پیغام سنا رہی تھی اور ہر طرف سے اس پیغام کے دل کشا جواب دیئے جارہے تھے۔ ہر لے میں' ہر تان میں بس محبت کی صدا گونج رہی تھی۔ شہزادہ سکوت اور الجھن میں اس شیریں پیغام میں ڈوبے ہوئے نغمے سنتا اور دل میں سوچتا محبت ! محبت! یہ آخر کیا چیز ہے جس سے آخر ساری دنیا معمور نظر آتی ہے اور میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا؟ اس نے اپنے دوست باز کے سامنے اپنی مشکل پیش کی تو اس بددماغ نے حقارت سے جواب دیا اپنی مشکل زمین کی حقیر اور امن پسند چڑیوں سے بیان کرو' جنہیں قدرت نے ہمارے لئے کہ ہم فضا کے بادشاہ اور شہنشاہ ہیں شکار بنایا ہے۔ ہمارا مشغلہ جنگ ہے ہمیں صرف جنگ سے دلچسپی ہے۔ ہم سپاہی ہیں اور ہمیں نہیں معلوم کہ محبت کیا بلا ہے۔ شہزادہ اس کی باتوں سے متنفر ہوا اور الو کے مراقبے میں مخل ہوا کہ یہ امن پسند طائر شاید میری اُلجھن دُور کرسکے۔ اس نے الو سے پوچھا ''دانا دوست کیا تم بتا سکتے ہو کہ محبت کیا چیز ہے جس کے گیت آج کل ہر کنج میں گائے جارہے ہیں؟'' الو نے اس قدر خفگی سے شہزادے کی طرف دیکھا کہ جیسے اس کے وقار کو اس سوال سے صدمہ پہنچا ہو اور بولا ''میری راتیں مطالعے اور تحقیق میں بسر ہوتی ہیں اور دن کا وقت میں اپنے حجرے میں سیکھی ہوئی باتوں پر غور وفکر میں گزارتا ہوں۔ رہی یہ چڑیاں کہ جن کے گیتوں کا تم ذکر کرتے ہو' تو میں کبھی ان کی طرف دھیان نہیں دیتا مجھے ان سے اور ان کی باتوں سے نفرت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے گانا نہیں آتا میں فلسفی ہوں اور جس چیز کو تم محبت کہتے ہو اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔''

شہزادے نے اب برج کے اس گوشے کا رُخ کیا جہاں اس کا دوست چمگادڑ اُلٹا لٹکا ہوا تھا اور اس کے سامنے بھی اپنا سوال دہرایا۔ چمگادڑ نے اپنی ناک سکیڑ لی اور جھلا کر جواب دیا ''ایسے حماقت آمیز سوال کرکے تم میرے آرام میں کیوں خلل ڈالتے ہو؟ میں صرف رات کو گھر سے باہر نکلتا ہوں جب سب چڑیاں سو چکی ہوتی ہیں مجھے ان کے کاروبار سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ میں نہ چڑیا ہوں نہ چوپایہ اور خدا شکر ہے کہ ایسا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ سب شر پسند ہیں اور میں ان میں سے ایک ایک سے نفرت کرتا ہوں۔ مختصر یہ کہ میں آدم بیزار ہوں اور

مجھے بالکل یہ نہیں معلوم کہ محبت کسے کہتے ہیں۔"

لاچار ہوکر شہزادے نے ابابیل کی جستجو کی اور وہ جلد ہی اسے برج کی چوٹی میں چکر لگاتی ہوئی مل گئی۔ حسب معمول اس وقت بھی ابابیل سخت جلدی میں تھی اور اسے شہزادے کی بات کا جواب دینے کی فرصت نہ تھی۔ اس نے تیزی سے شہزادے کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "خدا کے لئے میرے مشاغل اتنے زیادہ ہیں اور میرے سر پر اتنی ذمہ داریاں ہیں کہ مجھے کبھی اس موضوع پر سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مجھے ہر روز ہزار جگہ جانا ہوتا ہے ہزار طرح کے اہم معاملات پر توجہ دینی ہوتی ہے بھلا مجھے اتنی فرصت کہاں کہ ایسے ہلکے پھلکے موضوعات پر غور کرسکوں۔ مختصر یہ کہ میں دنیا کا شہری ہوں میرے دل میں سارے جہاں کا درد ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ جسے تم محبت کہتے ہو وہ کیا چیز ہے۔" یہ تقریر کی اور وادی میں غوطہ لگا کر ابابیل بات کی بات میں آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

شہزادے کی مایوسی اور اُلجھن اور بڑھ گئی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے دل کا درد کس سے کہے ابھی وہ انہی خیال میں متفرق تھا کہ اس کا دانا اتالیق اس برج میں داخل ہوا۔ شہزادہ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف دوڑا۔ "میرے اچھے ابن حبان تم نے دنیاوی علم کے سب دروازے مجھ پر کھولے ہیں لیکن ایک دروازہ اب تک بند ہے۔ میرا دل اس ایوان میں داخل ہونے کے لئے بے تاب ہے۔"

ابن حبان نے عاجزی سے جواب دیا "اچھے شہزادے آپ کے دل میں جو سوال پیدا ہوا ہے پوچھئے' آپ کے خادم کا علم محدود ہے لیکن وہ اپنی بساط بھر آپ کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کرے گا۔"

"تو پھر داناؤں کے دانا! براہ کرم بتایئے کہ جسے دنیا محبت کہتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔؟"

ابن حبان پر جیسے بجلی گر پڑی وہ کانپ گیا اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے جسم کی جان نکال لی ہے۔ اس نے شہزادے کو مخاطب کرکے پوچھا "شہزادے کے دل میں یہ سوال کیسے پیدا ہوا؟ آپ نے یہ ناکارہ لفظ کس سے سنا؟"

شہزادہ ابن حبان کو دریچے کے قریب لے گیا اور اس سے کہا "یہاں کھڑے ہوکر سنو!" ابن حبان خاموشی سے سنتا رہا۔ برج کے نیچے بلبل گلاب کی ایک جھاڑی پر بیٹھی ایک سرخ گلاب کے سامنے محبت کا نغمہ گا رہی تھی۔ پھولوں سے لدی ہوئی شاخوں اور سرسبز کنجوں میں بس ایک لفظ گونج رہا تھا محبت' محبت' محبت۔ فضا صرف اسی لفظ کی شیرینی سے معمور تھی۔

دانا ابن حبان نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "اللہ اکبر' بھلا کس کی مجال ہے کہ انسان سے اس راز کو پوشیدہ رکھ سکے جب ہر طائر افشائے راز پر آمادہ ہے۔ اس کے بعد پُر زور لہجے میں احمد سے بولا "ان گمراہ کن نغموں کی طرف دھیان نہ دو اس خطرناک علم پر اپنے ذہن کے دروازے بند کرلو۔ یاد رکھو کہ انسانی دنیا کے آدھے غموں کا سبب یہی بدنصیب محبت ہے۔ یہی ہے جو بھائیوں اور دوستوں کے دلوں میں تفرقہ ڈالتی ہے۔ قتل و غارت اور جنگ و جدل کی پرورش اسی کی آغوش میں ہوتی ہے۔ فکر و غم کی تاریکیاں' دلوں کی پریشانیاں اور راتوں کی بے خوابیاں اس کی کنیزیں ہیں۔ محبت کی آگ' شباب

کی شگفتگی اور مسرت کو جلس دیتی ہے اور جوانی کے سر پر بڑھاپے کے دکھوں کا سایہ منڈلانے لگتا ہے۔ اس لئے اے میرے معصوم شہزادے اللہ تجھے اس علم سے بیگانہ رکھے جس کا نام محبت ہے۔"

(از: قصص الحمرا۔ مصنف واشنگٹن ارونگ۔ مترجم سید وقار عظیم)

O

"خطرات"

ملاں نصیرالدین ہوا کرتے تھے۔ ایک دن گدھے پر اُلٹے سوار ہوگئے۔ کسی نے پوچھا! ملاں آپ گدھے پر اُلٹے کیوں سوار ہوئے ہیں؟ ملاں جی نے جواب دیا کہ پیچھے سے آنے والے خطرات دیکھنے کے لئے۔

اس شخص نے پوچھا تو سامنے سے آنے والے خطرات کا کیسے پتہ چلے گا؟

ملاں نے جواب دیا کہ انہیں گدھا دیکھ رہا ہے!

O

"فالج' معذوری اور اموات کی شرح میں مسلسل اضافہ

پاکستان دنیا کا چھٹا سب سے زیادہ آبادی والا ملک ہے جو تقریباً 22 کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہمارے ملک میں فالج سمیت غیر متعدی امراض کی شرح تقریباً 40 فیصد سے زائد ہے جب کہ آبادی کا تقریباً 5 فیصد حصہ فالج کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہے اس اعتبار سے لگ بھگ 10 لاکھ افراد کسی نہ کسی حوالے سے معذوری کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ دور حاضر میں جہاں طب کے شعبے نے ہر حوالے سے ترقی کی وہیں فالج کے علاج کے ضمن میں بھی خاصی جدت آئی ہے کچھ عرصہ قبل تک فالج کو ایک لاعلاج مرض سمجھا جاتا تھا مگر اب مختلف تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہوچکا ہے کہ یہ قابل علاج مرض ہی نہیں بلکہ اس کے حملے سے بچاؤ بھی ممکن ہے۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ موجود ہے کہ عوام کی بڑی تعداد تاحال فالج کے بروقت موثر معیاری اور سستے علاج سے محروم ہے جس کے سبب پاکستان میں ایک محتاط اندازے کے مطابق سالانہ چار لاکھ سے زائد افراد انتقال کر جاتے ہیں نیز لاکھوں افراد مستقل معذوری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

فالج ایسا مرض ہے جو جسم کے کسی بھی حصے کو مفلوج کرسکتا ہے جبکہ بعض کیسز میں اس کا حملہ جان لیوا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس کی علامات میں جسم کے کسی ایک حصے کا سن ہوجانا' قوت گویائی سے محرومی یا باتوں کو سمجھ نہ پانا' کھانے پینے میں دشواری' چلنے پھرنے سے معذوری' نظر نہ آنا یا دھندلاہٹ وغیرہ شامل ہیں۔ فالج کے حملے کے بعد مریض فوری علاج کے طلب گار ہوتے ہیں کیونکہ متاثرہ فرد کو جس قدر جلد ہسپتال یا اسٹروک یونٹ میں طبی نگہداشت مل جائے بحالی کے امکانات اتنے ہی بڑھ جاتے ہیں مگر بدقسمتی سے ہمارے یہاں زیادہ تر مریضوں کو بروقت معیاری علاج دستیاب نہیں ہوتا۔ پاکستان بھر کے بڑے ہسپتالوں کی جانب سے کی جانے والی مختلف تحقیقات کے مطابق صرف فالج سے ہونے والی اموات کی شرح میں کمی لانی ہے تو اس کے لئے سب سے ضروری تمام ٹیچنگ ہسپتالوں کے شعبہ نیورولوجی میں اسٹروک (فالج) سینٹرز کا قیام ہے۔ موجودہ صورتحال میں ان سینٹرز کی بہت کمی نظر آتی ہے کیونکہ اگر بڑے ہسپتالوں میں اسٹروک سینٹر علاج

کی سہولتیں فراہم کررہے ہوں تو کئی قیمتی جانیں ضائع ہونے یا زندگی بھر کی معذوری سے بچائی جاسکتی ہیں۔ یہ مرض قومی معیشت پر بھی خاصا اثرانداز ہوتا ہے کیونکہ مرض کے علاج' ہسپتال میں قیام اور ادویہ وغیرہ پر بھاری لاگت آتی ہے اس حوالے سے بین الاقوامی اعداد و شمار مدنظر رکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مرض کے بروقت و مناسب علاج سے نہ صرف جانیں محفوظ ہوجاتی ہیں بلکہ مستقل معذوری سے بچاؤ اور دیکھ بھال کے اضافی اخراجات کی بچت بھی ممکن ہے اور اس طرح معاشی بوجھ میں خاصی کمی واقع ہوتی ہے۔ عوام کو صحت کی معیاری اور جدید سہولتیں فراہم کرنا حکومت کے اولین فرائض میں شامل ہے لہٰذا سرکاری طور پر فالج کے علاج معالجے کے ضمن میں ایسے اقدامات ناگزیر ہیں جن کی بدولت مرض سے بچاؤ اور بروقت علاج ممکن ہوسکے۔ مثلاً:

خطرہ بننے والے عوامل پر پابندی: یہ درست ہے کہ فالج کا حملہ اچانک ہوتا ہے مگر اس بات کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ اس کے بیرونی عوامل برسوں ازمانی جسم میں خطرات کی صورت موجود رہتے ہیں اور کسی بھی وقت خون کی نالیوں میں خون جمنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ ان عوامل میں سگریٹ نوشی سے لے کر حقے' سگار' شیشے' گٹکے' نسوار اور پان وغیرہ کی علتیں شامل ہیں۔ فالج اور اسکے نتیجے میں موت یا معذوری کی روک تھام کے بجائے فالج کے عوامل کے ضمن میں محتاط طرز عمل زیادہ بہتر ہے لہٰذا ان علتوں سے اجتناب برت کر مرض کے حملے کے امکانات کم سے کم کئے جاسکتے ہیں۔ ہمارے یہاں عوامی سطح پر ان کے مضر صحت اثرات سے آگاہی کے باوجود ان کا استعمال عام ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں قانون سازی بھی کی گئی لیکن عملدرآمد نہیں ہوتا لہٰذا حکومت کو چاہئے کہ وہ قانون پر عمل درآمد یقینی بنائے۔

تھرامبولائسز کی فراہمی: تھرامبولائسز یعنی کلاٹ بسٹنگ ادویہ کے ذریعے علاج کیا جائے تو جمے ہوئے خون کی روانی بحال ہوجاتی ہے۔ یادرہے کہ خون جمنے کے نتیجے میں اگر دماغ تک خون کی فراہمی معطل ہوجائے تو فالج ہوجاتا ہے تھرامبولائسز میں ٹشو پلازمینوجین ایکٹی ویٹر ہوتا ہے اگر فالج کی علامات ظاہر ہونے کے تین سے ساڑھے چار گھنٹے کے اندر اندر مریض کو یہ علاج فراہم کردیا جائے تو بحالی کے امکانات کئی گنا بڑھ جاتے ہیں بدقسمتی سے اس وقت پاکستان میں یہ علاج تمام تر کوششوں کے باوجود رجسٹرڈ ہی نہیں ہے جب کہ دنیا بھر میں یہی فالج کا مروجہ علاج ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ اس دوا کو رجسٹر کرنے کے لئے فوری ٹھوس اقدامات کرے۔

ایمرجنسی ریسپانس کی سہولت: فالج کے شدید حملے میں ہر ایک منٹ میں دماغ کے دو ملین خلیات مر جاتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 10 فیصد سے بھی کم مریض فالج کے دو گھنٹے کے اندر ہسپتال لائے جاتے ہیں لہٰذا زیادہ سے زیادہ مریضوں کو فالج کے حملے کے بعد جلد از جلد ہسپتال پہنچانے کے لئے ضروری آلات سے لیس ایمبولینس سروسز بمعہ تربیت یافتہ سٹاف' ٹیلی میڈیسن کی سہولت' فالج ریسپانس سروسز اور ہسپتالوں کے ہنگامی شعبہ جات میں فوری علاج کی فراہمی یقینی بنائی جائے نیز ٹیلی میڈیسن کے شعبے پر خصوصی توجہ دے

کراس کا فائدہ اٹھایا جائے تاکہ فالج کے شدید حملے کے پیش نظر ہسپتال پہنچنے تک مضر اثرات کم سے کم کئے جاسکیں۔

کنسلٹنٹ اسٹروک فزیشنز: اس وقت ملک بھر میں تربیت یافتہ اسٹروک سپیشلسٹ کی تعداد انتہائی کم ہے اور وہ بھی صرف دو تین شہروں کے نجی ہسپتالوں سے وابستہ ہیں۔ جب کہ ملک بھر میں 22 کروڑ کی آبادی کے لئے موجود ماہرین دماغ و اعصاب (نیورولوجسٹس) کی تعداد 200 کے لگ بھگ ہے ماہر ڈاکٹرز کی اس کمی سے بہرحال فالج کے علاج میں دقت ضرور پیش آرہی ہے ایک محتاط اندازے کے مطابق فالج کے کم از کم 35 فیصد مریض جب کہ TRANSIENT ISCHEMIC ATTACK کے 50 فیصد سے زائد مریض بروقت تشخیص سے محروم رہ جاتے ہیں جس کے نتیجے میں طبی پیچیدگیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس تناظر میں پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کاؤنسل پبلک سیکٹر میں شعبہ نیورولوجی کی پوسٹ گریجوایٹ ڈگری رکھنے والے نیورولوجسٹس کو کم از کم ایک سالہ اسٹروک فیلوشپ کروانے کے لئے اقدامات کرے۔ فی الوقت صرف آغا خان ہسپتال میں یہ فیلوشپ کروائی جارہی ہے جب کہ آنے والے برسوں میں مزید ایک دو نجی ہسپتالوں میں اس کے آغاز کا امکان ہے۔ نیز اس طرح کی فیلوشپ کو یونیورسٹی ڈگری سے بھی منسلک کیا جائے اور ان انٹرنل میڈیسن فزیشنز کو بھی جو فالج کے علاج میں دلچسپی رکھتے ہیں اس پروگرام میں شامل کیا جائے۔ حکومت تمام ٹیچنگ ہسپتالوں میں کنسلٹنٹ اسٹروک فزیشنز کی اسامیاں پیدا کرے تاکہ مریضوں کو بہتر تشخیص و علاج معالجہ میسر آئے۔

(ڈاکٹر عبدالمالک کا کالم جنگ ڈاٹ کام سے)

O

جب حکمران، سیاستدانوں اور ذخیرہ اندوزوں کے مفادات ایک ہوں تو ملک میں مہنگائی کیوں نہ ہو۔

O

''کلام اقبال''

ہم کون ہیں کیا ہیں بخدا یاد نہیں
اپنے اسلاف کی کوئی بھی ادا یاد نہیں
ہاں اگر ہے یاد تو کافر کے ترانے ہیں بس
ہے نہیں یاد تو مسجد کی سدا یاد نہیں
بنت حوا کو نچاتے ہیں سر محفل میں ہم
کتنے سنگ دل ہیں ہم کہ رسم حیا یاد نہیں
آج اپنی ذلت کا سبب یہی ہے شاید
سب کچھ ہے یاد مگر صرف اللہ یاد نہیں

O

''مشغلہ''

پڑوسی کے بچوں کی بھوک اور فاقے سے انجان رہنا.....مگر

اس کی بیوی اور بیٹی کی حرکتوں سے واقف رہنا.....

ہمارے معاشرے کا بہترین مشغلہ ہے۔

(انور مقصود)

O

''فتوے یا تاریخی غلطیاں''

1440ء میں جرمنی میں پرنٹنگ پریس (چھاپہ خانہ) ایجاد ہوتا ہے تو پورے یورپ میں آگ کی طرح پھیلتا ہے اور ادھر سلطنت عثمانیہ کے شیخ الاسلام

فتویٰ دیتے ہیں کہ ہماری مقدس کتابیں مشینوں پر نہیں لکھی جائیں گی۔ 1550ء میں انگریزوں نے انڈیا میں پرنٹنگ پریس لگایا تو ہند کے علماء نے شیخ الاسلام کے فتویٰ کی توثیق کردی اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اس سے ہمارے کاتبوں کی روزی روٹی چھن جائے گی۔ ایجاد کے تقریباً 250 سال بعد مسلمانوں نے اس انقلابی ایجاد سے مستفید ہونے کی شروعات کی۔

1665ء میں پہلے انسانی بلڈ ٹرانسفیوژن کا کامیاب تجربہ کیا جاتا ہے۔ ادھر پھر مذہب کے ٹھیکیداروں نے فتویٰ دیا کہ انسان کا خون دوسرے انسان پر حرام ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمان ڈاکٹر اس فیلڈ میں سو سال پیچھے رہے۔

بیسوی صدی کے آغاز میں رائٹ برادران نے امریکہ میں ہوائی پرواز کا کامیاب تجربہ کیا۔ ادھر ہمارے ملاؤں نے فتویٰ دیا کہ جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ لوہا بھی ہوا میں اُڑ سکتا ہے اس کا ایمان چلا گیا۔ ساری دنیا اس نئی ایجاد کو دیکھ رہی تھی اور انجوائے کررہی تھی اور ہم مسلمان کنفیوژڈ گھوم رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ لوہا بھی ہوا میں اُڑ رہا ہے اگر اس پر یقین کریں تو ایمان چلا جائے گا۔

سرسید احمد خان نے انگریزی تعلیم پر زور دیا اور اُن کو کافر کہا گیا۔ علامہ اقبالؒ نے شکوہ لکھ دیا اُن پر بھی کفر کا لیبل لگ گیا۔ وہ ذہین تھے انہوں نے جلدی سے جواب شکوہ لکھ دیا تو ان پر سے وہ لیبل اُتار دیا گیا۔ اور اس طرح کے ہزاروں فتوے ہیں۔

O

"احساس کمتری"

پاکستانی برطانیہ جائے تو انگریزی سیکھے' روس جائے تو روسی زبان سیکھے' پاکستانی فرانس جائے تو فرانسیسی زبان سیکھے' پاکستان میں کورین انجینئرز موٹروے بنائیں تو پاکستانی کورین زبان سیکھیں۔ ہمارے ملک میں چائنہ والے سی پیک بنانے آئیں تو پاکستانی چینی زبان سیکھیں۔ کیا دنیا بھر میں کوئی اور قوم بھی اس قدر احساس کمتری' ذلت اور پستی میں مبتلا ہے؟ ہمیں سوچنا ہوگا۔

O

پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں ہر دس بارہ کلومیٹر پر ایک مشکل کشاء بابا یا ایک دربار اور چندے کا گلہ ضرور ملے گا لیکن اس کے باوجود ہماری مشکلیں کم ہوتی ہیں اور نہ غربت.....

O

"ایام رفتہ"

ایئر کموڈور (ر) انعام الحق کی کتاب سے اقتباس

مشرقی پاکستان میں بدامنی اور بے چینی پھیلانے میں جہاں ہمارے دشمنوں کا ہاتھ تھا وہاں ہماری اپنی اعمال کی خرابی کا بھی پورا دخل تھا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی وفات کے بعد قوم کو اچھی قیادت نہ ملی۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کو شہید کردیا گیا۔ اسلامی دستور بڑی مشکل سے بنا مگر غلام محمد صاحب نے قانون ساز اسمبلی کو معطل کردیا۔ فرقہ واریت پھیلی' مارشل لاء کا نفاذ ہوگیا۔ بقول مولانا مودودی کے ہر جگہ ترکی میں' مصر میں' پاکستان میں مسلمان فوجیں اپنے ہی ملک کو فتح کرکے حکومت پر قابض ہوگئیں۔ فوجی حکومت ہی زبردستی امن قائم کرسکتی ہے اور چونکہ فوجی سربراہوں کی تربیت مغربی ممالک میں ہوتی تھی اس لئے وہ جدیدیت کے علمبردار تھے اور اسلام

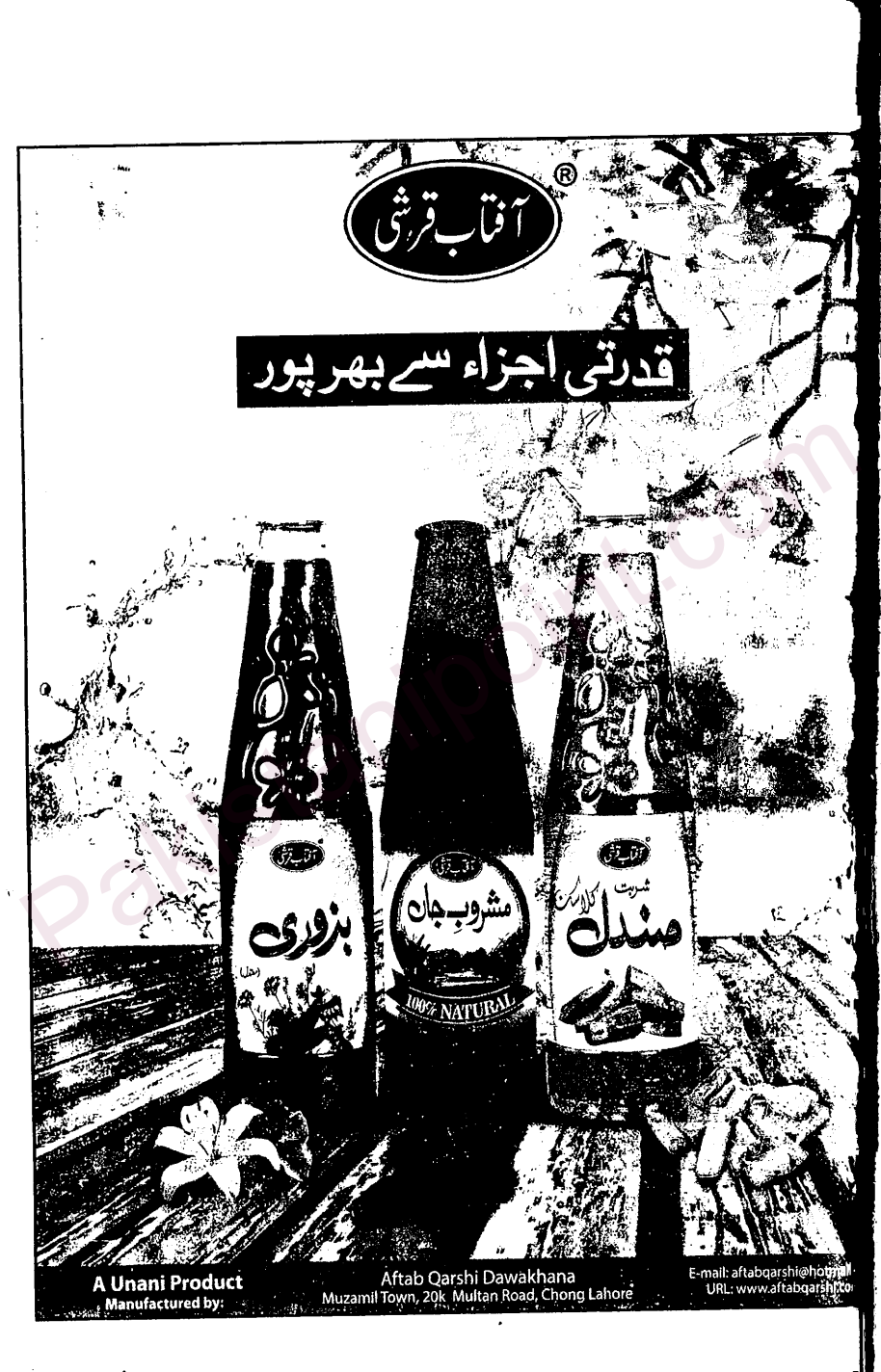

آفتاب قرشی ®
قدرتی اجزاء سے بھرپور
آفتاب قرشی
بزوری
(معتدل)
مشروبِ جان
100% NATURAL
شربت
کلاسک
صندل
A Unani Product
Manufactured by:
Aftab Qarshi Dawakhana
Muzamil Town, 20k Multan Road, Chong Lahore
E-mail: aftabqarshi@hotmail
URL: www.aftabqarshi.co

سے ان کا کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ مذہب کو ذاتی معاملہ سمجھتے تھے۔ پھر عام لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اب پاکستان بن گیا ہے اس لئے مزید جدوجہد کی اور قربانی کی ضرورت نہیں رہی۔ نفسا نفسی پھیل گئی ہر شخص جلدی مالدار بننا چاہتا تھا۔ وہ مقصد سامنے نہ رہا جس کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ نہ نماز' نہ زکوٰۃ نہ اسلامی نظام کا نفاذ' اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے تو بے حد محنت اور قربانی درکار تھی پھر بجائے اپنے آپ کو مسلمان اور حضور اکرمؐ کا امتی سمجھنے کے ہم اپنے آپ کو پنجابی' پٹھان' بلوچی اور سندھی کہلوا کر خوش ہونے لگے۔ علاقائی تعصب' لسانی اختلافات اور فرقہ وارانہ مفادات وجود میں آ گئے۔ اخلاقی اقدار ختم ہونے لگیں اسمبلیاں بنتی رہیں ٹوٹتی رہیں۔ سیاسی لیڈر نااہل ثابت ہوئے مارشل لاء لگتے رہے۔ اغیار نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان میں پائیدار حکومت قائم ہو اور یہ اسلام کا قلعہ بن جائے۔ بنگالیوں کو بہکایا گیا کہ تمہیں ترقیاتی فنڈز نہیں مل رہے اعلیٰ عہدوں پر نہیں رکھا جاتا بنگالی کو قومی زبان نہیں تسلیم کیا گیا وغیرہ وغیرہ' پھر بنگالی قومیت کا بھوت کھڑا ہوگیا۔ 1971ء میں الیکشن ہوئے اور عوامی لیگ مشرقی پاکستان میں اور پیپلز پارٹی مغربی پاکستان میں کامیاب ہوگئیں۔ بھٹو صاحب اور مجیب الرحمٰن صاحب میں سمجھوتہ نہ ہوسکا دونوں اختیارات مانگتے تھے۔ بھٹو صاحب نے جنرل یحییٰ کو اپنا حامی بنالیا مشرقی پاکستان میں ملٹری ایکشن ہوا' ٹکا خاں کو مشرقی پاکستان کا قصائی کہا جانے لگا۔ ہندو بھاگ گئے اور ملک چھوڑ گئے۔ اندرا گاندھی نے ساری دنیا کی حمایت حاصل کرلی۔ مکتی باہنی میں ہندو شامل ہوگئے ا ہندوستانی فوجیں زبردست سازوسامان سے ساتھ حملہ آور ہوگئیں۔ کوئی فوج بھی اندرو اور بیرونی محاذوں پر نہیں لڑ سکتی۔ پاکستان یارومددگار رہ گیا۔ ہنری کسنجر نے خالی وعدوں رکھا۔ امریکہ نے کوئی مدد نہ کی' مشرقی پاکستا میں فوجی قیادت عبداللہ خان نیازی جیسے نا جرنیل کے ہاتھ میں تھی۔ ڈھاکہ میں بغیر لڑ ہتھیار ڈال دیئے۔ ہندوستانی فوج کو گولی بھی چلانی پڑی' بڑی ذلت کا سامنا ہوا۔ ساری ق میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ قوم کو دھوکہ دیا گیا آخری دم تک لڑیں گے۔ امریکی بحری بیڑا بنگال میں داخل ہوگیا کہ امریکہ مدد کرے بے دینی' بداخلاقی' غلط کاری اور نااہل قیادت سزا تو ملنی ہی تھی۔ اب بعض لکھنے والے یہ ثابت کررہے ہیں کہ اچھا ہوا۔ مشرقی پاکستا علیحدہ ہوا اور بنگلہ دیش بن گیا۔ مشرقی پاکست ایک بوجھ تھا اور بنگالی قومیت بالکل علیحدہ وغیرہ وغیرہ۔

دراصل ہم میں طاقت اور استعداد ہی نہ تھی۔ جذبہ جہاد ختم تھا' جو قوم لڑنا مرنا نہیں جا وہ محکوم ہی رہتی ہے زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہم اپنے ہاتھوں ملک کا ایک حصہ کھو دیا۔ شہادت موت کو چھوڑ کر ذلت کی زندگی پسند کر قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ لڑتے رہنا ہتھیار ڈالنا' چاہے تمہیں بحیرہ عرب میں پھینک جائے۔ ایوب خان کا یہ اصرار کہ مشرقی پاک کا دفاع' مغربی پاکستان میں ہے بالکل غلط روس اور ہندوستان کی پکی دوستی تھی مگر امریک

بھی دوستی کے بھیس میں خنجر مارا۔ دونوں مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنا چاہتے تھے۔

انتہائی رنج والم میں' میں نے ایک مضمون لکھا جس میں 1971ء کی جنگ کی شکست پر پاکستانی فوج اور سیاسی قیادت پر نکتہ چینی تھی۔ میں نے اپنی رائے کا بھی اظہار کیا کہ اگر ہتھیار نہ ڈالے جاتے اور لڑائی برقرار رکھی جاتی تو شاید تاریخ کا اور باب ہی لکھا جاتا۔ میرا مضمون ضبط کیا گیا پھر میں زیرعتاب رہا۔ ڈیفنس لائبریری میں حمود الرحمٰن کمیشن سے ملنے ایک مرتبہ ایئر مارشل نور خاں تشریف لائے اور سب سے کہا' اسے کیوں تنگ کرتے ہو اس نے کیا لکھا ہے؟ یہ سب تو اخباروں میں موجود ہے۔ خیر معافی مانگ کر میں نے رہائی حاصل کی۔ ایک سرزنش کا خط میرے حوالے کردیا گیا مگر کورٹ مارشل سے بچ گیا۔ صبر کے علاوہ کیا ہوسکتا تھا قہر درویش برجان درویش۔

O

برطانیہ کے سرموریس جیمز نے اپنی کتاب ''پاکستان کرونیکل'' میں (وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو) کی زندگی پر خوب تبصرہ کیا ہے۔ ان کی ہمت اور قابلیت کی تعریف بھی کی ہے مگر ان کو ایک ''بُری روح'' قرار دیا اور لکھا ہے کہ وہ پھانسی پر لٹکا دیئے جانے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ جن ہستیوں پر بنگلہ دیش بنانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ان ہستیوں کا انجام خراب ہوا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو گولی مار دی گئی' اندرا گاندھی کو اس کے سکیورٹی گارڈز نے قتل کیا اور بھٹو صاحب کو قتل کے الزام میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ''فاعتبرو یا اولیٰ الابصار''۔ مگر یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔

O

''تقسیم''

وطن عزیز میں ہرگزرنے والے دن کے ساتھ تقسیم بڑھ رہی ہے۔ رنگ' نسل اور مذہب کی تقسیم' قومیت کی بنیاد پر تقسیم' نظریئے اور بیانئے کی تقسیم یعنی معاشرہ جتنا آج منقسم ہے اس سے قبل کبھی نہ تھا۔ ملک اور قومیں ایک نظریئے سے جڑی رہتی ہیں۔ نظریہ اتحاد اور مقصد کو جنم دیتا ہے۔

O

اگر آپ اپنی تمام مصیبتیں بھول جانا چاہتے ہیں تو.....

اپنے سائز سے کم کا جوتا پہن کر لمبی واک پر چلے جائیں۔

O

''کرونا وائرس''

ماہرین صحت کے مطابق کرونا وائرس مختلف جانوروں میں پایا جاتا ہے جو انسانوں میں منتقل ہوسکتا ہے جبکہ چینی ماہرین نے خیال ظاہر کیا ہے کہ شاید متذکرہ بیماری سانپ سے پھیلی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ چین میں بعض حشرات الارض سمیت چوہے' چمگادڑ اور سانپ انسانی غذا کا حصہ ہیں۔ یہ وائرس سانس کی نالی پر حملہ کرتا ہے جس سے نمونیا جیسی علامات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ بالآخر گردوں کی خرابی اور ہلاکت پر منتج ہوتا ہے۔ انسانوں کے درمیان یہ کھانسی' چھینک' ہاتھ ملانے اور چھونے یا پھر فضلے سے پھیلتا ہے۔

(جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

.....❁.....❁.....

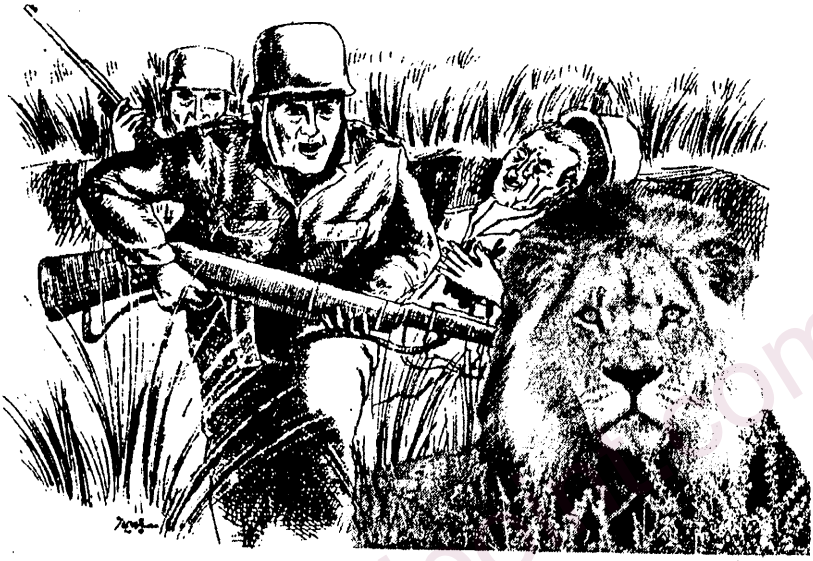

جنگل کا قیدی

جاوید اقبال

اچانک ہمیں چیخ سنائی دی، یہ جم کی آواز تھی۔ جب ہم کیبن میں داخل ہوئے تو عجیب منظر دیکھا..... جم ہاتھ میں خنجر لئے آدم خور شیر سے گتھم گتھا ہو رہا تھا۔ اس نے خنجر سے شیر کی ایک آنکھ پھوڑ دی تھی اور شیر غضب ناک ہو کر اسے بھنبھوڑ رہا تھا۔

ایک شکاری کا قصہ جو بغیر ہتھیار ایک آدم خور کے نرغے میں آ گیا تھا

شکاری کی زندگی میں کئی ایسے لمحے آتے ہیں جب اُسے موت اپنے بالکل سامنے نظر آتی ہے۔ کئی بار تو ایسا لگتا ہے کہ موت سے بچنے کا اب کوئی راستہ باقی نہیں اور زندگی بس چند لمحے کی مہمان ہے۔ لیکن ایسے میں قدرت مدد کو آتی ہے اور انسان معجزانہ طور پر بچ جاتا ہے۔ میری ساری زندگی شکار میں گزری ہے اس لیے دوستی بھی ایسے ہی لوگوں سے ہے جو شکار کے شوقین ہیں۔

ایک دن مجھے اپنے انگریز دوست جم کارسن کی کال موصول ہوئی وہ کہہ رہا تھا ”میں اس وقت

سندر بن کے مشرقی جنگل میں ہوں' یہاں میں ایک آدم خور شیر کے شکار کے لئے آیا تھا مگر اس وقت بغیر کسی ہتھیار کے بھوکا پیاسا اپنے ہٹ میں قید ہوں جلدی میری مدد کو پہنچو۔''

''تم بغیر کسی ہتھیار کے سندر بن کے جنگل میں آدم خور شیر کا شکار کرنے گئے تھے؟ تم سٹھیا تو نہیں گئے؟؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''نہیں بھائی یہ بات نہیں۔'' جم نے جھنجلا کر کہا ''جب میں یہاں آیا تو بندوق میرے پاس تھی مگر ابھی میرا آدم خور سے آمنا سامنا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک بند۔ میری بندوق اُٹھا کے بھاگ گیا۔''

جم کی بات سُن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ جم بولا ''تم ہنس رہے ہو اور ادھر میری جان پر بنی ہے۔ آدم خور کو میری یہاں موجودگی کا پتہ چل گیا ہے۔ وہ دوبار اندر گھسنے کی کوشش کر چکا ہے۔ اگر میں اس سے بچ بھی گیا تو بھوک سے مر جاؤں گا۔''

میں نے جم کو تسلی دی کہ وہ بالکل نہ گھبرائے میں جلد اس کے پاس پہنچ رہا ہوں۔ میں نے اپنے دو شکاری دوستوں کو بلالیا اور انہیں ساری صورتحال بتائی پھر اسی سہ پہر ہم ایک چھوٹے طیارے پر سوار ہو کر سندر بن روانہ ہو گئے۔

دو گھنٹے کے سفر کے بعد طیارہ اپنی منزل پر پہنچا۔ وہاں سے ہم نے ایک جیپ کرائے پر لی اور جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ مجھے جم کے ہٹ کا پتہ تھا۔ کیونکہ میں ایک بار شکار کے لئے اس کے ساتھ وہاں جا چکا تھا۔ ہم جلد ہی اس مقام تک جا پہنچے۔ یہ بہت خطرے والی جگہ تھی کیونکہ یہاں کسی وقت بھی ہمارا سامنا ایک بھوکے آدم

حافظے کا ضعیف

میں کبھی قوی حافظے کا مالک نہیں رہا اور اب تو یہ عالم ہو گیا ہے کہ رات کو کیا چیز کھائی تھی' صبح کو یہ بھی یاد نہیں رہتا..... کئی مہینے کی بات ہے کہ تاروں کی چھاؤں میں ٹہلنے کے لیے نکلا تھا' واپسی پر اپنے گھر کا راستہ بھول گیا۔ وہ تو کہیے ایک میرے ہم عمر ٹہلتے مل گئے میں نے ان سے پوچھا کہ یہیں کہیں برساتی نالے کے کنارے جو ایک گنبد والا مکان ہے۔ کیا آپ اس کا راستہ بتا سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا' کیا آپ جوش صاحب کے مکان جانا چاہتے ہیں۔ میں نے ''جی ہاں'' کہا اور ان نیک مرد نے مجھ کو میرے گھر تک پہنچا دیا اور رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا..... ''آج سے چالیس بیالیس برس پیشتر میں نے جوش صاحب کو آگرے میں دیکھا تھا۔ میرا نام نصیر احمد ہے۔ جوش صاحب سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔''

اور میں نے فرط شرم سے یہ نہیں بتایا کہ میں ہی جوش ہوں۔ اور تو اور آپ کو مشکل سے یقین آئے گا کہ ایک روز خط لکھنے کے بعد جب دستخط کی نوبت آئی تو اپنا تخلص بھول گیا۔ چند سیکنڈ تک مجھ پر عجیب کرب کی کیفیت طاری رہی۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا اور اگر دو چار سیکنڈ کے اندر اپنا تخلص یاد نہ آ جاتا تو یقین فرمایئے میرا دم نکل جاتا۔ میں نے یہ بات اسی واسطے لکھ دی ہے کہ اگر میری زندگی کے کسی واقعے میں کمی بیشی یا تغیر و تاخیر نظر آئے تو آپ اُسے میرا ارادی فعل نہ سمجھیں اور میری حالت پر ترس کھا کر اُسے معاف کر دیں۔

(جوش ملیح آبادی کی خودنوشت ''یادوں کی برات'' سے اقتباس۔ مُرسلہ: ضرار ندیم۔ شرقپور)

خورشیر سے ہوسکتا تھا۔ ہم بندوقیں اُٹھائے پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ اچانک قد آدم جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی' ہم ایک دم چونک پڑے اور بندوقیں جھاڑیوں کی طرف تان لیں۔ مگر جھاڑیوں سے دو خرگوش نکلے اور ہمارے سامنے سے گزر کر دوسری طرف کی جھاڑیوں میں غائب ہوگئے۔ اپنی گھبراہٹ پر ہم مسکرا دیے۔

ہم نے اپنی رفتار تیز کردی اور جلد ہم ہٹ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اسی وقت اچانک ہمیں ایک چیخ سُنائی دی۔ یہ جم کی آواز تھی۔ ''جلدی کرو ہمارا دوست خطرے میں ہے۔'' میں نے چلا کر کہا۔

ہم بھاگتے ہوئے ہٹ کے سامنے جا پہنچے' چیخوں کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ ساتھ ہی شیر کے غرانے کی آواز بھی آرہی تھی۔ ''جلدی کرو میں دروازہ توڑتا ہوں۔'' میں نے کہا اور بھاگتے ہوئے دروازے کو زور سے ٹکر ماری۔ میری زور دار ٹکر سے دروازہ ٹوٹ گیا اور میں اندر جا گرا۔ میرے دوست بھی للکارتے ہوئے اس کیبن کی طرف بڑھے جہاں سے جم کی چیخیں اور شیر کی دھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں بھی اپنے دوستوں کے پیچھے لپکا۔

جب ہم کیبن میں داخل ہوئے تو عجیب منظر دیکھا..... جم ہاتھ میں خنجر لئے آدم خور شیر سے گتھم گتھا ہورہا تھا۔ اس نے خنجر سے شیر کی ایک آنکھ پھوڑ دی تھی اور شیر غضب ناک ہوکر اسے بھنبھوڑ رہا تھا۔ میں نے شیر کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ گولی شیر کی ریڑھ کی ہڈی کو چھوتی ہوئی دوسری طرف جا نکلی۔ شیر نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اس کی ایک آنکھ گوشت کے لوتھڑے کی طرح لٹک رہی تھی جبکہ دوسری آنکھ انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔ اس نے جم کو چھوڑ کر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے زمین پر لوٹ پھوٹ ہوکر خود کو بچایا مگر میرا ایک ساتھی اس کی لپیٹ میں آگیا۔ شیر نے اسے زمین پر گرا کر اس کا نرخرہ چبانا چاہا۔ اتنے میں ہمارے تیسرے ساتھی نے اس کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ زوردار دھماکہ ہوا اور شیر کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑ گئے۔ وہ خوفناک انداز میں دھاڑا اس نے جھرجھری لی اور تڑپتا ہوا ہمارے ساتھی کے اوپر ڈھیر ہوگیا۔ ہمارا ساتھی اسے دھکیل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ خوش قسمتی سے اسے چند معمولی خراشیں ہی آئیں تھیں۔

ہم جم کی طرف متوجہ ہوئے' وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔ اس کے جسم پر گہرے زخم آئے تھے اور اس کی حالت نازک تھی۔ ہم اسے اُٹھا کر جیپ کی طرف بھاگے اور قریبی شہر کے ہسپتال لے گئے۔ ایک دن اور ایک رات ڈاکٹر اس کی زندگی بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر کار اُن کی محنت رنگ لائی اور قدرت نے جم کو دوبارہ زندگی بخش دی۔ اسے ہوش آیا تو ہماری جان میں جان آئی۔

ایک ماہ کے علاج کے بعد جم چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا۔ جب وہ بالکل ٹھیک ہوگیا تو اس نے اپنا سامان باندھا اور ہم سے پھر ملنے کا وعدہ کرکے اپنے ملک روانہ ہوگیا۔ لیکن جاتے جاتے میں نے اُس سے وعدہ لیا کہ آئندہ جب بھی شکار کے لیے اکیلا جائے تو ایک سے زیادہ ہتھیار ساتھ لیکر جائے تاکہ کوئی ''بندر'' اُسے عاجز نہ کرسکے۔

.....✿.....✿.....

نوشتہ تقدیر

وہ درّے سے غیر قانونی طور پر لایا ہوا ریوالور تھا اور میرے دوست کے پاس اس کا لائسنس بھی نہیں تھا۔ گولی کی آواز کے بعد کسی عورت کی چیخ سنائی دی تھی اور میں نے اوپر سے دیکھا تو نیچے مہمانوں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ میرا دوست کہنے لگا ''یار غضب ہو گیا گولی کسی عورت کو لگ گئی ہے۔''

ایک شخص کا فسانہ جس سے ہمیشہ انجانے میں بھول ہو جاتی تھی

جاوید راہی

''یار منظور اب کیا ہے؟ سوجاؤ چین سے'' میرے ساتھ والے قیدی افتخار نے اپنا منہ دیوار کی طرف کرتے ہوئے مجھے بیٹھے دیکھ کر کہا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ تقدیر اس طرح سے بھی کھیل کھیلے گی۔ میرے ساتھ پیش آنیوالے واقعات کوئی معمولی نوعیت کے نہیں تھے۔ میں نے جیل کی سلاخوں سے پار باریک جالی سے نظر آنیوالے آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھا۔ چاند کسی بدلی کی اوٹ میں مدھم روشنی میں بدل چکا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل میرے رویہ سے خوش تھا۔ میری مشقت ختم کر کے اُن پڑھ قیدیوں کو جیل میں پڑھانے کی ڈیوٹی پر لگا دیا گیا۔ رہائی میں چند روز باقی رہ گئے تھے اس لئے باہر

کی فضا میں سانس لینے کی آرزو بے چین کئے ہوئے تھی۔

رہائی تو مل گئی مگر میرے اندر کی توڑ پھوڑ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ میں کچھ چاہتا تھا..... کیا چاہتا تھا کوئی خبر نہیں تھی۔ میں تمام دن اور رات اپنے کمرے میں پڑا رہتا جب اُکتا جاتا تو گاڑی نکال کر یونہی آوارہ گردی پر نکل پڑتا۔ میرے دل پر اور ضمیر پر بوجھ تھا کہ میں قاتل ہوں چاہے اپنے کئے کی سزا کاٹ کر باہر آگیا تھا مگر اپنے اندر کی جیل میں دن رات قید تھا۔

سڑکیں ویران تھیں۔ میں نے تیز رفتاری سے بائیں جانب موڑ کاٹا اور ایک گھر کے احاطے میں داخل ہوگیا۔ پیچھے آنیوالی ایک اور کار کے ڈرائیور نے پوری قوت صرف کر کے بریک لگائے تھے اور چلا کر ان سب کو جو عموماً آگے پیچھے دیکھے بغیر اور اپنی یا دوسروں کی زندگی سے بے نیاز ہوکے ایسی غیر ذمے دارانہ ڈرائیونگ کرتے ہیں گالی دی مگر میں نے کچھ نہیں سنا۔ مجھے احساس تک نہ تھا کہ میری بے پروائی کی عادت کے باعث وہ کیسے جان لیوا حادثے کا شکار ہوتے ہوتے رہ گیا ہے۔ کار میں نے گھر کے پورچ کے بجائے گیراج کے بند دروازے سے چند انچ کے فاصلے پر روکی۔ طویل وعریض کار حرکت سے یکلخت قیام کی حالت میں آنے کے باعث احتجاجاً تھوڑا سا اوپر نیچے ہوئی پھر اس کا متلاطم وجود ساکت ہوگیا تاہم میں نے کار سے اُترنے میں کسی عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں کچھ دیر اسی طرح پیر پھیلائے اور ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے بیٹھا رہا اور کچھ سوچتا رہا پھر فیصلے کو ناگزیر سمجھتے ہوئے میں نے ایک دروازہ کھولا اور باہر آکر سگریٹ کا آخری کش لینے کے بعد آدھی سگریٹ کو جوتے سے مسل دیا۔ رومال نکال کے میں نے اپنی جبیں پر سے پسینہ پونچھا جس کا کہیں نشان تک نہ تھا۔

میں اب بھی تذبذب کا شکار تھا' میں نے ایک نظر اس گھر کو دیکھا جس کے دیوار و در سے آشنائی کا رشتہ بہت پرانا تھا مگر اس سے وابستہ یادیں بہت تلخ تھیں۔ گھر میں اندر کے کسی کمرے سے صرف ٹیلی وژن کی آواز باہر آرہی تھی اور روشنی بھی صرف ایک ہی کمرے میں تھی۔ ایک بار پھر میں نے اپنے جذباتی فیصلے پر نظر ثانی کی۔ واپس لوٹ جانے کے بارے میں سوچا اور آہنی دلائل سے اس خیال کو رد کر دیا جواب تک میں خود کو باور دے چکا تھا۔ اپنے اقدام کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل کی یہ ذہنی کشمکش مدت سے جاری تھی اور یہاں تک پہنچ جانا اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ میرے اندر کا وہ آدمی جو اس کی مخالفت کرتا تھا ہار گیا ہے۔ میں نے کال بیل بجا کے ایک منٹ تک انتظار کیا۔ آوازوں سے میں اندازہ کرسکتا تھا کہ کوئی دروازہ کھولنے آرہا ہے۔

جس شخص نے دروزاہ کھولا وہ تقریباً میرا ہم عمر تھا۔ چالیس پینتالیس سال کا آسودہ حال اور مطمئن نظر آنیوالا عام سا آدمی جو زندگی کی جدوجہد میں دن صرف کرنے کے بعد شام کے ہر لمحے کو سکون سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی خوشیاں سمیٹنے میں راحت محسوس کرتا ہے۔ ساحل سمندر پر سیپیاں چننے والے کی طرح جو اس خیال کی دسترس سے دُور نکل گیا ہو کہ دنیا میں قدر زر کتنی تیزی سے گھٹ رہی ہے اور ایٹمی ہتھیاروں کا ذخیرہ کتنی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

''جی؟'' اس نے مجھے متجسس نظروں سے دیکھتے ہوئے مہذب لہجے میں کہا۔ ''کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

''شہریار صاحب۔'' میں نے خاموشی سے مختصر وقفے کے بعد کہا ''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟''

دروازہ کھولنے والا اپنے نام سن کے تھوڑا سا چونکا اور اس نے اپنی یادداشت پر شرمندہ ہوکے غور سے دیکھا ''میں..... معاف کیجئے گا میں پہچان تو رہا ہوں لیکن کچھ یاد نہیں آتا۔''

''میں سلیم ہوں'' میں تھوڑا سا آگے روشنی میں آکر بولا۔ رومال اَب اس کے ہاتھ میں تھا۔

''سلیم احمد؟'' شہریار نے زیر لب دہرایا۔ ''وہ انشورنس ایجنٹ!''

''نہیں..... دیکھئے' میں نے ہی آپ کی بیوی کو قتل' میرا مطلب ہے مارا تھا'' میں نے کہنا شروع کیا۔

شہریار بالکل غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ ''تو تم..... وہ سلیم احمد ہو..... ہاں..... مگر۔''

''شہریار صاحب..... مجھے احساس ہے کہ..... کہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔'' میں نے کہا ''مگر میں آ گیا۔''

شہریار کا وہ چہرہ جو قناعت کی تصویر تھا غم کے پیکر میں ڈھل گیا۔ یادوں کے تاریک سائے اس کی صورت پر نفرت کا رنگ بن کر پھیل گئے' وہ اپنی بیوی کے قاتل کو پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔

''مجھے بہت افسوس ہے..... مجھے بار ہا خیال آیا تھا'' میں نے پھر کہنا شروع کیا ''لیکن مجھے موقع نہیں ملا۔ آج اتفاق سے میرا گزر اس طرف ہوا۔ میں نے سوچا شاید پھر اس سے بہتر موقع نہ ملے' بات اتنی پرانی ہے..... لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے آپ کے رنج و غم کا وجود نہیں رہا۔ وقت سب سے بڑا چارہ گر ہے اور صدمے کی شدت شائد اَب پہلے جیسی نہیں ہوگی..... مگر پھر بھی میرے یہاں آنے کا مقصد اس غم کو تازہ کرنا نہیں۔''

شہریار نے سر ہلایا۔ ''پھر؟'' اس نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ ''اب کیا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں'' میں نے رومال سے ماتھا خشک کرنے کا عمل جاری رکھا۔ ''بس کچھ باتیں کرنی تھیں..... اگر اجازت ہو اور کوئی قباحت نہ ہو تو میں اندر آ جاؤں؟''

شہریار نے بے خیالی میں سر ہلایا ''اب کیسی قباحت۔ آؤ..... آ جاؤ'' وہ اور پیچھے ہٹا اور پلٹ کے چلنے لگا۔ میں اس کے پیچھے رہا۔

یہ متوسط طبقے کے ایک فرد کا چھوٹا سا بنگلہ تھا جس میں آسائش کے سب لوازمات تھے۔ اتنی جگہ تھی کہ گھر کے مکیں آرام سے رہ سکیں اور وہ آرائش تھی جس سے دولت کا نہیں اعلیٰ ذوق اور نفاست کا پتہ چلتا تھا۔ یہ سلیقہ اور حسن انتظام بھی کسی عورت کی موجودگی کا مظہر تھا مگر ابھی تک وہ عورت نظر نہ آئی تھی۔

ہم دونوں ایک کشادہ، صاف ستھرے اور خاصے آراستہ کمرے میں جا بیٹھے جہاں ٹیلی وژن پر کوئی فلم چل رہی تھی۔ کرسی پر وہ اخبار رکھا تھا جو شہریار پڑھتے پڑھتے چھوڑ گیا تھا اور کافی کا آدھا مگ رکھا تھا جو شہریار پی رہا تھا اور اگر میں مخل نہ ہوتا تو وہ میز پر پیر پھیلائے ایک ہاتھ میں اخبار اور دوسرے ہاتھ میں کافی کا مگ تھامے کبھی اخبار کو اور کبھی ٹی وی کو دیکھتا رہتا۔ اب اس نے ٹی وی کو بند کیا اور دوسرا مگ لے کر آیا۔ اس وقت تک میں ساتھ والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

''معلوم ہوتا ہے پھر شادی کر لی ہے'' میں اسے مگ بھرتا دیکھتا رہا۔ ٹی کوزی کے نیچے چائے دانی میں کافی اب بھی بہت گرم تھی۔ شہریار نے اقرار میں سر ہلایا اور مگ میرے سامنے رکھ دیا۔ ''المیہ یہی ہے کہ ہم کینے اور خود غرض انسان اس وقت تک محبت کے دعوے کرتے ہیں جب تک خود نہیں مرتے، مرنے والوں کو اور ان کی محبت کو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔''

''تمہاری بیوی مجھے دکھائی نہیں دی؟'' میں نے بے چینی سے پہلو بدلا ''بچے ہیں؟''

''دو بچے ہیں اب تو۔'' شہریار نے اپنا آدھا مگ پھر اُٹھا لیا۔ ''بڑا لڑکا اس سال آٹھویں کا امتحان دے گا۔ چھوٹی لڑکی اس سے دو سال پیچھے ہے ابھی میں نے ڈانٹ کر سلا دیا ہے دونوں کو۔ ایسی سنجیدہ فلمیں جن میں ذرا بھی ایکشن نہیں ہوتا وہ بھی خوامخواہ دیکھتے رہتے ہیں۔ ٹی وی ساری رات چلے تو ساری

رات نہ اُٹھیں مگر انہیں صبح صبح اسکول جانا ہوتا ہے اور نظر بھی تو خراب ہوتی ہے۔ کافی ٹھنڈی تو نہیں ہوئی؟''

''کافی؟'' میں چونکا۔ ''نہیں..... بالکل نہیں۔''

''معاف کرنا میں نے خود ہی بنائی ہے۔ بیوی ساتھ والے بنگلے میں گئی ہوئی ہے۔ وہاں کوئی شادی یا مہندی کی رسم ہو رہی ہے۔ ان عورتوں کو تم جانتے ہو۔ سات سال کی بچی ہو یا ستر سال کی بڑھیا۔ شادی میں پاگل ہو جاتی ہیں۔ اب رات بھر ڈھولک بجائیں گی، ناچیں گی، گائیں گی۔ اَن پڑھ ہو یا تعلیم یافتہ، رسموں کے معاملے میں سب ایک ہیں۔'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔ ''اصل میں ہمارے یہاں نسوانیت کا ایک مخصوص مزاج اور سانچہ ہے۔''

''تم اپنی موجودہ ازدواجی زندگی سے بہت خوش..... میرا مطلب ہے مطمئن ہو۔'' میں نے کہا اور مسکرایا۔

شہریار کی شگفتگی کافور ہو گئی۔ ''ہاں میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا۔'' یہ بات میں اس وقت بھی کہتا تھا جب نغمہ..... میری پہلی بیوی زندہ تھی۔ شاید یہ تقدیر کی رحم دلی اور مہربانی تھی کہ اس نے مجھے سلمٰی جیسی بیوی دے کر اس سے زیادہ دے دیا جتنا مجھ سے چھینا تھا۔ خدا مجھے معاف کرے۔ میرا مقصد مرحومہ کی روح کو صدمہ پہنچانا نہیں۔ وہ بھی بہت اچھی تھی۔ اتنی اچھی کہ زندہ رہتی تو شاید میں زیادہ خوش اور مطمئن ہوتا۔ میں نے کہا نا عورت کا ایک مثالی روپ ہوتا ہے جو ہر مرد کے ذہن میں موجود رہتا ہے۔ اس کی کوئی ٹھوس صورت نہیں ہوتی اور اس کے تصور میں خاصی لچک ہوتی ہے۔ وہ عورت چاہتا ہے جو حسین ہو اور جسمانی طور پر بھی پُرکشش ہو۔ محبت کر سکتی ہو اور محبت کرنے پر مجبور کر سکتی ہو۔ راحت اور آسودگی کا احساس دے سکتی ہو۔ سلیقہ مند ہو کہ گھر کو چلا سکے اور بچوں کی صحیح تربیت کر سکے اور مرد کو فکرات سے دُور رکھ سکے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ ان کی خوش حالی کیلئے بھرپور جدوجہد کر سکے۔ خوش مزاج اور تھوڑی بہت سوشل ہو اور باوفا ہو..... یہ سب خوبیاں اُس میں بھی تھیں اور اِس میں بھی ہیں۔ میرا خیال ہے اور بہت سی ایسی ہی عورتیں..... ہوں گی جو ایسے ہی گھر آباد کر چکی ہیں یا کر سکتی ہیں مگر میں اسے قدرت کی فیاضی نہ کہوں تو کیا کہوں کہ اس نے مجھ سے ایک مثالی بیوی کو چھینا تو دوسری دے دی۔ اگر خدا نے ایک مرد کیلئے ایک عورت تخلیق کی ہے تو میں کیا ہوں۔ بدقسمت یا خوش قسمت؟ آخر وہ بھی تو کوئی مرد ہوگا جسے ایک بھی ایسی عورت نہیں ملے گی۔''

میں غور سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے شہریار یہ سب باتیں اپنے آپ سے کر رہا ہے اس کی نظر ٹی وی پر رکھے کتاب کی طرح کھلنے والے چاندی کے بنے ہوئے ڈبل فریم پر تھی جس میں ایک طرف وہ خوبصورت سوٹ پہنے کھڑا تھا دوسری جانب ایک بے حد حسین اور جاذبِ نظر نقوش کی مالک عورت دلہن کے روپ میں موجود تھی۔

''یہ شادی کی تصویر ہے۔ نو سال پرانی'' شہریار نے کہا ''مگر سلمٰی اب اس سے کہیں زیادہ حسین ہو چکی ہے۔''

''حُسن'' میں نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ ''ایک احساس کا نام ہے جو دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے۔''

''ہاں۔ شاید'' شہریار بولا ''میں غیر جانبداری سے فیصلہ نہیں کر سکتا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال!'' میں نے بوکھلا کر کہا اور مگ نیچے رکھ دیا۔ ''کس سلسلے میں؟''

''نغمہ زیادہ حسین تھی یا سلمٰی زیادہ حسین ہے؟'' شہریار نے کہا ''تم نے تو اسے دیکھا تھا۔''

مجھے اپنے ماتھے پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی ''نہیں حقیقت یہ ہے کہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔''

''پھر تم نے اسے قتل کیسے کر دیا تھا۔'' شہریار نے تلخ لہجے میں کہا ''دیکھیے بغیر؟''

''میں..... میں یہی وضاحت کرنے کیلئے آیا تھا'' میں نے رومال کو ماتھے پر پھیرا ''گو اب اس کی ضرورت کسی کو نہیں۔ سوائے میرے۔''

''کیوں؟ تمہیں اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟'' شہریار نے کہا۔

''اس لئے کہ جو کچھ میں نے عدالت میں کہا تھا اسے کسی نے سچ نہیں مانا تھا اور بہت کچھ میں نے اپنے وکیل کی ہدایت پر بھی کہا تھا لیکن یہاں تمہارے گھر میں جو کچھ میں کہوں گا جھوٹ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہاں میں سچ بول کر اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے آیا ہوں۔'' میں نے کہا ''اندیشہ مجھے یہ تھا کہ میری صورت دیکھتے ہی تم مشتعل ہو جاؤ گے اور میری کوئی بات سنے بغیر مجھے گالیاں اور دھکے دے کر نکال دو گے۔ تم نے مجھے یہ موقع فراہم کیا۔ مجھے اتنی مہلت دی کہ میں کچھ کہہ سکوں۔ قانون نے مجھے مجرم سمجھا تھا۔''

''لیکن تمہیں وہ سزا تو نہیں ہوئی جو قاتل کو دی جاتی ہے۔'' شہریار نے طنز سے کہا۔

''ہاں۔ قانون کے فیصلے حالات کے پس منظر میں کئے جاتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم نے بہت بڑا وکیل کیا تھا'' شہریار نے گالی دے کر خالی مگ کو میز پر پٹخ دیا۔ ''اس نے تمہیں بچا لیا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''میں نے قید بامشقت کے تین سال کاٹے۔ تمہارا عذاب تو میری سزا سے بہت پہلے ختم ہو گیا تھا۔ غالباً ایک سال بعد ہی تم نے دوسری شادی کر لی تھی اور تمہیں معلوم ہے جیل کا ایک دن کتنا لمبا ہوتا ہے۔ خیر اس بات کو بھی جانے دو۔ یہ سزا تو مجھے ملنی ہی چاہئے تھی۔ جب میں رہا ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ بعد میں میری ماں مر گئی کیونکہ جو پنشن میرے باپ کو ملتی تھی اس سے وہ پیٹ بھر کے روٹی بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ ماں کا علاج کیسے ہوتا؟ تم تو جانتے ہو کہ ان کا واحد سہارا میں تھا اور ان دنوں میں اور تم ایک ہی پوسٹ پر تھے۔ اب تم کیا ہو؟''

شہریار نے دیوار کو گھورتے ہوئے کہا ''میں ڈائریکٹر ہوں۔''

میں نے سر ہلایا ''میں تم سے سینئر تھا۔ خیر..... جب میں رہا ہو کے حیدر آباد پہنچا۔ میں سکھر جیل سے رہا ہوا تھا تو میرا باپ بستر مرگ پر تھا۔ سرکاری ملازمت کے قواعد وضوابط تم سمجھتے ہی ہو۔ میں جیل جانے کے بعد ہمیشہ کیلئے سرکاری نوکری کیلئے نااہل ہو گیا ہوں اور کہیں چپڑاسی تک نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس عرصہ میں کبھی مجھے تمہارا خیال نہیں آیا تھا۔ آیا تھا مگر مجھے فرصت نہیں تھی اور اب چلا جاتا تو پھر نہ جانے کب فرصت میسر آتی۔ تم میری بات پر اعتماد کرو گے نا؟''

''میں..... میں کوشش کروں گا.....'' شہریار نے کہا ''کہنا کیا چاہتے ہو تم؟''

''میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ جب..... جب میں نے گولی چلائی تو بقائمی ہوش وحواس سے نہیں چلائی تھی''

''یہی موقف تمہارے وکیل کا تھا'' شہریار طنز سے بولا ''اس نے کہا تھا کہ تم پئے ہوئے تھے۔''

میں نے نفی میں گردن ہلائی ''وہ محض قانونی نکتہ پیدا کرنے والی بات تھی۔ میں نے زندگی میں کبھی حرام شے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میرے کہنے کا مقصد تھا کہ میں نے جانتے بوجھتے تمہاری بیوی پر گولی نہیں چلائی تھی۔ قانون تو قسم پر اعتبار نہیں کرتا مگر یہاں صرف تمہارے سامنے میں حلف اٹھا کے کہوں تو تمہیں مان لینا چاہئے کہ سچ یہی ہے۔ مجھے اب جھوٹ سے کیا فائدہ؟..... نغمہ..... تمہاری پہلی بیوی کی جان میرے ایک احمقانہ فعل کا نتیجہ تھی۔ میرا باپ مجھے عقل کا اندھا کہتا تھا۔ اس لئے کہ بچپن میں بھی سوچ سمجھے بغیر کام کرتا تھا اور نقصان اٹھاتا تھا۔ میری کھوپڑی اُلٹی تھی

اور اس میں جو خیال آتا تھا وہ سیدھا بہت کم ہوتا تھا مگر میں نفع نقصان کی بعد میں سوچتا تھا قدم پہلے اٹھاتا تھا۔ ایسے لوگوں کو کچھ بھی کہو، غیر ذمہ دار، عاقبت نااندیش، کوتاہ بیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کتے کی دم والی مثال میرے جیسے لوگوں پر صادق آتی ہے حالانکہ کتے کی دم کو کسی نے بارہ سال نلکی میں رکھنے کا تجربہ نہیں کیا مگر یہ سچ ہے۔''

شہریار مسکرایا ''آدمی کی فطرت واقعی نہیں بدلتی۔''

''جب میں آٹھ سال کا تھا تو میں نے آنگن میں درخت پر گرگٹ کو اپنی غلیل سے نشانہ بنایا'' میں نے کہا ''درخت کے نیچے میری ماں ہنڈیا میں کڑھی گھوٹ رہی تھی۔ گرگٹ سیدھا ہنڈیا میں گیا اور کڑھی کے زرد رنگ میں گرگٹ کا خون مل گیا اس کے بعد میری ماں تمام عمر کڑھی نہ کھا سکی۔ سکول میں لکڑی کے زینے کی ریلنگ پر سے پھسلنا بچوں کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ ایک بار میں اوپر سے راکٹ کی طرح آیا اور ایک ہلکے پھلکے کم عمر کے بچے کو رگیدتا ہوا لے گیا۔ وہ اور میں ایک ساتھ نیچے گرے لیکن میں اوپر تھا مجھے کچھ نہ ہوا۔ اس بچے کی دو ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور مجھے پتہ نہیں کتنے لوگوں نے مارا۔ کلاس کے بڑے لڑکوں نے' پھر ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر نے، گھر پر ماں نے اور پھر باپ نے اور آخر میں اس لڑکے کے باپ نے۔ چودہ سال کی عمر میں مجھے میرے ماموں نے چھرّے والی ایئر گن لا دی۔ جس سے چڑیاں کوّے مارتے مارتے میں نے ایک روز دودھ والے کو زخمی کر دیا۔ نشانہ میں نے اس کے گھڑے کا لیا تھا وہ باڑے کا خالص دودھ مکئے میں لے کر آتا تھا۔ میں نے سوچا اس میں چھرّے سے جتنے سوراخ ہوں گے اتنی ہی دودھ کی دھاریں نکلیں گی اور اس منظر کے تصور نے مجھے عملی قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا مگر چھرّے گھڑے کے بجائے اس کی گردن میں لگے جس سے مٹکا گر کر پھوٹ گیا اور دودھ والے کی گردن سے خون پھوٹ پڑا۔ وہ چیختا دہاڑتا میرے باپ کے پاس فریادی بن کے پہنچا اور پھر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا یعنی جوتا کاری کا طویل تکمل۔''

شہریار بے ساختہ ہنسا ''بچے بعض اوقات چلبلے پن میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ دو کا خون تم پہلے بہا چکے تھے بلکہ گرگٹ سمیت تین کا۔''

''ہاں کبھی نہ کبھی ایسا اتفاق ہوتا تھا'' میں نے کہا ''بعد میں میرے باپ نے ایئر گن چھین لی اور خنجر تو درکنار مجھے پنسل تراشنے کیلئے کسی چاقو تک رکھنے سے منع کر دیا۔ وہ کہتا تھا یہ لڑکا تو خونی ہے۔ کسی روز سچ مچ کسی کو خون کر دے گا اور ہماری عاقبت خراب کرے گا۔'' میں نے کہا ''عاقبت کا تو مجھے علم نہیں لیکن اس نے جو کچھ کہا تھا وہ تقدیر نے سچ کر دکھایا۔ آپ کی بیوی کی موت تو بہت بعد میں پیش آنیوالا آخری حادثہ تھی اس سے پہلے کالج میں یہ ہوا کہ کرکٹ میں بیٹنگ کرتے ہوئے میں نے چھکا مارنے کیلئے بیٹ گھمایا۔ گیند نکل گئی اور بیٹ میرے ہاتھ سے نکل کر مڈ آف پر مجھ سے چند گز دور کھڑے ہوئے مخالف ٹیم کے کپتان کے منہ پر جا لگا۔ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اور سامنے کے دانت ٹوٹ گئے۔ دوسری ٹیم والوں نے میری ٹھکائی لگائی پھر میری ٹیم بھی میدان میں آ گئی اور بڑا گھمسان کا رَن پڑا جس میں امپائر سمیت سب پٹے۔ وہ معاملہ بڑی مشکل سے رفع دفع ہوا کیونکہ دانستہ میں نے کچھ نہیں کیا تھا''

''معاف کرنا میں تمہیں سگریٹ پیش نہیں کر سکتا'' شہریار نے کہا ''میری بیوی نے یہ عادت چھڑا دی ہے اور بہت سی غلط عادتوں کے علاوہ۔''

''بیویاں سب سے چھڑا دیتی ہیں۔'' میں معنی خیز انداز میں مسکرایا ''میرے پاس اپنے سگریٹ ہیں'' میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر لائٹر سے جلائی۔ ''بات میں اس دن..... اس منحوس دن کی کرنا چاہتا تھا لیکن جو کچھ اس روز ہوا وہ میرے ماضی کے پورے کردار کو سامنے رکھے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ یہ باتیں میں نے

عدالت میں کہاں بتائی تھیں ۔ میں خود کو عقل کا اندھا اور اتنا عاقبت نااندیش ثابت کرتا تو مجھے حالات کی رعائت کہاں ملتی ۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم ایک پارٹی میں شریک تھے ۔ تمہیں یاد ہوگا ہمارے ساتھ ایک اور پٹھان افسر تھا۔ اس کی شادی کا ولیمہ تھا۔ مجھے نام یاد نہیں آرہا ہے اس کا ۔ شیر محمد خاں یا شیر باز خاں۔ اس نے مجھے ایک ریوالور دکھایا کہ یہ درّے کا بنا ہوا ہے ۔ بتاؤ اس میں اور ولائتی ریوالور میں کوئی فرق ہے۔ میں نے ریوالور لے کر دیکھا اور پٹھان کاریگروں کے ہنر کی تعریف کی۔ اس کا توازن دیکھنے کیلئے میں نے ریوالور کھلی کھڑکی سے باہر رکھتے ہوئے نشانہ لیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ ریوالور خالی ہے لیکن اسے خود معلوم نہ تھا کہ چیمبر میں ایک گولی موجود ہے۔ میں ریوالور کا ٹریگر دباتا گیا اور کسی خاص سمت میں دیکھے بغیر فائر کرتا گیا۔ جب آخری چیمبر کی گولی کا دھماکہ ہوا تو میں اُچھل پڑا۔ میرے ہاتھ میں بھی شدید جھٹکا آیا تھا کیونکہ میں فائر کیلئے تیار نہ تھا۔ میرا دوست گھبرا گیا۔ اس نے مجھ سے ریوالور چھینا اور بھاگ گیا۔ وہ درّے سے غیر قانونی طور پر لایا ہوا ریوالور تھا اور میرے دوست کے پاس اس کا لائسنس بھی نہیں تھا۔ گولی کی آواز کے بعد کسی عورت کی چیخ سنائی دی تھی اور میں نے اوپر سے دیکھا تو نیچے مہمانوں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی ۔ میرا دوست کہنے لگا ''یار غضب ہوگیا گولی کسی عورت کو لگ گئی ہے۔'' اس وقت تک ہم دونوں میں سے کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ عورت کون ہے ۔ میرے دوست نے کہا ''یار جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔ میرا نام مت لینا کہ میں نے ریوالور دیا تھا اور کہا تھا کہ اس میں گولی نہیں۔''

صرف ایک دن پہلے اس کی شادی ہوئی تھی۔ میرے ساتھ وہ بھی پھنس جاتا۔ میں نے کہا ''اور کیا کہوں؟ وہ بولا ''کہہ دینا ریوالور یہاں پڑا تھا اتنے مہمان جو شادی میں شرکت کیلئے پشاور، کوہاٹ، مردان اور بنوں سے آئے ہیں ان سب کی موجودگی میں کسی ایک پر الزام نہیں آسکتا۔ تم کہنا کہ پستول کو خالی سمجھا تھا میں تمہیں بچالوں گا۔'' میں ہکا بکا اور ذہنی طور پر مفلوج کھڑا تھا۔

مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ نادانستگی میں ہی سہی مگر میں نے ایک قتل کر دیا ہے ۔ ایک جیتی جاگتی عورت کو مار دیا ہے ۔ میں وہیں کھڑا تھا کہ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا اور میں نے وہی کہہ دیا جو میرے دوست نے کہا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تمہاری بیوی تھی۔ اب اسے کیا کہا جائے۔ یہی کہ اس کی قضا آگئی تھی۔ یہ نوشتۂ تقدیر تھا اسے میرے ہاتھوں اسی طرح مرنا تھا۔ وعدے کے مطابق بعد میں میرے دوست نے میری بہت مدد کی ۔ اس نے پولیس کو دے دلا کر سب مشتبہ مہمانوں کو پکڑنے سے باز رکھا جو اس کے مہمان تھے۔ تم جانتے ہو مہمان کی عزت پر تو پٹھان جان دے دیتے ہیں ۔ وکیل وغیرہ بھی اس نے کئے تھے اور بیچارا جب تک یہاں رہا مجھ سے ملنے کیلئے اپنی بیوی کے ساتھ باقاعدگی سے جیل آتا رہا۔ آج کل دبئی میں ہے۔ میں اپنی مقدس ترین چیز یعنی اپنے ضمیر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ ایک حادثاتی قتل تھا۔ غیر ارادی اور میری اسی احمقانہ عاقبت نااندیشی کا نتیجہ۔ ریوالور خالی ہو تب بھی خلا میں آسمان کی طرف رُخ کر کے گولی چلانی چاہئے۔ اس وقت جب یہ حادثہ پیش آیا تو میری حالت ایسی تھی جیسے میں واقعی نشے میں ہوں۔ مجھے اپنا ہوش بالکل نہ تھا۔ بعد میں وکیل نے اسی نکتے پر میری جان بچالی مگر یہ بوجھ ہے اس عذاب سے تو نہیں بچا سکتا تھا جو میں نے تین سال کے شب و روز کے ہر لمحے میں جھیلا۔ جرم سے زیادہ یہ احساسِ گناہ تھا جس سے مفر نہ تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی کا تجزیہ کیا جو ایسے ہی حادثات سے بھری پڑی تھی اور مجھے اپنے باپ کی بات اکثر یاد آتی جس نے کہا تھا کہ یہ لڑکا کسی روز سچ مچ کوئی قتل کر دے گا۔ دنیا کی طرح انھوں نے

بھی یقین نہیں کیا کہ میں نے اس عورت کو بلاوجہ مار دیا' جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی مجھ سے جیل میں ملنے تک نہیں آیا تھا سوائے اس دوست کے جس کی بیوی میری شکر گزار تھی کہ میں نے اس کا سہاگ بچا لیا اور ان کے خاندان کی عزت بچالی۔ میرے لئے یہ خیال بھی باعثِ آزار تھا کہ میرے والدین سے بیٹا ہی نہیں چھنا معقول آمدنی کا ایک ذریعہ بھی چھن گیا۔ اب وہ دنیا کو کیا منہ دکھاتے ہوں گے اور کیسے گزارا کرتے ہوں گے۔ میں نے طے کیا کہ سارا قصور میری لاابالی فطرت کا ہے۔ مجھے دنیا میں رہنا ہے تو احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا اور عجلت میں آگے پیچھے دیکھے بغیر قدم اُٹھانے کی عادت بلکہ فطرت کو بدلنا ہوگا۔ فطرت کو بدلنا آسان کام نہیں مگر آدمی قوتِ ارادی سے کام لے تو ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ قوتِ ارادی کی کمی مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی۔''

''اب یہاں آکر مجھے یہ سب کچھ بتانے کا مقصد کیا ہے؟'' شہریار نے موقع پاتے ہی پہلو بدلا اور اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھ کے جماہی لی ''پتا نہیں سلمٰی کب آئے گی؟''

''میں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ جو کچھ ہوا اس میں میرے ارادے کو ایک فیصد بھی دخل نہیں تھا'' میں نے کہا۔

''مجھے اب تمہاری بے گناہی میں کسی قسم کا شبہ نہیں'' شہریار نے کہا ''جو ہوا اسے تم بھی بھول جاؤ''

''میں ایسے نہیں بھول سکتا شہریار صاحب'' میں نے کہا ''جب تک آپ مجھے صدقِ دل سے معاف نہیں کر دیتے میں قانون کا نہیں آپ کا مجرم ہوں۔''

شہریار میری صورت کو غور سے دیکھتا رہا کہ میں تین سال کی قید بامشقت کاٹنے کے باوجود اپنے ضمیر پر ایک بوجھ لئے پھر رہا تھا اور واقعی شرمندہ تھا۔ خود اپنی نظر میں گناہ گار تھا اور نادانستگی میں سرزد ہوجانے والے جرم پر اب اس سے معافی مانگنے آیا تھا۔ وہ آہستہ سے اُٹھا اور میرے پاس آگیا ''اگر تم اس سے مطمئن ہو سکتے ہو دوست تو میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں کوئی کدورت نہیں۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں نیک نیتی سے کہہ رہا ہوں'' اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور شفقت سے دبایا۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا ''مجھے اس کی بہت کم امید تھی'' میرا چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔ ''لیکن آپ واقعی فراخدل اور عظیم آدمی ہیں۔ میں اب خود کو بہت ہلکا پھلکا اور نیا آدمی محسوس کر رہا ہوں۔''

''گنہگار ہم سب ہیں غلطی ہم سب کرتے ہیں'' شہریار نے کہا ''مگر خدا ہی نیتوں کا حال جانتا ہے۔ وہ معاف کرنے والا ہے۔''

''اب میں چلتا ہوں'' میں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ مجھے چھوڑنے باہر تک آیا۔ مجھے کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھتا رہا۔

میں نے کار اسٹارٹ کی۔ میں بہت خوش تھا اور بہت جوش میں تھا۔ میں نے دیکھے بغیر کار کو تیزی سے ریورس گیئر میں ڈال کر واپس کیا۔ کسی عورت کے چیخنے کی آواز اس وقت آئی جب کار اس سے ٹکرا چکی تھی اور دیو پیکر کار کے پہیے جھٹکا کھا کر اس کے اوپر سے گزر چکے تھے۔ میں نے شہریار کے چلانے کی آواز بھی سنی اور گھبرا کے نیچے اُترا۔

کار کے نیچے ایک حسین عورت مری پڑی تھی۔ اس کا بھاری سرخ جوڑا جو اس نے شادی کی رسم کیلئے پہنا تھا لہو سے تر ہو گیا تھا اور اس کے مہندی لگے ہاتھ فریاد طلب انداز میں پھیلے رہ گئے تھے۔ وہ ساتھ والے بنگلے سے آئی تھی اور وہی عورت تھی جس کی تصویر گھر کے اندر ٹی وی پر چاندی کے فریم میں لگی ہوئی تھی۔

بچوں کیلئے ہمجولی کزنز کی اہمیت

ڈاکٹر محمد طارق اُبل

جو بچے کزنز کے ساتھ کھیلتے کودتے اور مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتے بڑے ہوتے ہیں ان کا اپنے گھر اور خاندان کے ساتھ تعلق زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ معصوم بچوں کی شخصیت کے مثبت پہلوؤں کی نشوونما کیلئے یہ ساتھ بے حد ضروری ہے!

بچوں کی نشوونما اور شخصیت کی تعمیر میں کئی چیزیں اہم کردار ادا کرتی ہیں جن میں سب سے اہم انہیں میسر ماحول اور قریبی ساتھی ہیں۔ آج کل بڑھتے جرائم اور خوف کی فضا کی وجہ سے والدین بچوں کی حفاظت اور ان کی کمپنی کے بارے میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئے ہیں۔ بچوں کے اغوا اور ان کے خلاف بڑھتی ہوئی جرائم کی وارداتوں نے بھی اس حوالے سے والدین کو احتیاطی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ چنانچہ اب بچوں کو پہلے جیسی آزادی اور آس پڑوس کے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں حصہ

لینے کے بھی زیادہ مواقع میسر نہیں آتے۔ چنانچہ وہ گھروں میں بند ہو کر ٹیلی ویژن' ویڈیو گیمز اور انٹرنیٹ پر مصروف رہتے ہیں۔ ایسے میں بچوں کی شخصیت کے مثبت رنگوں کی نشوونما کے لئے کزنز ہی ایسا ذریعہ رہ جاتے ہیں جن پر والدین بھی بھروسہ کر سکتے ہیں اور جن کی موجودگی بچوں کے لئے بھی بے حد خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ طبی ونفسیاتی ماہرین بھی بچوں کے لیے کزنز کو بے حد اہم قرار دیتے ہیں۔

جو بچے کزنز کے ساتھ کھیلتے کودتے اور مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتے بڑے ہوتے ہیں ان کا اپنے گھر اور خاندان کے ساتھ تعلق زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور وہ فیملی کے ساتھ زیادہ مضبوطی سے جڑے ہوتے ہیں۔ ایسے بچے دوسروں کی نسبت زیادہ جلدی سیکھتے اور آگے بڑھتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ کزنز کے ساتھ گزرے وقت کی یادیں ساری زندگی کا اثاثہ بن جاتی ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے بچے جو زیادہ شرمیلے اور خاموش طبع ہوتے ہیں اور دوسرے بچوں کے ساتھ جلدی گھلتے ملتے نہیں وہ بھی کزنز کے ساتھ بہت خوش رہتے اور خوب ہلہ گلہ کرتے ہیں۔ بعض بچے جو اکلوتے ہوتے ہیں ان کے لئے بھی کزنز بہن بھائیوں کا متبادل ثابت ہوتے ہیں۔

کزنز کے ساتھ بچے بلاخوف جس قدر چاہیں وقت گزار سکتے اور مختلف کھیلوں اور دوسری سرگرمیوں میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے گھر رات ٹھہر بھی سکتے ہیں۔ اکٹھے پسندیدہ کھیل کھیلنے' مشترکہ پسند کی فلم' ٹیلی ویژن شو یا میچ وغیرہ دیکھتے ہوئے بچے خوشگوار یادیں سمیٹتے اور بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

کزنز اس لئے بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں کہ عام دوست اور کلاس فیلوز میں سے بہت کم ہی ایسے ہوتے ہیں جو ساری زندگی ساتھ نبھاتے ہیں جبکہ کزنز سے آپ کی بنتی یا نہ بنتی ہو وہ ہمیشہ آپ کے خاندان کا حصہ رہتے ہیں اور آپ جب بھی ان سے ملتے ہیں بچپن کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ کزنز ایک دوسرے کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ' خوشی' غمی' کامیابی' ناکامی الغرض ہر طرح کے واقعات کے امین ہوتے ہیں۔ جب کبھی ہم اپنے بچپن کی کوئی فیملی فوٹو دیکھتے ہیں تو کزنز ان میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ کزنز ہمارے بچپن کو اس طرح سمجھتے اور جانتے ہیں کہ کوئی دوسرا کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔

خاندان میں پیش آنے والے اہم واقعات اور ان سے جڑی یادیں بھی کزنز کے ساتھ ہمیں جوڑے رکھتی ہیں۔ بچوں کے لئے ان چیزوں کی انتہائی اہمیت ہوتی ہے اور کزنز کے ساتھ ان یادوں کے بارے میں بات کرنا سب سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ کزنز ایک دوسرے کے رول ماڈل بھی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ایک کزن امتحانات میں ریکارڈ نمبر حاصل کرتا ہے تو دیگر کزنز بھی اس کی طرح یہ کامیابی حاصل کرنے کو اپنی منزل بنا لیتے ہیں اور اس کے لئے زبردست جدوجہد کرتے ہیں۔ جب کبھی کوئی مشکل پیش آتی ہے تو بچوں کو جس طرح کزنز کی ہمدردی اور مدد فائدہ دیتی ہے کسی اور سے نہیں مل سکتی۔

چنانچہ کزنز بچوں کی بہتر نشوونما' انکی شخصیت کے نکھار' خاندان سے ان کے مضبوط تعلق اور زندگی کی حسین یادوں کے لئے بے حد اہمیت رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ گزرے زندگی کے لمحے ہمیشہ کے لئے یادگار بن جاتے ہیں۔

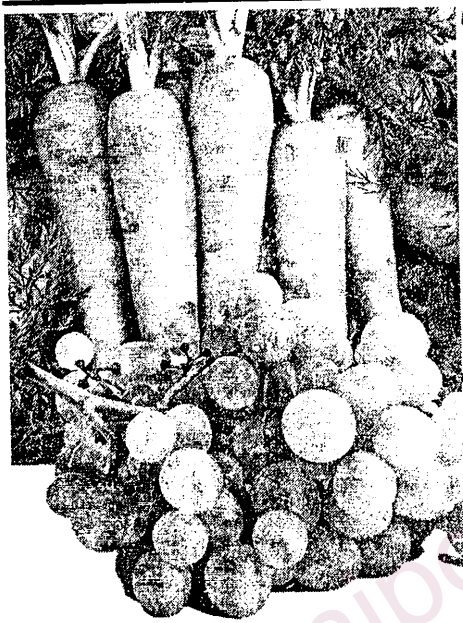

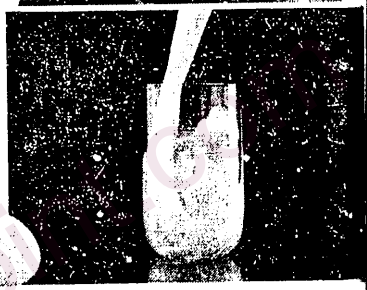

بڑھاپا روکنے والی غذائیں

بدقسمتی سے ہر لمحہ بڑھتے وقت کو واپس کرنا تو ممکن نہیں مگر غذا کے ذریعے جلد کے افعال میں بہتری لاکر جوان نظر آنے میں مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔

حکیم محمد عثمان

عمر میں اضافہ زندگی کا ایک قدرتی حصہ ہے جس سے بچنا ممکن نہیں مگر کیا آپ کو معلوم ہے کہ جو غذا آپ کھاتے ہیں وہ عمر میں اضافے کے اثرات کی روک تھام میں مددگار ثابت ہوتی ہے؟ یعنی جسم کے اندر اور باہر دونوں جگہ؟

جی ہاں واقعی ہماری غذائی عادات بڑھاپے کے اثرات کو جسم پر مرتب ہونے سے روکنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

بدقسمتی سے ہر لمحہ بڑھتے وقت کو واپس کرنا تو ممکن نہیں مگر غذا کے ذریعے جلد کے افعال میں

بہتری لاکر جوان نظر آنے میں مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔

یہاں ایسی بن چند غذاؤں کا ذکر کیا جارہا ہے جو آپ کو بڑھتی عمر میں بھی کم عمر نظر آنے میں مدد فراہم کرتی ہیں۔

گاجریں

یہ سبزی جسم کو بیٹا کیروٹین فراہم کرتی ہے جو کہ جلد کی صحت کے لئے انتہائی ضروری جز ہے۔ جس سے جلد پر عمر بڑھنے سے مرتب ہونے والے اثرات کی رفتار سست ہوجاتی ہے یا یوں کہہ لیں جھریاں نمودار نہیں ہوتیں مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ پورے جسم پر عمر کے اثرات روکنے میں بھی مدد دینے والی سبزی ہے۔ پالک میں شامل بیٹا کیروٹین جلد کو جگمگانے میں بھی مدد دیتا ہے۔

انگور

یہ مزیدار پھل اینٹی آکسائیڈنٹس اور پولی فینولز سے بھرپور ہوتا ہے جو کہ دل کو صحت مند بنانے کے ساتھ ساتھ عمر بڑھنے کے ساتھ جسم کو بھی صحت مند رکھتے ہیں، طبی تحقیقی رپورٹس سے عندیہ ملتا ہے کہ انگور میں موجود پولی فینولز دماغی صحت، آنکھوں کی صحت، آنتوں کی صحت اور دیگر کے لئے بھی فائدہ مند ہے جبکہ یہ خلیات کو بھی صحت مند رکھتے ہیں جو مجموعی صحت کے لئے ضروری ہے۔

تخ ملنگا

تخ ملنگا اومیگا تھری فیٹی ایسڈز، اینٹی آکسائیڈنٹس اور منرلز سے بھرپور ہوتا ہے جو کہ دل کے رد ہم، جلد کی ساخت، مزاج اور یادداشت کے لئے فائدہ مند ہیں۔ یہ جسم کو ایسا فائبر بھی فراہم کرتے ہیں جو غذائی نالی کے افعال بہتر کرنے کے ساتھ ساتھ کولیسٹرول لیول کو متوازن کرتا ہے اور خوراک کی اشتہا بھی کم کرتے ہیں، جس سے موٹاپا طاری نہیں ہوتا اور یاد رہے کہ موٹاپا جلد بڑھاپے کا باعث بنتا ہے۔

مچھلی

چربی والی مچھلی میں اومیگا تھری فیٹی ایسڈز کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے جو کہ جسم اور جلد کا ورم کم کرتے ہیں۔ ہفتے میں 2 یا 3 ٹکڑے کھانا نقصان دہ کولیسٹرول اور ٹرائی گلیسیڈر کی سطح بھی کم کرتا ہے اور ہاں مچھلی کھانے سے جسم میں اومیگا تھری اور اومیگا سکس کا تناسب بھی متوازن رہتا ہے جس کا بگڑنا ورم کا باعث بنتا ہے۔

دودھ

ایک گلاس دودھ روزانہ جسم کو کیلشیم، وٹامن ڈی اور دیگر اجزاء فراہم کرتا ہے، کیلشیم ایسا منرل ہے جو زندگی کے لئے ضروری ہے جو ہڈیاں تو مضبوط بناتا ہے مگر خون، مسلز اور دل کو بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ دودھ میں موجود وٹامن ڈی کیلشیم اور فاسفورس ہمارے جسم کو جذب کرنے میں مدد دیتا ہے، اکٹھے مل کر یہ دونوں ہڈیوں کا حجم برقرار رکھتے ہیں اور عمر بڑھنے سے بڑھنے والا فریکچر کا خطرہ کم کرتے ہیں۔

ٹماٹر

ٹماٹر صحت کے لئے فائدہ مند چیز ہے جو کہ وٹامن اے، وٹامن سی اور فولک ایسڈ سمیت دیگر اجزاء سے بھرپور ہوتا ہے۔ تاہم عمر بڑھنے کے اثرات کی رفتار سست کرنے میں اس میں موجود جز لائیکوپین اہم کردار ادا کرتا ہے۔ لائیکوپین ایسا اینٹی آکسیڈنٹ ہے جو جلد کو سورج کی شعاعوں کے اثرات سے تحفظ دیتا ہے جبکہ یہ شریانوں کی صحت

اور وبائی امراض سے بھی تحفظ دیتا ہے۔

شہد

شہد قدرتی طور پر جراثیم کش ہوتا ہے جبکہ اس میں اینٹی آکسیڈنٹس اور متعدد دیگر اجزا موجود ہوتے ہیں تو یہ حیران کن نہیں کہ یہ جلد کے لئے بہت زیادہ فائدہ مند کیوں سمجھا جاتا ہے۔ اب اسے فیس ماسک کی شکل میں استعمال کیا جائے یا خام حالت میں لگایا جائے یہ چہرے کا ورم کم کرنے کے ساتھ ساتھ کیل مہاسوں کا علاج کرتا ہے جبکہ خشک جلد کو نمی فراہم کرتا ہے اسے کھانا بھی ایک اچھا خیال ہے خصوصاً اگر آپ دیگر میٹھی اشیاء کو بدل کر ان کی جگہ شہد کو دیدیں۔

بلیوبیریز

یہ فلیونوئڈز اینٹی آکسیڈنٹس سے بھرپور ہوتا ہے جو کہ جسم میں ورم اور مضر اجزاء کے خلاف جدوجہد کرتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق موٹاپے ذیابیطس اور خون کی شریانوں کے امراض جیسی میٹابولک بیماریاں جسم میں ورم کے باعث لاحق ہوتی ہیں تو بلیو بیریز کا استعمال اس ورم کو قابو میں رکھنے میں مدد دیتا ہے جبکہ میٹابولزم اپنا کام ہموار انداز سے جاری رکھتا ہے۔

سبز چائے

یہ گرم مشروب میٹابولزم کی کارکردگی بہتر بنانے کے لئے فائدہ مند ہے جس کی وجہ اس میں موجود ای جی سی جی نامی جز ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق سبز چائے میں موجود پولی فینول اور ای جی سی جی اسے دیگر اقسام کی چائے کے مقابلے میں جسمانی ورم یا سوجن کی روک تھام کے لئے زیادہ موثر بناتے ہیں۔ اسی طرح سبز چائے جسمانی وزن کو کنٹرول کرنے میں بھی مدد دیتی ہے جبکہ بلڈشوگر بھی کنٹرول میں رہتا ہے۔ پولی فینول جلد میں پائے جانے والے اہم جز کولیجن کا بھی تحفظ کرتا ہے جس سے بڑھتی عمر کے آثار کو کسی حد تک واپس دھکیلا جاسکتا ہے۔

ڈارک چاکلیٹ

چاکلیٹ کس کو پسند نہیں ہوتی تاہم کیا آپ کو معلوم ہے کہ ڈارک چاکلیٹ فلیونوئڈز اور اینٹی آکسائیڈنٹس سے بھرپور ہوتی ہے اور یہ دونوں خون کی شریانوں میں لوتھڑے بننے اور سوجن کی روک تھام میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مختلف طبی تحقیقی رپورٹس کے مطابق جسمانی سوجن بڑھاپے اور اس سے متعلقہ امراض کا باعث بنتی ہے لہٰذا سوجن پر قابو پانے والی غذا طویل زندگی کی کنجی ثابت ہوسکتی ہے۔

قدر

ایک فقیر نے مالدار آدمی سے کہا: اگر مجھے تمہارے گھر میں موت آجائے، تو تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟
مالدار آدمی: تمہیں کفن دیکر دفنا دوں گا۔
فقیر بولا: ابھی میں زندہ ہوں، مجھے پہننے کے لیے کپڑے دے دو اور جب مرجاؤں تو بغیر کفن کے مجھے دفنا دینا۔
یہ ہم لوگوں میں سے بہت سے افراد کی داستان ہے کہ جب تک ہم زندہ ہیں ایک دوسرے کی قدر نہیں کرتے لیکن مرنے کے بعد ایک دوسرے کے لئے آگے بڑھ بڑھ کر نیکیاں کرنے لگتے ہیں۔ اگر قدر کرنا ہے تو زندگی میں کرو۔
(مرسلہ: ناجیہ خالد۔ راولپنڈی)

ہلدی

ہلدی میں موجود اینٹی آکسیڈنٹ ورم کیخلاف جادوئی اثر رکھتا ہے جبکہ یہ میٹابولزم کی کارکردگی کو نوجوانی جیسا رکھنے میں بھی مدد دینے والا مصالحہ ہے اور ہاں یہ دماغی تنزلی سے بھی تحفظ دیتی ہے جبکہ جگر کو نقصان پہنچنے' امراض قلب اور جوڑوں کے درد کیخلاف بھی مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

چقندر

چقندر کا استعمال برصغیر میں بہت عام ہے سلاد سے لے کر اس کا جوس کافی پسند کیا جاتا ہے مگر کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کا ایک جز بیٹھین سے بھرپور ہوتا ہے جو سوجن پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اس طرح یہ متعدد جسمانی امراض سے تحفظ فراہم کرسکتا ہے جبکہ چہرے کو جگمگا کر بڑھاپے کے اثرات کو بھی دُور کرتا ہے۔

خام کوکو

خام کوکو اس لئے بہترین سمجھا جاتا ہے کیونکہ ایک بہت طاقتور اینٹی آکسیڈنٹ RESVERATROL موجود ہوتا ہے جو کہ سورج سے متاثر جلد کی مرمت کرتا ہے اور قبل از وقت بڑھاپے کی نشانیوں کی روک تھام کرتا ہے۔کوکو میگنیشم کے حصول کا بڑا ذریعہ ہے جو کہ جلدی خارش کا امکان کم کرتا ہے۔

انڈے

انڈے پروٹین سے بھرپور ہوتے ہیں جو کہ چربی سے پاک مسلز بنانے میں مدد دیتے ہیں جس سے میٹابولزم کی کارکردگی متاثر نہیں ہوتی۔ اس میں وٹامن ڈی بھی ہوتا ہے جو کہ مجموعی صحت کو بہتر اور ورم کش ہوتا ہے جبکہ یہ چربی گھلانے والے جز کولین سے بھی بھرپور غذا ہے۔

دلیہ

سُست روی سے ہضم ہونے والے کاربوہائیڈریٹ جیسے جو کا دلیہ بلڈشوگر کو مستحکم رکھنے کیلئے بہتر ہوتا ہے جبکہ اس میں موجود وٹامن بی سکس مزاج پر خوشگوار اثرات مرتب کرتا ہے۔اسی طرح جو لوگ دلیہ کھانے کو عادت بنا لیتے ہیں ان میں فالج اور ہارٹ اٹیک کا باعث بننے والے نقصان دہ کولیسٹرول کی سطح میں سات فیصد تک کمی آتی ہے۔

مالٹے

2 بڑی وجوہات مالٹوں کو صحت کے لئے فائدہ مند بناتی ہیں۔ ایک تو وٹامن سی کی موجودگی اور پانی کی مقدار بہت ہی اہم ہے' پانی جلد کو اندر سے نمی فراہم کر کے کیل مہاسوں سے بچاتا ہے جبکہ وٹامن سی کولیکن بننے میں اہم کردار ادا کرتا ہے یہ جز جلد کو ہموار رکھنے میں مدد دیتا ہے اور جھریوں کی روک تھام کرتا ہے۔

زیتون کا تیل

زیتون کا تیل عمر بڑھنے کے ساتھ لاحق ہونے والی متعدد عام بیماریوں کی روک تھام میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔اس کا استعمال بلڈ پریشر کم کرتا ہے امراض قلب کا خطرہ کم کرتا ہے۔ میٹابولک سینڈروم کی روک تھام کرتا ہے یعنی ذیابیطس اور خون کی شریانوں کے امراض سے تحفظ دیتا ہے اور یہ کینسر کیخلاف جدوجہد کے لئے موثر ثابت ہوتا ہے۔ زیتون کا تیل جلد کو جوان رکھنے کے لئے بھی فائدہ مند ہوتا ہے۔ جانوروں پر ہونے والی طبی تحقیق کے مطابق یہ جلد کے لئے ورم کی روک تھام کرتا ہے اور سورج کی شعاعوں سے ہونے والے نقصان سے بھی بچا سکتا ہے۔

کتاب زیست کا ایک یادگار باب

ایم بی انجم

میرا گروپ لاہور سے چند کلومیٹر دُور گاؤں چرڑ پنڈ کی سٹڈی کر رہا تھا۔ وہاں کے باسیوں نے جب انکشاف کیا کہ گردونواح کی ہزاروں ایکڑ زمین پاکستان آرمی نے رہائشی سکیم بنانے کیلئے قیمتاً حاصل کرلی ہے تو ہمیں بہت عجیب لگا کیونکہ اتنی دُور فوجی چھاؤنی کی تعمیر تو سمجھ میں آتی تھی مگر رہائشی بستی بسائے جانے کا تصور محال تھا۔

ایک انسان کی جدوجہد اور کامیابی کی جستجو کی کہانی

سول سروس اکیڈمی لاہور وطن عزیز پاکستان میں مقابلے کے سب سے بڑے امتحان، سنٹرل سپیریئر سروسز (سی ایس ایس) کے ذریعے اعلیٰ ترین ملازمتوں کے لئے منتخب ہونے والے افسروں کی قبل از آغاز ملازمت ٹریننگ کا ویسا ہی ادارہ ہے جیسا کہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول آرمی کے افسروں کی تربیت گاہ ہے۔ یہ لاہور میں والٹن کے علاقے میں واقع ہے۔ جب میرا یعنی 1979ء کا بیچ وہاں ٹریننگ کے لئے پہنچا اس وقت زیر تربیت افسروں (جنہیں عرف عام میں پروبیشنرز کہا جاتا

ہے) کی رہائش کے لئے دو ہاسٹل تھے۔ ایک اکیڈمی کے احاطے یعنی والٹن میں اور دوسرا اپر مال روڈ پر زیر تربیت خواتین افسروں کی رہائش بھی اپر مال روڈ والے ہاسٹل کے ایک حصے میں تھی۔ اپنے محل وقوع اور خوبصورتی کے لحاظ سے یہ ہاسٹل والٹن والے ہاسٹل سے یقیناً بہتر تھا' تاہم اس کا ایک کمزور پہلو یہ تھا کہ اس ہاسٹل کے مکینوں کو روزانہ بذریعہ اکیڈمی بس والٹن جانا اور آنا پڑتا تھا۔ میں اسے خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ مجھے بھی رہائش اپر مال روڈ والے ہاسٹل میں الاٹ ہوگئی۔ دونی چند سٹریٹ کے غریبانہ سے ماحول میں سات برس گزار کر سول سروسز اکیڈمی کے ہاسٹل میں منتقل ہونا گویا ایک نئی دنیا میں داخل ہونے کے مترادف تھا۔ رنگا رنگ پھولوں اور مختلف اقسام کے پودوں سے مزین پُرفضا ماحول' صاف ستھرے کمرے' ٹی وی اور ٹیلی فون کی سہولت' چائے اور کافی ہمہ وقت دستیاب' کیرم بورڈ' تاش' شطرنج' بیڈمنٹن اور لان ٹینس کھیلنے کی سہولت اور پھر ملک بھر سے آئے ہوئے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین و فطین ساتھیوں کی سنگت..... اتنی ساری سہولیات میسر ہونے کے باوجود یہاں لاپروائی' تساہل پسندی اور بے فکری کی قطعاً گنجائش نہیں تھی کیونکہ ہمیں یہاں منیر نیازی کے اس شعر جیسی صورتحال کا سامنا تھا۔

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا

دس بارہ ماہ کی اکیڈمی ٹریننگ کا ایک دشوار گزار اور اہم مرحلہ ابھی طے ہونا باقی تھا۔ اہم اس لئے کہ سی ایس ایس کا امتحان بہترین انداز میں پاس کر کے یہاں تک پہنچنے والے سبھی زیر تربیت افسروں کو ابھی تک ان کے محکمے الاٹ نہیں ہوئے تھے۔ محکموں کا تعین اکیڈمی ٹریننگ کے مکمل ہونے پر کیا جانا تھا اور ٹریننگ کے اختتام پر تمام مضامین کے باقاعدہ ایک تحریری امتحان اور انٹرویو سے گزرنا بھی باقی تھا اور اس امتحان اور انٹرویو کے مارکس کی بھی خاصی اہمیت تھی۔

دراصل 1974ء سے قبل اکیڈمی ٹریننگ ضرور ہوتی تھی تاہم اس کے اختتام پر کسی تحریری امتحان یا انٹرویو کا وجود نہیں تھا اس لئے کہ اکیڈمی ٹریننگ شروع ہونے سے قبل سی ایس ایس کے نتائج کی بنا پر ہی منتخب افسروں کو ان کی پوزیشنز اور چوائسز کے مطابق محکمے الاٹ کردیئے جاتے تھے۔ ممکن ہے اسی وجہ سے وہ ٹریننگ کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیتے ہوں۔ چنانچہ 1974ء میں اکیڈمی ٹریننگ کو حقیقی معنوں میں فعال بنانے کے لئے متعلقہ قواعد وضوابط میں تبدیلی کی گئی اور اس کو کامن ٹریننگ پروگرام کا نام دے دیا گیا۔ اس تبدیلی کے مطابق مقابلے کے اس امتحان کی بنا پر منتخب کئے جانے والے تمام افسر سول سروس اکیڈمی میں ایک ساتھ تربیت حاصل کرنے کے پابند تھے اور ان کے سروں پر یہ تلوار لٹکا دی گئی کہ ٹریننگ اور انٹرویو کے مارکس کو پہلے امتحان میں حاصل کردہ نمبروں میں ملا کر زیر تربیت افسروں کے محکموں کا تعین کیا جائے گا۔ گویا یک نہ شد دو شد۔ بنیادی امتحان کے بعد انٹرویو کے تین سو نمبروں میں سے بہت کچھ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے ڈائریکٹر جنرل کی صوابدید پر تھا اور اب یہاں وہی صوابدیدی اختیار ڈائریکٹر جنرل سول سروسز اکیڈمی کو سونپ دیا گیا۔ یاد رہے کہ ایسے صوابدیدی اختیارات میں ذاتی پسند و ناپسند بہت رول پلے کرتی ہے جو یقیناً

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم الشان ایمان افروز پیشکش

طبِ نبویؐ نمبر

جسمانی اور روحانی امراض کا نبویؐ طریق علاج

☆ رسول اکرمؐ نے حسب ضرورت خود بھی دوا استعمال فرمائی اور آپؐ نے بعض بیماریوں کا علاج بھی تجویز فرمایا۔

☆ رسول اللہؐ کی بتائی ہوئی غذائیں، مشروبات، پرہیز اور جڑی بوٹیاں۔

☆ دل کی بیماریوں، بخار، پیچش، قبض، آشوب چشم، پھوڑے پھنسیاں، درد سر اور شقیقہ، کھجلی اور بہت سی بیماریوں کا نبویؐ طریقہ علاج۔

☆ مرگی، جادو، نظر بد، جلدی امراض، بے چینی، بے خوابی اور دیگر امراض کا روحانی علاج۔

سیارہ ڈائجسٹ 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن، لاہور۔

فون: 37245412

میرٹ پر اثرانداز ہوتی ہے۔ قریباً ایک سال کی ٹریننگ کے اس دورانیہ میں پروبیشنرز کو اکنامکس، پبلک ایڈمنسٹریشن، اسلامک سٹڈیز اور قانون جیسے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ انہیں گروپ ڈسکشنز میں حصہ لینا تھا، ولیج سٹڈی ٹورز اور ڈسٹرکٹ سٹڈی ٹورز پر رپورٹس مرتب کرنا تھیں۔ بک ریویوز اور دیئے گئے موضوعات پر ایم فل ٹائپ مقالہ جات لکھنے تھے۔ نیز اکیڈمی سے فارغ ہو کر تین ماہ کے لئے آرمی اٹیچمنٹ کے مرحلے سے بھی گزرنا تھا۔ اکیڈمی کے سربراہ ڈائریکٹر جنرل عنایت اللہ صاحب تھے جو اپنے سے زیادہ اپنی بیگم معروف سماجی و سیاسی شخصیت عطیہ عنایت اللہ کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے۔ بہت اچھے منتظم اور سخت گیر قسم کے باس تھے۔ شاید یہ ان کے پروبیشنرز پر رعب دعب قائم رکھنے کا طریقہ تھا کہ بعض اوقات ایسی بات کر جاتے تھے سامنے والا سوچتا رہ جاتا کہ اس کا کیا جواب دے اور کیا جواب دینا مناسب بھی ہے کہ نہیں۔ مثلاً ہمارے بیچ میں چار پروبیشنرز ایسے تھے جن کے ناموں کے آخر میں لفظ بخاری آتا تھا۔ ایک روز شفیق بخاری کو کہنے لگے "یہ آپ نے نام کے آخر میں بخاری کا لاحقہ کیوں لگا رکھا ہے، کیا آپ کو بخار رہتا ہے؟" اب آپ ہی بتائیے کہ شفیق بخاری اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ میرے روم میٹ افتخار احمد کی عادت تھی کہ وہ جب بھی ڈی جی صاحب سے بات کرتے تو قدرے آگے کو جھک جاتے۔ ایک دن ایسے ہی موقع پر عنایت اللہ صاحب کہنے لگے "افتخار اتنا جھک کر بات نہ کیا کریں کہیں آپ کی کمر ہی نہ ٹوٹ جائے۔" ان کی اس عادت کی وجہ سے زیرتربیت افسروں کی اکثریت ان کا سامنا کرنے سے کتراتی تھی۔ تاہم ٹریننگ کا ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب دن میں ایک بار زیادہ تر پروبیشنرز ان کے قریب تر ہونے کو ترجیح دینے لگے اور وہ مرحلہ تھا صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق کی جانب سے ملک کے تمام سرکاری دفاتر میں نماز کی ادائیگی لازمی قرار دینے کا۔ چنانچہ نماز ظہر اکیڈمی کی مسجد میں باجماعت ادا کرتے وقت افسروں میں سے اکثر پہلی صف میں ڈی جی صاحب کے آس پاس کھڑے ہونے کی کوشش کرتے تھے تاکہ باس کو پتا چل سکے کہ وہ حکومتی احکامات کی پوری طرح پاسداری کر رہے ہیں۔ اور مزے کی بات یہ کہ ان میں سے زیادہ تر میرے جیسے تھے جنہوں نے ان احکامات سے پہلے کبھی مسجد کا رُخ نہیں کیا تھا۔

اکیڈمی سٹاف میں سرکردہ نام جناب محمد صادق کا تھا جو آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے ایک سینئر افسر تھے اور دوسرے جناب فریدالدین احمد تھے جن کا تعلق ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ سے تھا۔ وہ ایک نامور بیوروکریٹ فیملی سے تھے۔ ٹریننگ کے دوران ڈسٹرکٹ سٹڈی ٹور پر فیصل آباد پہنچے تو انہوں نے وہاں کی میونسپل کمیٹی کے گیٹ پر درج باب نور کے الفاظ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ نور محمد ان کے دادا کا نام تھا جو انگریزوں کے دور میں ضلع فیصل آباد کے ڈپٹی کمشنر رہے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے اور پھر فریدالدین احمد کی صورت میں ان کے پوتے، تینوں کو فیصل آباد ضلع کے ڈپٹی کمشنر ہونے کا منفرد اعزاز حاصل ہوا۔ دوران تربیت مختلف مضامین پڑھانے کے لئے زیادہ تر وزیٹنگ لیکچررز ہی کا بندوبست رہا جن میں اب مجھے پروفیسر نسیم ذکریا اور منصر میر ہی کے نام یاد آسکے ہیں۔ ڈائریکٹر جنرل

Pakistanipoint.com

عنایت اللہ صاحب کا نام پروبیشنرز کو کوئی مضمون پڑھانے والوں میں شامل نہیں تھا تاہم ٹریننگ شروع ہونے کے ٹھیک ساتویں دن انہوں نے تمام زیرتربیت افسروں اور پورے سٹاف کو صبح آٹھ بجے اکیڈمی کے سب سے بڑے ہال میں جمع کرکے روسٹرم سنبھال لیا۔ دو اڑھائی گھنٹے کے مسلسل لیکچر کے بعد کوئی وقفہ کئے بغیر حاضرین سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کرلیا۔ جس کے دوران ایک موقع پر بڑی دلچسپ صورتحال پیدا ہوگئی۔ ملک خادم حسین نامی ایک پروبیشنرز سے کئے گئے ایک سوال کے جواب کے دوران ڈی جی صاحب نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا ''نو ملک نو' مجھے آپ کے جواب سے بہت مایوسی ہوئی ہے' پلیز سٹ ڈاؤن۔'' جس پر ملک صاحب نے بیٹھنے سے انکاری ہوتے ہوئے ڈی جی صاحب کو مخاطب کرکے کہا ''سر اگر میں آپ کی جگہ ڈی جی ہوتا اور آپ میری طرح ایک پروبیشنر ہوتے تو ایسی صورتحال میں' میں بھی آپ کو یہی کہتا ''نو عنایت اللہ نو' مجھے آپ کے جواب سے بہت مایوسی ہوئی ہے۔ پلیز سٹ ڈاؤن۔'' اس پر ڈی جی صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور ہال میں موجود تمام حاضرین ملک صاحب کی اس جرأت انداز پر ششدر رہ گئے۔ ڈی جی صاحب بھی زیرک اور کایاں شخص تھے صورتحال خراب ہوتی دیکھ کر بات کو ہنس کر ٹال گئے۔ ملک خادم حسین کے ڈی جی صاحب کو یوں مذاق کا نشانہ بنانے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس بیچ میں ملک صاحب کی پوزیشن آخری نمبروں پر تھی اور وہ بخوبی جانتے تھے کہ ترجیحات کے لحاظ سے انہیں سب سے کم درجے کی سروس یعنی آفس مینجمنٹ گروپ ہی الاٹ ہونا ہے اس لئے ڈی جی صاحب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور ڈی جی صاحب کو یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ کسی زیرتربیت افسر کو سروس سے نکالنے کی سفارش کرسکیں۔ بہرحال غیرمتوقع طور پر صبح آٹھ بجے سے شروع ہونے والا عنایت اللہ صاحب کا لیکچر اور سوال و جواب کا سلسلہ بغیر کسی وقفے کے ڈیڑھ بجے تک جاری رہا اور جب دوپہر کے کھانے اور نماز ظہر کے لئے حاضرین کو ہال سے نکلنے کی اجازت ملی تو پتا چلا کہ گزشتہ رات سابق وزیراعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا تھا اور ڈی جی صاحب نے کسی غیرمتوقع ابتر صورتحال کے پیش نظر اکیڈمی کے سبھی لوگوں کو دوپہر تک ایک جگہ باندھ کر رکھنا مناسب سمجھا۔ ان دنوں میں بھی بھٹو صاحب کی طلسماتی شخصیت کا اسیر تھا اس لئے اس خبر سے اتنا دل برداشتہ ہوا کہ 4 اپریل 1979ء کے اس دن کی باقی کلاسز سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے رکشہ لے کر اپنے ہاسٹل پہنچ گیا اور کمرہ اندر سے بند کرکے تادیر زاروقطار روتا رہا۔

عشق کو دار پہ کھینچا تو کئی زہرہ جمال
اپنی تنہائی پہ روتے تھے صنم خانوں میں

اکیڈمی کے ابتدائی دنوں میں سی ایس ایس کے امتحان میں اپنی کارکردگی کی تفصیلات کا پتا چلا تو یہ امر خوش کن تھا کہ گیارہ سو نمبروں کے تحریری امتحان میں حاصل کردہ مارکس کے بل بوتے پر میں پاکستان کے پہلے پانچ خوش نصیبوں میں شامل تھا مگر یہ بات انتہائی مایوس کن تھی کہ لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمان کی متعصب ذہنیت کے پیش نظر مجھے انٹرویو کے تین سو نمبروں میں سے ایک سو بیس یعنی محض پاسنگ مارکس دیئے گئے۔ دوسری مایوس کن

خبر یہ تھی کہ ہمارے اس بیچ کے لئے پولیس گروپ کی ایک بھی سیٹ نہیں تھی جبکہ اس سے قبل ہر بیچ کے لئے پولیس کی اوسطاً دس آسامیاں ہوتی تھیں۔ یوں تو اس کمی کے باعث ہر ایک پروبیشنر کا متاثر ہونا یقینی تھا تاہم مجھ پر اس کا براہ راست اثر یوں آتا تھا کہ ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ کے بعد پولیس گروپ میری دوسری چوائس تھی اور اس بیچ کے لئے پولیس گروپ کی چند سیٹیں بھی ہوتیں تو میری اٹھارہویں پوزیشن کے پیش نظر میرے پولیس گروپ میں فال کرنے کے امکانات خاصے روشن تھے۔ اس ضمن میں پروبیشنرز کے اصرار پر ڈی جی صاحب کی جانب سے یہ اطمینان دلایا گیا کہ وہ اس بیچ کے لئے پولیس گروپ کی چند سیٹوں کے حصول کی کوشش ضرور کریں گے۔ چنانچہ اس کوشش کے طور پر اس وقت کے معروف انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کے ایک نامی گرامی کالم نگار جناب محمد ادریس کے توسط سے اس مسئلے پر دو تین کالم لکھوا کر حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کروائی گئی۔

اکیڈمی میں وقت گزرنے کے ساتھ جب اپنے سبھی بیچ میٹس کے ساتھ تفصیلی تعارف ہوا تو سی ایس ایس کا امتحان پاس کرکے حکوت پاکستان کے مختلف شعبوں میں اعلیٰ ترین ملازمتوں پر فائز ہونے والے افسروں کا جو معیار میرے ذہن میں تھا اسے خاصا جھٹکا لگا۔ یقین مانیئے ڈیڑھ سو کے اس گروپ میں سے مجھ سمیت دو تہائی اکثریت پر انگریزی کی اصطلاح ''ایوریج'' ہی صادق آتی تھی اور میرے مطابق اس کی وجہ ملازمتوں میں صوبوں کے لئے کوٹہ سسٹم کا وجود ہے۔ اپنی تعلیمی استعداد' ذہانت' پُراعتمادی اور عادات و خصائل کی بنیاد پر جن ساتھیوں نے مجھے متاثر کیا ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ صوبہ سندھ سے محمد علی صدیقی اور امتیاز احمد بارک زئی' صوبہ سرحد جو اب کے پی کے کہلاتا ہے سے فرید الدین خان' اسد علی جان اور کامران قریشی اور پنجاب سے کامران لاشاری' عمران افضل چیمہ' جلیل عباس جیلانی' چودھری تنویر احمد' تیمور عظمت عثمان' مبشریٰ نگہت باجوہ' ناصر محمود کھوسہ اور خورشید بخاری شامل تھے۔ ٹریننگ کی بیرونی سرگرمیوں کے طور پر پورے بیچ کو فیصل آباد کے ٹور پر لے جایا گیا جہاں چناب کلب اور میونسپل کمیٹی کے ہال میں منعقد کی جانے والی دو تقریبات اب تک ذہن میں محفوظ ہیں۔ پورے بیچ کو پانچ پانچ کے گروپوں میں تقسیم کرکے لاہور کے قریبی دیہات میں ولیج سٹڈی ٹور کیلئے بھیجا گیا۔ میرا گروپ جس گاؤں کی سٹڈی کررہا تھا وہ لاہور شہر کے مشرقی جانب چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا اور نام تھا اسکا چرڑ پنڈ۔ وہاں کے باسیوں سے گپ شپ کے دوران جب انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ اس گاؤں کے گردونواح کی ہزاروں ایکڑ زمین پاکستان آرمی نے ایک رہائشی سکیم بنانے کے لئے قیمتاً حاصل کرلی ہے تو ہمیں بہت عجیب لگا کیونکہ لاہور شہر سے اتنی دور کسی فوجی چھاؤنی کی تعمیر تو سمجھ میں آتی تھی مگر رہائشی بستی بسائے جانے کا تصور محال تھا۔

قارئین کرام' آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اب وہ چرڑ پنڈ اسی نام سے ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی لاہور کے زیڈ بلاک کا حصہ ہے اور ڈی ایچ اے جیسی پوش رہائشی سوسائٹی کے مختلف فیز اور

وہ جو مینارۂ نور تھے

صاحب کرامات ۔ باعمل ۔ روشن ضمیر ۔ بلند کردار ۔ فخرِ روزگار

عظیم ہستیوں کی روح پرور داستانیں

سیّارہ ڈائجسٹ

کا عظیم الشّان

قیمت: 800

اولیائے کرام نمبر

کا نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

عمدہ طباعت ۔ ضخامت ۲۰۰۰ صفحات ۔ چار جلدوں پر مشتمل دیدہ زیب پیکنگ

قارئین کرام براہ راست، بذریعہ منی آرڈر یا وی پی منگوا سکتے ہیں

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 37245412

بلاک اس کے گرداگرد کوسوں تک پھیلے ہوئے ہیں جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں ڈسٹرکٹ سٹڈی ٹورز بھی ٹریننگ کا ایک حصہ تھے۔ اس کے لئے زیرتربیت افسروں کو دس دس کے گروپوں کی صورت میں پنجاب کے مختلف اضلاع میں بھیج دیا گیا۔ جہاں انہیں ایک ماہ کا عرصہ گزارنا اور اس ضلع کے تمام شعبوں سے متعلق ایک سیر حاصل رپورٹ مرتب کرنا تھی۔ میرے گروپ کے حصے میں ڈسٹرکٹ فیصل آباد آیا۔ میرے ساتھیوں میں سے اب مجھے فیاض احمد لغاری اور کامران قریشی کے نام ہی یاد رہ گئے ہیں۔

ہر گروپ اس مقصد کے لئے متعلقہ ضلع کے ڈپٹی کمشنر کا مہمان تھا۔ فیصل آباد کے ڈپٹی کمشنر نے ہمیں اپنے ایک اسسٹنٹ کمشنر کے سپرد کردیا۔ اتفاق سے دونوں ہی پی سی ایس افسر تھے۔ چنانچہ اے سی صاحب نے ہمیں کھانا پکانے کے لئے ایک باورچی اور سفر کے لئے ایک پرانے سے ماڈل کی جیپ عنایت کردی اور رہائش کے لئے ایک ایسا نوتعمیر شدہ ریسٹ ہاؤس الاٹ کردیا جس میں چھت والے پنکھوں کی پروژن ہی نہیں تھی اور ایئر کنڈیشنرز ابھی نصب ہونے باقی تھے۔ جون جولائی کے مہینوں میں درجہ حرارت 45 سے 50 ڈگری کے درمیان تسلسل پکڑے ہوئے تھا۔ ہماری تو دو چار روز ہی میں حالت خراب ہوگئی۔

ڈی سی صاحب کو صورتحال سے آگاہ کیا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ اچھا کچھ کرتے ہیں چونکہ ڈسٹرکٹ فیصل آباد ان دنوں سرگودھا ڈویژن کا حصہ تھا اس لئے تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق ایک روز ہم اس مسئلے کے حل کے لیے کمشنر سرگودھا ڈویژن کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ وہ چونکہ ایک سی ایس ایس افسر تھے اس لئے انہوں نے اپنی برادری کے لئے کم از کم ریسٹ ہاؤس میں پیڈسٹل فینز کا بندوبست کروادیا۔ بہرحال ڈسٹرکٹ سٹڈی ٹور کے ایک ماہ کا یہ عرصہ ٹریننگ کا مشکل ترین مرحلہ ثابت ہوا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے دبے پاؤں گزرتا رہا۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ یونہی کلاسز اٹینڈ کرتے گروپ مباحثوں میں حصہ لیتے مقالہ جات اور بک ریویوز لکھتے' ڈسٹرکٹ اور ویلج سٹڈی ٹورز کی رپورٹس مرتب کرتے' نماظہر باقاعدگی سے باجماعت ادا کرتے' اپنے ساتھی پروبیشنرز سے تعلقات اور دوستوں کے بندھن استوار کرتے اور ڈی جی صاحب کی نظروں میں اچھا بننے کی کوشش کرتے ہوئے آٹھ ماہ کی ٹریننگ کا یہ وافر حصہ اس تحریری امتحان پر منتج ہوا جس کے امتحانی مرکز کے طور پر مجاز اتھارٹی نے اکیڈمی نہیں بلکہ ایم اے او کالج کا انتخاب کیا تھا۔ تاہم ٹریننگ کا ایک اور مرحلہ آرمی اٹچمنٹ کی صورت میں ابھی باقی تھا۔ اس کے لئے ہر زیرتربیت افسر کو تین ماہ کا عرصہ بری فوج کی ایک رجمنٹ کے ساتھ گزارنا تھا۔ انگریزی کی اصطلاح اٹچمنٹ کے ڈکشنری میں معنی دیکھے تو وہ تھے منسلک ہونا' وابستگی' محبت' پیار' انس' اب پتا نہیں ہم اگلے تین ماہ کے لئے افواج پاکستان سے منسلک ہونے جارہے تھے یا ہمیں اپنے فوجی بھائیوں سے پیار' محبت اور انس ہونے والا تھا۔

(جاری ہے)

وہ کون تھی؟

ثروت چوہدری

پھر..... ایک روز ..... وہ مجھے مل گئی۔ وہ جسے میں نے دیوانہ وار تلاش کیا تھا۔ مجھے اپنے ہی گھر میں مل گئی۔ وہ مظلوم عورت' دُکھ اور مجبوری کی داستان' وفا کی منہ بولتی تصویر..... میری بیوی تھی۔

ایک شخص کی کہانی جسے اجنبی خاتون نے آئینہ دکھادیا تھا

رات کے دو بجے تھے اور نائٹ کلب اپنے پورے شباب پر تھا۔ جام پر جام انڈیلے جا رہے تھے۔ آرکسٹرا تیز ترین دُھن پیش کر رہا تھا اور چکنے فرش پر نیم عریاں جوڑے تھرک رہے تھے۔ ایسے میں محفل سے اُٹھ جانا کس کافر کو گوارا تھا۔ لیکن آج طبیعت صبح سے بوجھل تھی اور نیند کی زیادتی کی وجہ سے میں نے اُٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ باہر نکلتے ہی سردی کا احساس شدید ہو گیا۔ مفلر کو گردن کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر ٹھنڈ سے سکڑتے ہوئے کار نکالی اور تھوڑی دیر تک شیشے چڑھا کر جسم کو گرم کرنے

کے لیے سگریٹ پی کر میں نے کار سٹارٹ کر دی۔ کار کے سٹارٹ ہوتے ہی خیالات کی تیز رو ذہن میں ادھر سے اُدھر دوڑنے لگی۔ سنسان سڑک ہو اور رات کا وقت تو ویسے بھی ذہن کو خوف سے بچانے کے لیے ادھر اُدھر کی سوچیں بہترین ذریعہ ہوتی ہیں۔ مجھے اپنے معصوم بچے کا خیال آیا جو اس وقت محوِ خواب ہوگا۔ مجھے اس سے بہت پیار ہے۔ وہ میری جائیداد کا مالک ہے۔ وہ میرا جانشین ہے۔ مجھے احساس ہے کہ جس وقت میں کوڑی کوڑی کا محتاج تھا تو مجھے اپنی بیوی سے بھی پیار تھا اور بچے سے بھی۔ کیونکہ یہی میرا سرمایہ حیات تھے۔ میری بیوی اَن پڑھ ہے لیکن اس نے ہر طرح میرا حوصلہ بڑھایا۔ میرے لیے اپنا سب کچھ جو اُسے جہیز میں ملا تھا' بیچ ڈالا اور جب خدا نے میرے دن پھیر دیے تو..... تو..... مجھے محسوس ہوا کہ گھر تو صرف غریب آدمی کے لیے باعث تسکین ہوتا ہے۔ امیر آدمی کے لیے باہر کی دنیا میں بہت کشش موجود ہے۔ ساری آسائشیں پیسے کے سامنے سر جھکا دیتی ہیں۔ پھر میرے دوست کلبوں میں جاتے تھے۔ شرابیں پیتے تھے اور مجھے بودم کہتے تھے۔ بھلا یہ مجھے کس طرح گوارا تھا کہ میں سوسائٹی کا ایک اعلیٰ نمائندہ نہ کہلاؤں۔ میں نے گرینڈ کلب جوائن کر لیا اور پھر گھر سے دُور ہوتا چلا گیا۔ میں رات کو ایک ایک بجے واپس آتا تو میری جاہل بیوی جاگ رہی ہوتی۔ مجھے اس کا میری راہ دیکھتے ہوئے جاگنا کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس لیے میں نے اسے سختی سے منع کر دیا کہ وہ بلاوجہ اپنی محبت کا ڈھونگ نہ رچایا کرے اور وہ بیچاری اس وقت..... اگر جاگتی بھی ہوتی تو چپ چاپ پڑی رہتی۔

میرا اور میرے بچے کا معاملہ بھی خوب ہے۔ صبح جب وہ جاگتا ہے۔ تو میں سویا ہوتا ہوں اور جب میں رات کو تھکن سے چور سونے کے لیے گھر آتا ہوں تو وہ سو رہا ہوتا ہے۔ شب و روز یونہی گزر رہے ہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی بند آنکھیں دیکھ لیتے ہیں اور بس.....

نہ جانے کیوں مجھے اس احساس کے باوجود کہ میں دونوں پر ظلم کر رہا ہوں' اپنا رویہ بدلنے کا خیال تک نہیں آیا۔ اس لیے کہ میں نے غربت کے وہ دن دیکھے ہیں کہ جنہوں نے آج مجھے ظالم بنا دیا ہے میں مجبور ہو چکا ہوں' میں پوری طرح اپنی دولت کا مزا لوٹ لینا چاہتا ہوں۔ میں عیش کی زندگی کو بھرپور طریقے پر اپنانا چاہتا ہوں اور یہ بیوی بچہ وغیرہ اس وقت میرے لیے کسی خاص اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ سب فضول ہے' بکواس ہے' زندگی تو کلب کی آزاد زندگی ہے۔ مزہ تو شراب کے نشے میں ہے۔ کشش تو نیم عریاں جسموں میں ہے۔ رعنائیاں تو کھنکناتے قہقہوں میں ہیں۔ دلکشی تو صرف رقص کرتی ہوئی جوانیوں میں ہے۔ وہ وقت جو میں نے گزارا' جب میں بیوی کا محتاج تھا' وہ زندگی نہیں تھی۔ وہ تو اک بوجھ تھا جو اب سر سے اُتر چکا ہے۔ بیویاں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں' شوہر کے ساتھ اپنی زندگی کو خوبصورت بنانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہیں اور اس کے باوجود ہر صورت میں خاوند کی دست نگر رہتی ہیں۔ ہیں تو آخر عورت نا..... صنف نازک..... ہاہاہا..... ایک دھمکی دو تو چپ چاپ آنسو بہانے لگیں گی۔ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتی

ہیں۔ لیکن میں بھی تو مجبور ہوں۔ میری ناخواندہ بیوی، میری خاطر اپنی جان تک قربان کرسکتی ہے۔ مگر وہ نئی زندگی کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کرسکتی۔ وہ ماڈرن طریقے سے بات چیت نہیں کرسکتی۔ وہ میک اپ ٹھیک کرنا نہیں جانتی۔ وہ سوسائٹی کے آداب سے ناواقف ہے۔ اسے لباس پہننے کا ڈھنگ نہیں۔ بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ورنہ میں اسے اپنے ساتھ رکھنے کو تیار ہوں۔ لیکن ہاں ایک بات ہے، اسے ساتھ رکھ کر میں دوسری عورتوں کے ساتھ دوستی نہیں کرسکتا۔ نہ نہ بابا.....

وہ گھریلو میں اچھی ہے ورنہ اپنی اور میری جان ایک کردے گی۔ اگر مجھے کسی غیر عورت.....

ہیں یہ کیا..... وہ سڑک تو میں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں جہاں سے مجھے مڑنا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اس جنگل سے کراس کر کے واپس موڑ لیتا ہوں..... ارے یہ کیسی آوازیں ہیں..... یوں لگتا ہے جیسے کوئی عورت چیخ رہی ہے۔ لیکن اس گھنے جنگل میں بھلا کون ہوسکتا ہے..... شاید یہ میرا وہم ہے لیکن نہیں..... یہ تو حقیقت ہے۔ آواز اب بہت قریب سے آرہی تھی۔ ہیڈ لائٹ کی روشنی میں

کنجوس

ایک صبح مولوی عبدالقدوس کی آنکھ قدرے تاخیر سے کھلی۔ وہ جلدی سے تیار ہوکر گھر سے نکلے اور مسجد کی جانب سرپٹ دوڑنے لگے۔ مسجد کے بالکل قریب انہیں ایک ضروری بات یاد آئی تو انہوں نے ایک مختصر سا ٹرن لیا۔ اور واپس اپنے گھر کی طرف دوڑ لگادی۔ گھر کے دروازہ کے سامنے کھڑے ہوکر وہ ہانپنے اور زور زور سے اپنی بیوی کو آوازیں دینے لگے۔ ''کبریٰ اری او کبریٰ! ''کیا بات ہے؟'' اندر سے بیوی نے بھی چلا کر پوچھا۔ ''دیکھو دروازے مت کھولنا۔ صرف میری بات سن لو۔'' انہوں نے ہدایت کی۔ ''بولو کیا بات ہے۔ تمہاری سانس کیوں چڑھی ہوئی ہے۔ خیریت تو ہے؟'' بیوی نے فکرمندی سے پوچھا۔ ''نیک بخت! کمرے کی بتی بجھا دو۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ میں بجھانا بھول گیا تھا۔ مسجد کے قریب یہ بات یاد آئی تو بھاگم بھاگ چلا آیا۔ تمہیں پتا تو ہے کہ آج کل بل بہت زیادہ آرہے ہیں۔ غریب بندہ ہوں'' ..... ''اور کنجوس مکھی چوس بھی۔'' بیوی نے لقمہ دیا۔ ''تم اندر آکر بھی یہ بات کہہ سکتے تھے۔'' بیوی مزید بولی۔ ''خواہ مخواہ باہر کھڑے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے رہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟''

''لوگوں کو مارو گولی۔ میرے اندر آنے اور پھر جانے سے دروازے کے کواڑ کھلتے اور بند ہوتے۔ ایسا ہونے سے ان کے قبضے گھستے۔'' انہوں نے جواب دیا۔ بیوی چمک کر بولی..... ''اور یہ جو تم نے مسجد سے یہاں تک دوڑ لگائی ہے اور اب واپس بھی جاؤ گے، اس سے تمہارے جوتے نہیں گھستے کیا؟'' ''جوتے.....'' مولوی عبدالقدوس نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے اور دوبارہ مسجد کی جانب اُڑان بھرنے کے لئے پر تولتے ہوئے کہا۔ وہ تو میں نے پہلے ہی حسبِ معمول بغل میں دبا رکھے ہیں۔

مجھے وہ سب کچھ نظر آ گیا جس نے مجھے چونکا دیا۔ دو مرد ایک عورت کو زبردستی گاڑی میں سوار کرا رہے تھے اور وہ عورت مدد کے لیے شور مچا رہی تھی۔ میں نے ہارن بجانا شروع کر دیا اور ہارن کی آواز پر وہ دونوں عورت کو چھوڑ چھاڑ کر جلدی سے کار سٹارٹ کر کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں نے عورت کو اکیلا چھوڑ کر کار کا پیچھا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور کار کو عورت کے قریب جا کر روک لیا ..... وہ حسین اور جوان تھی۔ سردی اور کچھ خوف کی وجہ سے وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے کار سے اُتر کر اپنا کوٹ اس کے شانوں پر ڈال دیا اور سہارا دے کر اسے کار میں بٹھا دیا۔ سٹیرنگ سنبھال کر میں نے کار کو موڑا۔ وہ اب بہت حد تک مطمئن تھی..... لیکن اس کا پورا وجود ابھی تک لرز رہا تھا۔ کار کو سڑک پر لا کر روکتے ہوئے میں نے اندرونی لائٹ روشن کر دی۔ اس پر اس نے کچھ متعجب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کے سوالیہ چہرے کو نظر انداز کر کے اطمینان سے سگریٹ جلائی اور کش لیتا رہا۔ اس دوران وہ خاموش رہی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بات کرنے میں پہل کرے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ چپ چاپ شیشے سے باہر دیکھتی رہی۔ آخر کار تنگ آ کر میں نے خود ہی سکوت توڑا۔ ''محترمہ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ دونوں کون تھے اور آپ کا ان کے ساتھ کیا واسطہ ہے۔ اور یہ سب معاملہ کیا تھا؟''

میرے سوالات پر پہلے تو وہ کچھ گھبرائی' لیکن میرے شریفانہ انداز پر اس نے لب کشائی کی۔ ''آپ سے میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ میں ایک رقاصہ ہوں اور ان مردوں کے متعلق صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ ایکسٹرا سپلائر ہیں اور یہ کہ مجھے زبردستی گرینڈ کلب لے جانا چاہتے تھے' جہاں میں کسی صورت جانے کے لیے تیار نہیں''۔ میں نے چونک کر اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔ ''کیوں' وہاں جانے میں کیا حرج ہے؟'' اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ''محترم اس سے زیادہ نہ تو میں آپ کو بتاؤں گی اور نہ برائے مہربانی آپ مجھ سے پوچھیں۔ میں آپ کی بہت احسان مند ہوں اور صرف اتنا احسان اور کر دیں کہ مجھے نشاط منزل پر ڈراپ کر دیں۔''

اس وقت میرا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ اس کو کار سے دھکا دے کر نکال دوں۔ احسان فراموش' مغرور' خود پسند لڑکی بجائے شکر گزار ہونے کے اُلٹا مجھے دھونس دے رہی ہے۔ لیکن میں اخلاقی طور پر گرا ہوا آدمی نہیں ہوں۔ پھر عورت کے ساتھ تو بہرصورت اخلاق برتنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے کار سٹارٹ کر دی اور اس کی رفتار بڑھاتا گیا۔ غصے سے میرے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ مجھے حیرانی اس بات پر تھی کہ وہ رفتار کی تیزی سے ذرہ برابر بھی خوفزدہ نہ تھی۔ اک مرتبہ موڑ کاٹتے ہوئے کار کو سخت دھچکا لگا تو وہ چیخ اُٹھی۔ ''محترم' کار آہستہ چلایئے۔ میں موت سے خوف زدہ نہیں ہوں لیکن اپنے ساتھ کسی کی زندگی کو خطرے میں ڈالنا بھی مجھے گوارا نہیں''۔ میں نے خفت سے رفتار کم کر دی اور سرسری نگاہ اس پر ڈالی تو اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا جذبہ ہمدردی عود کر آیا۔ وہ مجھے اپنی تمام تر رعونتوں کے باوجود اچھی لگ رہی تھی۔ ملائم سنہرے بالوں کے حلقے میں اس کا صبیح چہرہ معصومیت لیے ہوئے تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں یونہی کار چلاتا رہوں اور وہ سدا میرے

ساتھ یونہی بیٹھی رہے۔ نشاط منزل ابھی دور تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس کا نام دریافت کیا۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ''آپ مجھ سے میرا کون سا نام پوچھنا چاہتے ہیں۔ میرے کئی نام ہیں۔ گھر میں فاطمہ' بازار میں زمرد اور کالج میں ندیمہ.....''

''آپ پڑھتی بھی ہیں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔ ''جی ہاں' میں پیشہ ور رقاصہ نہیں ہوں۔ حالات نے مجھے بازار میں رقص کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میری بوڑھی اندھی ماں یہ سمجھتی ہے کہ میں نائٹ ڈیوٹی کرتی ہوں۔ میرے ننھے منے بہن بھائی مجھ سے صبح ملنے کی دعا کر کے آرام کی نیند سو جاتے ہیں۔ اور میں پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر رقص کرتی رہتی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کس قدر محنتی لڑکی ہے۔ ماں اور بہن بھائیوں کا پیٹ بھی پالتی ہے' پڑھتی بھی ہے' گھر کا کام بھی کرتی ہے' لیکن دنیا کا کیا ہے۔ اگر آج انہیں معلوم ہو جائے کہ میں ایک رقاصہ کی حیثیت سے کما کر لاتی ہوں تو کوئی میرا پس منظر جاننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ کوئی میری مجبوری کو نہ دیکھے گا''..... وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔ جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں رندھے ہوئے لہجے میں خود بخود وہ سب کچھ اگل رہی تھی۔ جو شاید وہ کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن میرے نرم رویے پر آپ سے آپ اس کی زبان سے الفاظ پھسل رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی..... ''ہر شخص کہے گا بدچلن ہے' آوارہ ہے۔ اگر.....''

''معاف کیجیے گا محترمہ' آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ کہیں ملازمت کر کے بھی کما سکتی ہیں''۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ملازمت؟'' وہ تلخی سے مسکرائی۔ ''میں نے ملازمت بھی کی تھی اور اسی ملازمت نے مجھے یہ زندگی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا..... کاش میں حسین نہ ہوتی' نوجوان نہ ہوتی۔ میں نے ایک فرم میں ملازمت کی تھی۔ جس کے منیجر نے پہلے میری معصومیت سے فائدہ اٹھایا اور پھر مجھے اس جگہ بھیج دیا جسے دنیا بازار کہتی ہے اور سن لیجیے کہ میں گرینڈ کلب اس لئے نہیں جانا چاہتی کہ وہی منحوس منیجر اس کلب کا مالک ہے۔ لیکن..... لیکن..... میں یہ سب کچھ آپ کو کیوں بتا رہی ہوں۔ آپ بھی تو مرد ہیں..... مرد جس نے ہر مقام پر عورت کی فطری کمزوری سے فائدہ اٹھایا ہے جس سے مجھے نفرت ہے..... شدید نفرت۔'' اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ مٹھیاں بھینچ گئیں اور جذبات کی شدت سے اس نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا لیا۔ پھر بے بسی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر رو پڑی۔ وہ سسکتی رہی۔ میں خاموشی سے کار چلاتا رہا..... میں باوجود کوشش کے اس کو تسلی نہ دے سکا۔ میں خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ کسی مرد نے اس معصوم بے گناہ پر ظلم کیا۔ میں ایک باوفا اور سیدھی سادی عورت پر ظلم کر رہا ہوں' دنیا کا ہر مرد کسی نہ کسی صورت میں عورت پر ظلم کرتا ہے۔ میں اس سے ہمدردی کرتا تو کس بناء پر' وہ الفاظ کہاں سے لاتا جس کی مستحق میری بیوی بھی ہے۔ وہ خاموش اپنی ہی آگ میں سلگ رہی ہے اور میں عیش کرتا پھرتا ہوں۔

نشاط منزل قریب آ گئی تھی۔ اس نے گاڑی دور ہی رکوالی اور اترتے ہوئے میں نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''مجھے یاد رکھیے گا۔'' کارڈ لے کر اس نے شکریہ ادا کیا اور جلدی جلدی قدم

ازدواجیات

ایک ماہر ازدواجیات چند شہریوں کو لیکچر دے رہا تھا۔

''اگر کسی شخص کی بیوی سادہ لوح ہو اور وہ شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی بیوی چالاک ہو جائے تو وہ کھڑا ہو جائے۔''

سب خاموش رہے' ایک آدمی اٹھا تو ماہر ازدواجیات نے کہا۔

''اچھا تو آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بیوی چالاک ہو جائے؟''

وہ آدمی گھبرا کر بیٹھ گیا اور بولا۔

''میں تو یہ سمجھا تھا کہ وہ..... ہلاک ہو جائے.....

بڑھا دیے۔ میرا کوٹ اس نے پہلے ہی اُتار کر سیٹ پر رکھ دیا تھا۔ میں اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے سنہرے بال کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ دوپٹے کو اس نے اچھی طرح چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔

جب تک وہ سیڑھیاں نہیں چڑھ گئی۔ میں اسے دیکھتا ہی رہا۔ پھر اس کی یاد لیے واپس لوٹ آیا۔ اس کا معصوم چہرہ' اس کی جذبات سے بھرپور آواز' اس کا دکھی لہجہ..... نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ اس سے اتنی محبت کروں کہ وہ تمام غموں کو بھول جائے' لیکن کیا معلوم وہ میری ہمدردی قبول بھی کرے یا نہیں۔ وہ نہایت خود دار قسم کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ اس سے ایک مرتبہ پھر ضرور ملوں گا۔ اس کو اپنی ہمدردی اپنی چاہت دے کر مجبور کر دوں گا کہ وہ اپنا سارا دکھ مجھے سنا دے۔ دو چار روز تو یونہی پس و پیش کرتا رہا' لیکن ایک روز..... آخر کار میں نے نشاط منزل کی جانب کار دوڑا دی۔ سیڑھیوں کے پاس ایک بچی کھیل رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ فاطمہ کا گھر کون سا ہے تو وہ پہلے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی..... ''فاطمہ باجی' وہ لوگ تو چلے گئے پرسوں یہ گھر چھوڑ کر'' ..... ''کیا؟'' میں جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر گیا اور بے مقصد ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولا اور میں نے بات بنانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ''میں فاطمہ کا رشتہ دار ہوں۔ نیا نیا آیا ہوں' فاطمہ کا پتہ مجھے بتا دیں تو عنایت ہوگی''۔ اس نے مجھے سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ ''جناب..... ان کا پتہ کسی کو نہیں معلوم' وہ لوگ کسی کو اپنا پتہ نہیں دے کر گئے۔''

میں مایوس لوٹ آیا۔ اتنی کوفت ہوئی کہ میں کلب بھی نہ جا سکا۔ یونہی بے مقصد گھومنے کے بعد گھر پہنچا۔ اسے نیا گھر تبدیل کرنے کی ضرورت آخر کیوں پیش آئی؟ کیا ان لوگوں کی وجہ سے جو اسے زبردستی گرینڈ کلب لے جا رہے تھے یا میری وجہ سے' لیکن مجھ سے اُسے کیا خوف ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو۔ کئی روز تک مجھے دنیا خالی خالی محسوس ہوتی رہی۔ جیسے میرا کچھ کھو گیا ہو۔ میں جتنا اسے بھلانا چاہتا تھا۔ اتنا ہی شدت سے اس کی یاد دل میں کروٹیں لیتی تھی۔ صرف ایک بار میں اسے دیکھ لوں۔ وہ جو میرا سکون لوٹ کر لے گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کسی طرح بھی اس کا پتہ چلاؤں گا۔ میں نے بازار حسن کا رُخ کیا۔ ایک

ایک کوٹھا چھان مارا' لیکن وہ نہ جانے آسمان کی کوئی مخلوق تھی کہ دوبارہ آسمانوں میں روپوش ہوگئی یا پھر زمین میں سما گئی۔ میں نے رقص کی کوئی محفل نہ چھوڑی' ہر تقریب میں شرکت کی۔ بن بلایا مہمان بن کر بھی گیا' لیکن وہ مجھے نہ ملی۔ تنگ آ کر میں نے اس کی تلاش ترک کر دی۔ لیکن اس کا خیال دل سے نہ نکال سکا۔

پھر ..... ایک روز ..... وہ مجھے مل گئی۔ وہ جسے میں نے دیوانہ وار تلاش کیا تھا۔ مجھے اپنے ہی گھر میں مل گئی۔ وہ مظلوم عورت' دُکھ اور مجبوری کی داستان' وفا کی منہ بولتی تصویر ..... میری بیوی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس سرخی کی جگہ جو غربت میں بھی میرے پیار کی بدولت اس کے رخساروں پر رونق افروز رہتی تھی ..... وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس کے بالوں کی وہ چمک ماند پڑ گئی تھی۔ جو کبھی اس کے حسن میں اضافے کا سبب بنی تھی۔ وہ میرے معصوم بچے کو سبق پڑھا رہی تھی۔ ''محبت کی دولت سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی عظیم دولت نہیں۔'' میرا کمسن بچہ اس کا مفہوم جاننا چاہتا تھا۔ جبھی اس نے کہا۔ ''امی محبت کیا ہوتی ہے؟'' ..... ''محبت''۔ وہ مسکرائی' اس کے خزاں رسیدہ گالوں پر شفق سی پھوٹی اور غائب ہوگئی۔ ''محبت انسان میں زندہ رہنے کی امنگ پیدا کر دیتی ہے ..... محبت قربان ہونا سکھاتی ہے۔ جیسے ..... جیسے تیری محبت مجھے جینے کا حوصلہ عطا کرتی ہے''۔ ''امی' آپ کو مجھ سے محبت ہے؟'' ''ہاں بیٹے .....'' ''امی' آپ کو ابو سے بھی محبت ہے؟'' میرے بچے نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا ..... میری بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ..... ''ہاں میرے بچے مجھے تمہارے ابو سے بھی محبت ہے''۔ ''پھر تو آپ بہت دولت مند ہیں۔'' میری بیوی بچے کی اس معصومیت پر اور غمگین ہوگئی۔ ''ہاں بیٹے ..... میں بہت دولت مند ہوں۔ اس لیے کہ میرے پاس محبت کی دولت موجود ہے ..... محبت کی دولت .....'' ہوا کے تیز جھونکے سے ریشمی پردے سرسرائے اور ..... اور میں جوش جذبات میں تقریباً دوڑتا ہوا آگے بڑھا۔ بچے کو دیوانہ وار چومتا رہا ..... میری بیوی اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے مجھے تک رہی تھی۔ بچے کو گود سے اُتار کر میں نے اپنی بیوی کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ اس کے سرد ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے عقیدت سے انہیں اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور پھر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے انہیں چوما تو میری آنکھوں سے دو قطرے ٹپک کر اس کی ہتھیلی پر میری محبت کے انمول موتیوں کی طرح چمک اٹھے اور جب میری بیوی پرنم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی تو مجھے محسوس ہوا جیسے ..... جیسے میں نے اس مظلوم لڑکی کے زخموں پر پھاہا رکھ دیا ہو۔ جیسے میں نے اس سے ہمدردی کا حق ادا کر دیا ہو۔

وہ جو مجھے میرے جرم کا احساس دلا گئی..... وہ جس نے مجھے میرے فعل پر شرمندہ ہونے پر مجبور کر دیا ..... وہ جو میری بیوی کی صنف سے تعلق رکھتی ہے۔ کس قدر دکھی' کس قدر مجبور ہے..... میری بیوی کی طرح..... لیکن یہ میرے لیے اب بھی سربستہ راز ہے کہ ''وہ کون تھی؟''

.....❁.....❁.....

نواز خان

ٹکراؤ

اس کا نام انتقام تھا۔ وہ عداوت نگر میں رہتا تھا اور اس کا پیشہ قانون شکنی تھا۔ وہ ایک ایسے مقام سے گزرا تھا کہ اس کے سینے میں ابدی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

نور پور تھانے کا واقعہ ہے ایک ادھیڑ عمر شخص بھاگتا ہوا تھانے میں داخل ہوا میرے کمرے کا پوچھ کر وہ سیدھا اندر چلا آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں عمر یہی کوئی چالیس سال رہی ہوگی شکل اور حلیے سے کسی کاشتکار کا ملازم یا کھیت مزدور لگتا تھا۔ اندر آتے ہی وہ میرے قدموں میں بیٹھ گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

''مائی باپ! صغراں بی بی کو بچالیں وہ ظالم اسے کہیں کا نہ چھوڑے گا۔''

''کون صغراں؟ کیا ہوا اسے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور بولا ''سرکار! میں ملک مشتاق کا کاماں (کارندہ) ہوں ان کی گائے بھینسوں کی راکھی کرتا ہوں اگر انہیں پتہ چل گیا کہ میں نے ان کی شکایت کی ہے تو وہ میرے ٹکڑے کردیں گے میرے بال بچے ذلیل وخوار ہوجائیں گے۔''

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ''تُو نے جو کچھ کہنا ہے بے خوف ہوکر کہہ تیرا نام بیچ میں نہیں آئے گا۔'' اس نے ایک بار پھر رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولا ''سرکار ملک صاحب صغراں بی بی کو پکڑ کر اپنے میں کمرے میں لے گئے ہیں میں نے ان کی بہت منت سماجت کی کہ اسے معاف کردیں اگر اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو مجھے اس کی سزا دے لیں لیکن..... انہوں نے دھکے مار کر مجھے کمرے سے باہر نکال دیا اور اندر سے کنڈی لگالی۔''

میں سمجھ گیا کہ ملک مشتاق نامی یہ شخص کسی مجبور عورت کی عزت سے کھیلنے کا ارادہ کئے ہوئے ہے لیکن اطلاع دینے والا شخص اتنا گھبرایا ہوا تھا اور ایسی اُلٹی سیدھی ہانک رہا تھا کہ بات میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا ''دیکھو میاں مجھے ذرا تحمل سے بتاؤ یہ صغراں بی بی کون ہے اور ملک مشتاق اس وقت کہاں ہوگا؟''

وہ بولا ''جناب صغراں بی بی اسی گاؤں کی رہنے

نواز خان
ٹکراؤ

والی ہے بڑی اچھی لڑکی ہے پتہ نہیں ملک صاب کے چکر میں کیسے آ گئی۔ میں آپ کو بعد میں سب کچھ بتا دُوں گا اس وقت جلدی کریں اس کی عزت سخت خطرے میں ہے۔''

میں چونکہ اس تھانے میں نیا آیا تھا مجھے یہاں کے چودھری کے سوا کسی اور کے گھر کا علم نہیں تھا۔ میں نے اطلاع پہنچانے والے سے ملک مشتاق کے گھر کا حدود اربعہ دریافت کیا اور دو کانسٹیبلوں کو لے کر تیزی سے روانہ ہو گیا۔

گرمیوں کے دن تھے دوپہر کا وقت تھا گاؤں کی زیادہ تر گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ کہیں کہیں کوئی عورت سر پر روٹی رکھے کھیتوں کو جاتی یا واپس آتی دکھائی دیتی تھی۔ تین چار گلیوں سے گزرنے کے بعد ہم لکڑی کے بڑے سے پھاٹک والے ایک مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ حویلی نما مکان اس وقت بالکل سنسان نظر آ رہا تھا۔ پھاٹک کھول کر ہم اندر داخل ہوئے ڈیوڑھی کی کچی زمین پر مجھے کسی گاڑی کے پہیوں کے نشان دکھائی دیئے لیکن گاڑی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی سرکاری ریوالور نکال لیا اور ملک مشتاق کا نام لے کر اسے باہر آنے کا حکم دیا۔ میری تیسری آواز پر ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لمبے تڑنگے شخص کا سراپا نظر آیا۔ اس نے تہبند قمیص اور کامدار واسکٹ پہن رکھی تھی۔ ایک پستول اس کے کندھے سے لٹک رہا تھا اس کے لمبے بال تیل میں چمک رہے تھے اور سر کے عین درمیان مانگ نکلی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی انداز لگا لیا کہ وہ ملک مشتاق ہے۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ ٹھٹھکا پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ میرے استقبال کے لئے تیزی سے آگے بڑھا۔

''آؤ جی دھن بھاگ ساڈے جناب نے میری بڑی عزت افزائی کی ہے۔''

میں اس گاؤں میں بالکل نیا تھا میرا تجربہ ہے کہ نئی جگہ پولیس آفیسر کو بڑی احتیاط کا مظاہرہ کرنا چاہئے ٹھنڈے دل و دماغ سے اردگرد کا جائزہ لے کر اور بااثر لوگوں سے مل کر ہی تھانیدار کو اپنی صحیح پوزیشن کا پتہ چلتا ہے۔ بعض تھانے تو چلتے ہی بااثر لوگوں کے تعاون سے ہیں۔ ایسے زمیندار بھی ہوتے ہیں جو پولیس والوں کو ذاتی ملازموں کی طرح سمجھتے ہیں اور ایسے چودھری بھی ہوتے ہیں جن کی حویلیوں میں تھانیداروں کو حاضری لگوانی پڑتی ہے۔ کئی پیشے ایسے ہیں جن میں فرض شناسی اور دیانتداری پر قائم رہنا پل صراط پر چلنے کے برابر ہوتا ہے اور تھانیداری ان میں سے ایک ہے۔ میں نے اپنے سامنے کھڑے شخص کو سر سے پیر تک ٹھوکرا اور کوئی اندازہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ وہ ایک خوشحال اور بااثر شخص دکھائی دیتا تھا لیکن خاندانی چودھریوں والا رُعب داب اور ٹھہراؤ اس میں نظر نہیں آتا تھا۔

میں نے کہا ''اگر تمہارا نام ملک مشتاق ہے تو میں تمہارے مکان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔''

وہ چہرے پر مصنوعی حیرت پیدا کر کے بولا ''ہم سے کیا غلطی ہو گئی سرکار جو آپ اتنے بیگانے نظر آتے ہیں۔'' میں نے کہا ''مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس حویلی میں کوئی لڑکی اٹھا کر لائی گئی ہے۔''

ملک مشتاق تھوڑی دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر واپس مڑا اور تیزی سے کمروں کے دروازے کھول دیئے اور احترام سے سر جھکا کر بولا۔

''ہم نے اپنی نئی سرکار کو ناراض نہیں کرنا ورنہ اب تک کسی نے ملک کے گھر پر شبہ نہیں کیا۔''

میں اس کی بات نظر انداز کر کے آگے بڑھا اور جلدی جلدی تمام کمرے دیکھ ڈالے۔ لڑکی تو کیا کہیں کوئی چڑیا کا بچہ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا اب صرف ایک کمرہ باقی تھا یہ کمرہ جو دراصل چوبارہ تھا سیڑھیوں کے اوپر نظر آ رہا تھا۔ اس کا بڑا حصہ نیم کے ایک گھنے درخت نے چھپا رکھا تھا۔ میری

نظر چوبارے کی طرف اُٹھی تو ایک دم مشتاق کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ میں نے تیزی سے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔ مشتاق نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اب وہ ایک بدلا ہوا شخص نظر آرہا تھا۔ اس کی صورت پر پریشانی تھی اور آنکھوں میں خوف کروٹیں لینے لگا تھا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز بھی بدلی سی تھی دھیمے لہجے میں کہنے لگا۔

''تھانیدار صاحب اوپر کچھ نہیں..... آیئے چل کر اندر بیٹھتے ہیں۔''

میں نے کہا ''جہاں دوسرے کمرے دکھائے ہیں یہ بھی دیکھ لینے دو۔''

آہستہ سے کہنے لگا ''جانے بھی دیں تھانیدار صاحب آپ سمجھدار آدمی ہیں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اس کا مطلب تھا اطلاع درست ہے۔ میں نے بھی بدلے ہوئے لہجے میں کہا ''ٹھیک ہے ملک مشتاق لیکن مجھے کمرہ تو دیکھنے دو۔'' ملک مشتاق نے پھر کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے لیکن میں اسے ہاتھ سے ایک طرف ہٹاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے کے دروازے پر وزنی تالہ نظر آرہا تھا۔ میں نے مشتاق سے کہا۔

''ملک صاحب ذرا چابی دیں نا'' ملک مشتاق اپنی واسکٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگا پھر بولا۔

''جناب چابی تو شاید میرا ملازم لے گیا ہے آیئے نا آپ نیچے چل کر بیٹھتے ہیں۔''

میں نے ہاتھ میں ریوالور گھماتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے میں فائر کر کے تالا توڑ لیتا ہوں۔''

اتنے میں مشتاق کو ایک جیب میں چابی مل گئی۔ اس نے جھک کر تالا کھولا' میں نے دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہوگیا۔ درمیانے سائز کا کمرہ تھا' لڑکی تو یہاں بھی نظر نہیں آرہی تھی لیکن کمرہ چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ یہاں کچھ دیر پہلے ابلیس کا رقص ہوا ہے۔ درودیوار کسی مجبور پر ہونے والے ظلم کی کہانی سنا رہے تھے۔ دو کرسیاں اُلٹی ہوئی تھیں ایک میز ٹوٹی پڑی تھی ایک کھڑکی کا پردہ پھٹا ہوا تھا مسہری کی چادر شکن شکن تھی اور فرش پر جا بجا ٹوٹی چوڑیاں پڑی تھیں۔ موقع واردات پر ٹوٹی چوڑیاں دیکھ کر ہمیشہ میری آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے۔ عورت ذات پر ہونے والا ظلم کبھی کبھی تو مجھے ہوش وحواس سے بیگانہ کر دیا کرتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا میں مجرم کے ٹکڑے کر ڈالوں۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کبھی میں نے صبر وتحمل کا دامن ہاتھ سے چھوڑا تو وہ ایسے ہی موقعوں پر ہوا۔

بہرحال اس وقت کمرے کی حالت دیکھنے کے بعد میں نے خود کو بڑی مشکل سے کنٹرول کیا اور عام سے انداز میں سر ہلا کر دروازہ بند کر دیا۔ میرے دونوں کانسٹیبل نیچے صحن میں کھڑے تھے۔ اور انہیں کچھ معلوم نہیں تھا میں نے کمرے میں کیا دیکھا ہے۔ ملک مشتاق بڑے احترام اور بڑی چاپلوسی سے مجھے اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ اتنی دیر میں گھر سے باہر جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی' پھاٹک کھلا اور ایک جیپ ڈیوڑھی میں آکر رُک گئی۔ میں نے مشتاق کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے بندے لڑکی کو چھوڑ آئے۔''

مشتاق ڈھٹائی سے مسکرایا اور بولا ''آپ جیسے سمجھدار افسر سے کوئی بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے۔''

''زندہ چھوڑ کے آئے ہیں یا.....؟''

''زندہ جی بالکل زندہ۔'' مشتاق ایسے بولا جیسے وہ مچھلی بیچ رہا ہو اور میں نے اس سے پوچھ لیا ہو کہ مچھلی زندہ ہے یا مُردہ۔

اتنے میں اس کے آدمی اندر آگئے' مجھے دیکھ کر ٹھٹھکے پھر ہراساں نظروں سے مشتاق کی طرف دیکھنے لگے وہ انہیں مشتر کہ طور پر ایک موٹی سی گالی دے کر بولا۔

''میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو' دیکھتے نہیں شاہ صاحب آئے ہیں جاؤ چائے پانی کا بندوبست کرو۔''

وہ مجھے بغیر جانے ہی شاہ کہہ رہا تھا شاید وہ خود بھی اسی طرح کا خود ساختہ ملک تھا۔ بعدازاں میرا یہ قیافہ بھی درست ثابت ہوا۔ ملک کے لفظ کا اس کے نام سے اتنا ہی تعلق تھا جتنا اس سفید پوشی کا اس کی خباثت سے تھا۔ اس کے بندے باہر نکل گئے تو اس نے اُٹھ کر کمرے کی کنڈی لگا دی اور میرے سامنے بیٹھ کر میرے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ تھانیدار صاحب اب اس معاملے کو آپ ہی نے سنبھالنا ہے' وہ بڑی واہیات عورت ہے جی گاؤں کا کوئی نوجوان نہیں جو اس نے خراب نہ کیا ہو۔ پیسے پر چلتی ہے' میرے ساتھ بھی اس کا پیسے پر جھگڑا ہوا۔ ہاتھا پائی پر اُتر آئی تو میں نے دھکا دیا' لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی اور بے ہوش ہوگئی۔ میں نے بڑی مشکل سے ہوش دلایا بعد میں اپنے آدمیوں کے ہاتھ اسے واپس بھیج دیا۔''

اگر مشتاق کے ملازم نے تھانے میں مجھے اصل صورتحال نہ بتائی ہوتی تو شاید میں مشتاق کی بات پر یقین کر لیتا لیکن اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے کہا۔

''ملک صاحب آپ بس چپ ہی رہیں جو اصل بات ہے وہ مجھے معلوم ہے۔ آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ میں اتفاقاً یہاں نہیں آ گیا کچھ جان کر ہی آیا ہوں۔'' مشتاق کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا ''میں کوئی زیادہ مالدار شخص نہیں ہوں۔ میری بس تھوڑی سی زمین ہے ویسے بھی اس دفعہ فصل نے کمر توڑ دی ہے بہرحال مجھ سے جو ہو سکا میں آپ کی خدمت کروں گا۔''

میں سمجھ رہا تھا کہ مشتاق مجھے رشوت کی پیش کش کر رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر میرا خون کھول جاتا تھا لیکن میں نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''لڑکی کے وارث خاموش تو نہیں بیٹھے رہیں گے؟''

''اس کی آپ فکر نہ کریں جی۔'' مشتاق شیطانی سے مسکرایا ''سب اپنی مٹھی میں ہیں کسی کی مجال نہیں کہ تھانے تک آئے اور پھر..... پھر لڑکی کوئی زیادہ زخمی بھی نہیں ہوئی بس ماتھے پر تھوڑی سی چوٹ آئی ہے۔''

مشتاق میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور اس بے خبری کا فائدہ بھی مجھے ہوا تھا۔ جو باتیں وہ بڑی مشکل سے بتاتا وہ فرفر اس کی زبان پر آ گئی تھیں۔ اس نے میرے سامنے کم از کم یہ اعتراف تو کر لیا تھا کہ صغراں بی بی نامی اس لڑکی کو نہ صرف اس مکان میں لایا گیا تھا بلکہ اس کے ساتھ ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی۔ بعدازاں مشتاق کے آدمی اسے جیپ میں ڈال کے کسی نامعلوم مقام پر چھوڑ آئے تھے۔ یہ معلومات میرے لئے کافی تو نہیں تھیں لیکن اس سے زیادہ مجرم سے کچھ معلوم ہونے کی فی الحال توقع بھی نہیں تھی۔

میں نے اس سے کہا ''ملک صاحب تمہیں تھانے چلنا ہوگا۔''

وہ میرے بدلے ہوئے لہجے پر چونکا۔ میں نے مزید سختی سے کہا ''میرا منہ مت دیکھو میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔''

مشتاق سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے شاید اس نے خیال کیا کہ میں اپنی قیمت بڑھانے کے لئے بے رُخی دکھا رہا ہوں۔ اس نے فوراً اپنی واسکٹ کے اندر سے نوٹوں کی گڈی نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ پورے ایک ہزار (اُس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی) ہیں جناب ایسی ہی دو گڈیاں کل تک آپ کو بھجواؤں گا۔''

میں نے گڈی اس کی گود میں اُچھالتے ہوئے کہا ''اسے اپنے پاس رکھ حرام زادے..... وکیلوں کے کام آئیں گے۔ چل اُٹھ ورنہ بے عزت ہو جائے گا۔''

مجھے اپنے غصے پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ شکن شکن مسہری پر ٹوٹی ہوئی چوڑیاں میرے ذہن میں انگارے بھر رہی تھیں۔ میرے تیوروں سے مشتاق کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا سابقہ ایک مختلف قسم کے تھانیدار سے پڑ گیا ہے۔ اس نے ایک ہاتھ مونچھوں پر پھیرا اور گمبھیر لہجے میں بولا۔

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور
ایمان افروز فخریہ پیشکش

قیمت: 175 روپے

40 درخشندہ ستاروں کے
روح پرور اور بصیرت افروز
تذکروں پر مشتمل

صحابہ رضؓ کرام نمبر

- جنہوں نے اپنی آنکھوں سے جلوہ یار کا بے نقاب مشاہدہ کر کے شرف صحابیت پایا
- جنہوں نے منبع رشد و ہدایت ﷺ سے براہ راست کسب فیض کیا
- جنہوں صاحب قرآن ﷺ سے قرآن کے رموز و اسرار سمجھے
- جنہوں نے اپنے خون جگر سے چمنستان اسلام کی آبیاری کی
- جنہوں نے اپنے ارفع سیرت و کردار سے چہرہ انسانیت کی سیاہیاں دھوڈالیں
- جنہوں نے انتھک مخلصانہ جدوجہد سے جنت نظیر معاشرہ کی صورت گری کی
- جنہوں نے فیصلہ کن اور غیر مصالحانہ ٹکر لے کر باطل کو تہہ و بالا کر دیا

500 صفحات پر مشتمل سفید کاغذ عمدہ کتابت اور دیدہ زیب سرورق

شائع ہو گیا ہے

''شاہ صاحب ہمارے بھی تعلقات ہیں اتنے گئے گزرے لوگ نہیں ہیں ہم۔''

میں نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر کہا ''ایسی کی تیسی تیرے تعلقات کی دیکھ لوں گا تیرے پیچھے آنے والوں کو بھی۔''

اس نے جب یہ دیکھا کہ کارندوں کے سامنے بے عزتی ہوجائے گی تو چپ چاپ میرے ساتھ چل دیا۔

مشتاق کو حوالات میں بند کرکے میں نے اپنے سب انسپکٹر بدری نرائن کو صغراں کے وارثوں کی طرف بھیجا۔ ان کا پتہ مجھے مشتاق کے ملازم سے ہی معلوم ہوا تھا۔ صغراں گاؤں کے ایک معمولی کاشتکار رحمت عرف رحمو کی بیوی تھی خوش شکل اور ملنسار تھی۔

مشتاق کے جس ملازم نے مجھے اس حادثے کی اطلاع دی تھی اس کا نام خادم حسین تھا اور وہ صغراں کے پڑوس میں رہتا تھا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ مشتاق بڑی دیر سے رحمو کی بہن یعنی صغراں کی نند پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ باقی کی باتیں مجھے رحمو اور اس کے باپ سے معلوم ہوگئیں۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد سب انسپکٹر بدری نرائن دونوں باپ بیٹا کو لے کر تھانے آ گیا۔ ان دونوں کے چہرے رنج و غم میں ڈوبے ہوئے تھے۔ رحمو کی تو رو رو کے آنکھیں سرخ ہورہی تھیں ان کا بوڑھا باپ بار بار کندھے کے رومال سے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔ میں نے ان کی کیفیت سے اندازہ لگایا کہ وہ صغراں کو پیش آنے والے حادثے سے باخبر ہوچکے ہیں۔

میں نے تنہائی میں ان سے پوچھ گچھ کی' پہلے تو دونوں کچھ بھی بتانے سے کتراتے رہے پھر میری تسلیوں اور دھمکیوں سے مجبور ہوکر رحمو کے بوڑھے باپ یعنی صغراں کے سسر نے بولنا شروع کیا۔

''تھانیدار صاحب ہم غریبوں کی کیا زندگی ہے پتہ نہیں ہم لوگ زندہ ہی کیوں ہیں۔ بڑے لوگوں کی ٹھوکروں میں پڑے ہیں۔ چپ رہتے ہیں تو بھی مارتے ہیں بولتے ہیں تو بھی مارتے ہیں پاس آتے ہیں تو بھی پکڑے جاتے ہیں دُور رہتے ہیں تو بھی گستاخ ٹھہرتے ہیں..... ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو تھانیدار صاحب ہماری قسمت میں یہی ذلتیں لکھی ہیں تم تو کل ان سے مل بیٹھو گے ہم پھر اکیلے رہ جائیں گے۔''

میں نے بوڑھے کو تسلی دیتے ہوئے کہا ''بابا پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں میں نہ کسی کا دوست ہوں اور نہ دشمن میں صرف قانون شکن کا دشمن ہوں اور رہوں گا تم پر جو کچھ بیتی ہے مجھے صاف صاف بتا دو۔''

بوڑھے نے خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے میرے لفظوں کی قیمت جاننے کی کوشش کررہا ہو۔ میں نے اس موقع پر اسے مزید تسلی دی' آخر بوڑھے کی مفلوج زبان کو گویائی مل گئی۔ اس نے اپنی بپتا سناتے ہوئے کہا: ''تھانیدار حضور ملک صاب میری بیٹی شاداں کو بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔ انہوں نے کئی بار راہ جاتے اسے تنگ کیا آخر ایک روز شاداں نے یہ بات مجھے بتا دی میں نے شاداں کا گھر سے نکلنا بند کردیا اب وہ کہیں آتی جاتی نہیں اگر کہیں جانا ہی ہوتا ہے تو اس کی ماں یا بھابی صغراں ساتھ ہوتی ہیں۔ آج میری بیوی بیمار تھی صبح کھیتوں کو جاتے ہوئے میں نے صغراں سے کہا کہ وہ ہمیں دوپہر کو روٹی پہنچا دے۔ صغراں آئی تو شاداں بھی اس کے ساتھ تھی اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ان کے ساتھ یہ سلوک ہوگا تو لعنت بھیجتا ہوں روٹی پر۔ روکھے سوکھے چند ٹکڑوں اور لسی کے دو گھونٹ کے بدلے میں' میں نے اپنی لاکھوں میں ایک بہو کی عزت کو لٹا دیا۔ روٹی کھلا کر جب دونوں واپس گئیں تو راستے میں ملک صاحب اور ان کے دو آدمیوں نے انہیں گھیر لیا' دو کارندوں نے تو صغراں کو پکڑ لیا اور ملک صاحب شاداں کے پیچھے بھاگے۔ وہ جان بچانے کے لئے کھیتوں کی طرف دوڑی۔ امرودوں کے باغ میں ملک

صاحب نے اسے دبوچ لیا اور زبردستی کرنے لگے اتنے میں صغراں خود کو چھڑا کر شاداں کے پیچھے بھاگی وہ جب باغ میں پہنچی تو ملک صاحب....." بوڑھے نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آنسوؤں کا گھونٹ بھرا اور بولا شاداں زور زور سے چیخ رہی تھی اور مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ صغراں نے اسے بچانے کے لئے ملک صاحب کے سر پر لسی والا برتن مارا ملک صاحب نے شاداں کو تو چھوڑ دیا اور صغراں کے پیچھے لپکے۔ صغراں نے مدد کے لئے بہت چیخ و پکار کی لیکن باغ میں کوئی موجود نہیں تھا یا شاید موجود تھا اور سامنے آنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا آخر صغراں ایک درخت سے ٹکرا کر گر گئی ملک صاحب نے اپنے آدمیوں کے ساتھ مل کر اسے اٹھایا اور بے بس کر کے جیپ میں ڈال لیا۔"

اس کے بعد کی بات آپ سن ہی چکے ہیں کہ ملک مشتاق اسے اپنے گھر لے گیا۔ خادم حسین جو مشتاق کا گھریلو ملازم تھا صغراں پر ہونے والا ظلم برداشت نہ کر سکا اور روتا ہوا تھانے پہنچ گیا۔ صغراں کے سسر نے روتے ہوئے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے صغراں لٹی پٹی گھر پہنچی۔ ملک صاحب کے آدمی اسے جیپ پر کھیتوں میں چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے اسے کہا کہ اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کرے ورنہ وہ اس بار اسے گھر سے اُٹھالیں گے۔ شاید وہ ذکر نہ ہی کرتی لیکن اس سے پہلے شاداں نے جو گھر پہنچ چکی تھی' اُس نے اپنی ماں کو سب کچھ بتا دیا۔

مندرجہ بالا بیان کے بعد شبے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ بہت جلد کوئی شخص پہنچ جائے گا اور مجھے دودھ اور پانی یکجا کرنے پر مجبور کرے گا اور یہی ہوا۔ ابھی رحمو اور اس کا بوڑھا باپ میرے پاس ہی بیٹھے تھے کہ ایک سوٹ بوٹ والا بارعب سا شخص اندر داخل ہوا اس کے بوٹ چمکدار تھے اور گلے میں خوبصورت ٹائی جھول رہی تھی۔ نووارد کی عمر کوئی تیس سال رہی ہوگی۔ اس نے قدرے جھک کر بڑی شائستگی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا اور بولا "میرا نام عارف عزیز ہے میں چودھری حکم دین کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔"

چودھری حکم دین سے میری کل ہی علیک سلیک ہوئی تھی۔ اونچی حویلی' اونچے شملے اور اونچے لہجے میں بولنے والا وہ پنجاب کا ایک روایتی چودھری نظر آتا تھا۔ اس ملاقات میں جو ایک پُرتکلف کھانے کے بہانے ہوئی مجھے یہ سوٹ بوٹ والا شخص کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ عارف عزیز نے میری اس اُلجھن کو دُور کرتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر صاحب کل جب آپ چودھری صاحب کے ہاں آئے تھے میں ایک تاریخ کے سلسلے میں شہر گیا ہوا تھا اس لئے آپ کی صحبت سے محروم رہا۔"

میں نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا "کہئے عارف صاحب میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

وہ بولا "میں آپ سے تنہائی میں چند منٹ گفتگو کرنا چاہوں گا۔"

میں نے سب انسپکٹر بدری نرائن کی طرف دیکھا وہ رحمو اور اس کے باپ کو باہر لے گیا۔ عارف عزیز بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"جناب! میں اس لئے حاضر ہوا تھا کہ ملک صاحب میرا مطلب ہے ملک مشتاق صاحب اپنے ہی آدمی ہیں' خوامخواہ ان فریبیوں کے چکر میں آ گئے ہیں یہ بوڑھا اور اس کا بیٹا جتنے مظلوم نظر آتے ہیں اتنے ہی افلاطون ہیں۔"

میں نے کہا "عارف صاحب کہیں آپ بلاثبوت الزامات لگانے کی غلطی تو نہیں کر رہے ہیں۔"

عارف عزیز دلکش انداز میں مسکرایا اور بولا "انسپکٹر صاحب آپ نئے ہیں اس لئے یہ بات کہہ رہے ہیں ان شریف لوگوں کی حقیقت تو سارا گاؤں جانتا ہے۔

انہوں نے آپ کے سامنے اپنی مظلومیت کی بڑی پردرد تصویر کھینچی ہوگی۔ گاؤں کے معززین پر کیچڑ اچھالا ہوگا اپنی عورتوں کی پاکدامنی اور بے چارگی کا فسانہ سنایا ہوگا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے یہ باپ بیٹا ان مردوں میں سے ہیں جو عورتوں کی کمائی کھانا حلال سمجھتے ہیں اور کمائی بھی وہ جس کا سن کر شریف آدمی کی گردن جھک جاتی ہے۔ ان کی شرافت کا میں آپ کو ایک مختصر سا نمونہ دکھاتا ہوں اس سے آپ اندازہ لگالیں کہ یہ کس قماش کے لوگ ہیں۔ صغراں نامی لڑکی جس کی شرافت کی ان دونوں نے آپ کے سامنے قسمیں کھائی ہوں گی گاؤں کے بہت سے لڑکوں کو اپنے پیچھے لگائے پھرتی ہے اور تو اور یہ اپنے دیور سے بھی خراب تھی کوئی پانچ چھ ماہ پہلے ہی کی بات ہے گاؤں کی ایک عورت نے ان دونوں کو اکٹھے ایک کھیت میں داخل ہوتے دیکھا اس نے گاؤں والوں کو بتا دیا لوگوں کو پہلے ہی شبہ تھا انہوں نے جا کر اس کھیت کو گھیر لیا بالآخر بھابی دیور اندر سے پکڑے گئے۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ لوگ دونوں کو لعن طعن کرتے تھانے میں لے آئے یہاں پہنچ کر صغراں کے دیور نے اقبال جرم کرلیا۔ بعدازاں ان کی ضمانت ہوگئی لیکن اس کے باپ اور بھائی نے مار مار کر اسے گھر سے نکال دیا گاؤں کے سینکڑوں لوگ ان واقعات کے گواہ ہیں۔"

عارف عزیز کی بات ختم ہوئی تو میں نے بوڑھے اور اس کے بیٹے کو دوبارہ بلایا' اس واقعہ کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو بوڑھے کے ساتھ ساتھ اس کے بیٹے کا سر بھی جھک گیا' صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ناجائز تعلقات والی بات درست ہے۔ اس موقع پر میرے سب انسپکٹر نے بھی تصدیق کی کہ ان لوگوں کی شہرت ٹھیک نہیں۔ اس نے کہا کہ "صغراں نامی وہ عورت بہت گھومتی پھرتی ہے اور ایک دفعہ اسے ساتھ والے گاؤں کے نمبردار کی حویلی میں بھی دیکھا گیا تھا۔"

بوڑھا اور اس کا بیٹا ان باتوں پر ایک کمزور احتجاج کے سوا اور کچھ نہ کرسکے۔ عارف عزیز نے کہا "انسپکٹر صاحب ملک مشتاق کو بھی ان لوگوں نے بڑی دیر سے چکر میں ڈال رکھا ہے میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ صغراں ملک صاحب کی حویلی میں گئی تھی لیکن دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہاں وہ اپنی مرضی سے گئی ہوگی اس پر زبردستی نہیں کی گئی یہ اور بات ہے کہ بعد میں کسی وجہ سے وہ جھگڑ پڑی ہو۔"

رحموا اور اس کا باپ اب یوں بیٹھے تھے جیسے منہ میں زبان ہی نہیں ان کی مجرمانہ خاموشی مجھے کچھ کہنے پر مجبور کررہی تھی۔ اس دوران عارف عزیز نے میرے سامنے کئی گواہ پیش کیے جنہوں نے اس گھرانے کے مشکوک چال چلن کی تصدیق کی۔ میں نے یہ ساری باتیں خاموشی سے سنیں ایک بات بار بار میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو پھر ملک مشتاق کے ملازم کا بیان کس خانے میں فٹ ہوتا ہے۔ ممکن تھا کہ مشتاق سے اس کی کوئی ان بن ہو اور اس وجہ سے اس نے اپنے مالک کیخلاف مخبری کی ہو اگر میں چاہتا تو اس معاملے کو یہیں ختم کرسکتا تھا اس کیس میں سرے سے کوئی مدعی ہی نہیں تھا۔ رحموا اور اس کے باپ کو میں نے خود تھانے میں بلایا تھا ورنہ یقینی بات تھی وہ تھانے کا رُخ ہی نہ کرتے پھر بھی میرے دل میں خلش سی تھی۔ رحموا اور اس کے باپ نے جس طرح میرے سامنے خاموشی اختیار کی تھی عارف عزیز اور اس کے پیش کیے ہوئے گواہ ان دونوں کے منہ پر ان کی عورتوں کے بارے میں شرمناک باتیں کرتے رہے تھے اور وہ بے زبان جانوروں کی طرح سر جھکائے بیٹھے رہے تھے۔ اس سے دو نتیجے نکلتے تھے یا وہ واقعی بے غیرت اور بدکردار تھے یا انہیں اتنا دبا دیا گیا تھا کہ ایسی باتیں سن کر بھی ان کا خون جوش نہیں مارتا تھا اور ان کی زبان خاموش رہتی تھی۔

میں نے اپنے سب انسپکٹر بدری نرائن کو ہدایت کی کہ وہ اس معاملے میں کچھ اور تحقیق کرے۔ جس باغ میں ملک مشتاق اور دونوں لڑکیوں کے درمیان ہاتھا پائی

ہوئی وہاں سے ثبوت حاصل کئے جاسکتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ دوپہر کے وقت باغ کی رکھوالی پر کوئی شخص موجود ہو جو کسی خوف کی بنا پر لڑکیوں کی مدد کو نہ پہنچا ہو اس کو بھی کوشش سے بیان پر مجبور کیا جاسکتا تھا میں نے سب انسپکٹر سے کہا کہ اگر ہوسکے تو وہ صغراں یا شاداں میں سے کسی ایک کو بھی اپنے ساتھ موقع پر لے جائے۔

سب انسپکٹر نے دوسرے روز مجھے رپورٹ دی اس نے کہا کہ باغ کا رکھوالا عبدل نامی ایک شخص ہے اس کا کہنا ہے کہ کل دوپہر کے وقت وہ باغ میں موجود تھا لیکن اس کے سامنے کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا اور نہ ہی کسی کی چیخ و پکار سنائی دی۔ سب انسپکٹر نے یہ بھی بتایا کہ شاداں اس کے ساتھ گئی تھی وہ اس جگہ کی نشاندہی کرنے میں ناکام رہی ہے جہاں مشتاق نے اس سے ہاتھا پائی کی تھی اور مبینہ طور پر صغراں نے اس کے سر پر لسی کا دھاتی برتن مارا تھا۔ کچی زمین پر جدوجہد کے آثار دیر تک موجود رہتے ہیں لیکن چونکہ اس رات تیز آندھی چلی تھی اس لئے گمان کیا جاسکتا تھا کہ یہ نشانات معدوم ہوگئے ہوں بہرحال سب انسپکٹر کی رپورٹ بھی عارف عزیز اور دوسرے گواہوں کے موقف کی تائید کرتی تھی۔

میں شاید چند روز تک اس کیس کو بھول بھی جاتا لیکن اگلے روز ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے صورتحال کو یکسر بدل دیا۔ اس روز دس بجے کے قریب میں نقب زنی کی ایک واردات کے سلسلے میں ساتھ والے گاؤں چلا گیا وہاں سے میری واپسی رات نو بجے کے قریب ہوئی۔ میں واپس آیا تو تھانے سے پتہ چلا کہ صغراں نامی اس لڑکی نے کنویں میں کود کر خودکشی کرلی ہے یہ واقعہ کل رات کسی وقت پیش آیا تھا لیکن اس کا پتہ صبح دس بجے کے قریب لگا جب میں تھانے میں روانگی لکھوا کر جاچکا تھا۔ گاؤں کے کچھ لڑکوں نے کنویں میں صغراں کی لاش دریافت کی۔ اس کے گھر اطلاع پہنچائی گئی اس کے گھر والے جو پہلے ہی اس کی گمشدگی پر پریشان پھر رہے تھے روتے پیٹتے کنویں پر پہنچے اور دوپہر کے بعد بدنصیب لڑکی کی لاش نکلوا کر گاؤں میں لے آئے اس حادثے کا المناک پہلو جو پوسٹ مارٹم کے بعد سامنے آیا یہ تھا کہ متوقعہ اُمید سے تھی۔

خودکشی کی اطلاع ملتے ہی میرا دھیان فوراً ملک مشتاق کی طرف چلا گیا۔ صغراں نے اپنی جان دے کر ایک طرح قانون کے لئے بہت اہم ثبوت فراہم کیا تھا اس بات کا کہ وہ فاحشہ عورت نہیں تھی۔ اگر وہ فاحشہ عورت ہوتی تو اپنی بے حرمتی کو بے حرمتی نہ سمجھتی اور اپنی زندگی کو زندگی سمجھتی لیکن وہ بے زبان عورت جان پر کھیل گئی تھی۔ صرف یہ بتانے کے لئے کہ وہ بے گناہ تھی۔ جی چاہا کہ ملک مشتاق سامنے ہو اور میں اس ناپاک کے ٹکڑے کردُوں اور اس کے ساتھ ان لوگوں کو بھی عبرت ناک سزاؤں جو اس کی حمایت کررہے تھے اور اس حمایت میں صغراں اور اس کے گھر والوں پر طرح طرح کی الزام تراشیوں میں مصروف تھے۔ میں فوراً ملک مشتاق کی طرف روانہ ہونا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے اپنے سب انسپکٹر کا خیال آیا وہ اتنا سمجھدار ضرور تھا کہ اس خودکشی کے بعد ملک مشتاق کو دوبارہ گرفتار کرلیتا۔ میں نے اسے بلایا تو اس نے بتایا کہ وہ خودکشی کی اطلاع ملنے کے فوراً بعد ملک مشتاق کی گرفتاری کے لئے گیا تھا لیکن..... اس لیکن کے بعد کی بات سب انسپکٹر کے چہرے پر لکھی تھی۔ ملک مشتاق حالات کی سنگینی محسوس کرکے فرار ہوگیا تھا۔ مجھے اس خبر پر سخت دُکھ ہوا۔ میں نے سب انسپکٹر سے لاش کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کی جاچکی ہے۔ میں نے اسی وقت ایک چھاپہ مار پارٹی کو ساتھ لیا اور مجرم کی تلاش میں روانہ ہوگیا۔

میں نے دو روز تک علاقے کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن ملک مشتاق کا کچھ پتہ نہیں چلا اسے پناہ دینے کے شبے میں کوئی 20 عدد افراد گرفتار کئے تھے۔ کتنی ہی جگہوں پر چھاپہ مارا گیا لیکن مجرم ہاتھ نہیں آیا۔ آخر

مایوس ہوکر میں تھانے آ بیٹھا' قریباً دو ہفتے اسی ادھیڑ بن میں گزر گئے۔ ایک دن میں گھوڑے پر سوار امرودوں والے باغ کی طرف سے گزر رہا تھا کہ اچانک رُک گیا۔ یونہی اس مظلوم لڑکی کا خیال آ گیا تھا ایسے لگا جیسے اس فضا میں ابھی تک اس کی فریادی چیخیں گونج رہی ہیں۔ جس وقت وہ لسی کے برتن سے ملک مشتاق پر حملہ کر رہی تھی اسے کیا معلوم تھا وہ موت کے سفر پر روانہ ہو رہی ہے۔ اس کے اُٹھے ہوئے قدم چند روز کے اندر اندر اسے موت کی وادی میں لے جائیں گے۔ میں نے سوچا اس کے دل میں بھی اچھے دنوں کی آرزو ہوگی۔ اس نے بھی اپنے پہلے بچے کی پہلی مسکراہٹ کا سپنا دیکھا ہوگا۔ اس نے بھی اپنے اور اپنے گھر کے لئے چھوٹے چھوٹے منصوبے بنا رکھے ہوں گے لیکن وہ سب منصوبے دھرے رہ گئے تھے اسے جانا پڑا تھا اپنے نومولود بچے کا منہ چومے بغیر' اپنے شوہر کو خوشحال دیکھے بغیر' اپنے گھر کو سنوارے بغیر اسے اس ان چاہے سفر کے لئے مجبور کر دیا گیا تھا اور وہ چلی گئی ایک باغیرت عورت کی طرح اس سفر پر روانہ ہوگئی.....

دفعتاً میں ایک شخص کو دیکھ کر چونک گیا وہ باغ کے بیچوں بیچ کھڑا سر جھکا کر مجھے سلام کر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا کہ یہ باغ کا مالی ہے۔ میں گھوڑا بڑھا کر اس کے قریب چلا گیا۔ میں نے نام پوچھا تو اس نے عبدل بتایا' وہ مالی ہی تھا میں اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا باتوں کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ سب انسپکٹر سے سرے سے اس کی ملاقات ہی نہیں ہوئی' وہ کہنے لگا ''جناب چھوٹے تھانیدار صاحب (سب انسپکٹر) کو تو دیکھے ہوئے بھی مجھے دو ماہ ہوگئے ہیں۔''

میں اس کی بات سُن کر گھوڑے سے اُتر آیا۔ وہ مجھے بڑے احترام سے درختوں کے درمیان بچھی چارپائی تک لے آیا۔ میں نے اس سے کہا ''کیا اسے یقین ہے کہ چند دن پہلے چھوٹا تھانیدار اس سے ملنے باغ میں نہیں آیا تھا۔ وہ بڑے یقین سے سر ہلانے لگا۔ میں نے کہا ''اچھا یہ بتاؤ جس روز ملک مشتاق نے صغراں کو اغوا کیا تم کہاں تھے؟''

اس نے کہا ''جناب اس روز میں کچھ پودے لینے کے لئے نہر کی طرف گیا ہوا تھا باغ کی رکھوالی میری بیوی کر رہی تھی وہ کانوں سے بہری ہے اگر اس جگہ کوئی چیخ و پکار ہوئی بھی تھی تو وہ نہ سُن سکی ہوگی۔''

میں کافی دیر عبدل سے باتیں کرتا رہا اس کی بیوی سے بھی ملاقات ہوئی اس بات چیت سے اور کچھ حاصل تو نہیں ہوا لیکن یہ انکشاف ضرور ہوا کہ سب انسپکٹر بدری نرائن نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ عبدل سے بیان لے کر آیا ہے۔ اس واقعے نے مجھے سب انسپکٹر کی طرف سے ہوشیار کر دیا اور مجھے یہ بھی شک ہونے لگا کہ ملک مشتاق کو فرار ہونے کا موقع اسی نے دیا ہوگا۔

تھانے آ کر میں نے بدری نرائن سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے اعتراف کیا کہ اس نے عبدل کا بیان نہیں لیا تھا لیکن اس کوتاہی کی وضاحت اس نے یہ کی کہ ایک مصروفیت کی وجہ سے وہ بیان لینے نہیں جا سکا تھا شاید اس کا خیال تھا کہ میں اس بات کو درگزر کروں گا لیکن مجھے اس معاملے میں سازش نظر آ رہی تھی۔ میں نے جب بال کی کھال اُتاری تو سب انسپکٹر برہم ہوگیا اور بولا ''خان صاحب آپ خوامخواہ بات کو طول دے رہے ہیں۔ عبدل نے یہی بیان دیا ہے نا کہ اسے کچھ معلوم نہیں اور یہی میں نے آپ کو لکھوایا تھا میرے جانے یا نہ جانے سے کیا فرق پڑا ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ اس کی زبان سے کوئی اور بول رہا ہے۔ شاید اسے چودھری حاکم دین یا کسی اور بااثر شخص کی شہ تھی۔

اگلے دو روز میں' میں نے عملے کے کچھ افراد سے اس بات کا بھی پتہ چلا لیا کہ سب انسپکٹر بدری نرائن نے مشتاق کو جان بوجھ کے فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔ خودکشی کی اطلاع ملنے کے بعد اس نے مشتاق کی

گرفتاری میں دیدہ دانستہ تاخیر کی اور بعد میں جب پتہ چلا کہ وہ گھر میں موجود نہیں تو اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی حتیٰ کہ اس کے ڈیرے تک جانے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کی گئی۔ میں نے سب انسپکٹر کو بلایا اور اسے بتایا کہ اس کے بارے میں کس قسم کی اطلاعات آرہی ہیں۔ اس روز سب انسپکٹر کا اصل روپ مجھ پر عیاں ہوا اس نے نہ صرف میرے غصے کی کوئی پرواہ نہ کی بلکہ یہ بھی کہنے لگا کہ وہ وہی کرے گا جو اپنے طور پر درست سمجھے گا۔ میں نے اسے کہا کہ اس تھانے کا انچارج میں ہوں یہاں جو کچھ ہوگا میری مرضی سے اور میرے علم میں لاکر ہوگا۔

لیکن وہ طنزیہ بولا ''یہاں جن کی مرضی چلتی ہے آپ کو بہت جلد معلوم ہوجائے گا۔''

اس کا اشارہ صاف طور پر اپنے سرپرستوں کی طرف تھا جن میں چودھری حاکم دین پیش پیش تھا۔

اس واقعہ کے بعد سب انسپکٹر سے میری مستقل چپقلش چل نکلی۔ میں بے گناہ صغراں کی موت کسی طور فراموش نہیں کرسکتا تھا۔ جہاں اس مظلوم لڑکی کا خیال آتے ہی مشتاق کی صورت میری نگاہوں میں گھوم جاتی تھی وہاں بدری نرائن کا چہرہ بھی آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ اس نے تفتیش کے آغاز میں مجھے اندھیرے میں رکھ کر بڑا ظلم کیا تھا۔ اگر درست تفتیش ہوتی تو ہوسکتا تھا میں مشتاق کی ضمانت نہ لیتا یا اسے دوبارہ گرفتار کرلیتا لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ ظالم کی آزادی نے مظلوم کا حوصلہ مزید پست کردیا عین ممکن تھا کہ صغراں نے صرف اس وجہ سے خودکشی کرلی ہو کہ اس کی عزت لوٹنے والا آزادانہ پھر رہا ہے اور ہوسکتا ہے کل پھر وہ اپنے ظلم کی تلوار اس کی گردن پر رکھ دے۔ بدری نرائن نے مشتاق کی گرفتاری میں جو مجرمانہ غفلت برتی اس نے بھی میرے کام کو اور مشکل کردیا تھا۔ تاہم میں مشتاق کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھا۔ دوسری طرف میں نے قانونی تقاضے کے مطابق سب انسپکٹر کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کرکے ضعی ہیڈ کوارٹر پہنچا دی۔ مجھے توقع تھی کہ بدری نرائن کو لائن حاضر کردیا جائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا ہاں ہیڈ کوارٹر کی طرف سے ڈی ایس پی راج گوپال کو معاملے کی تحقیق کا حکم دیا گیا۔ ڈی ایس پی نے اس سلسلے میں میرے بیان کے علاوہ باغ کے مالی عبدل اور چند پولیس اہلکاروں کے بیان بھی لئے ان تمام بیانوں سے ثابت ہوتا تھا کہ سب انسپکٹر نے مجرمانہ غفلت برتی ہے لیکن سب انسپکٹر کیخلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی اور اور بہت جلد میں جان گیا کہ ڈی ایس پی راج گوپال بدری نرائن اور اس کے سرپرستوں سے ملا ہوا ہے۔

دوسری طرف سب انسپکٹر کا رویہ اور بھی ناقابل برداشت ہوگیا تھا اور وہ بلا جھجک عملے سے کہتا پھرتا تھا کہ انسپکٹر صاحب نے میری شکایت کرکے بھی کیا کرلیا ہے بلکہ اس واقعہ کے بعد بدری نرائن نے تھانے کے بعض معاملات میں براہ راست ڈی ایس پی راج گوپال سے مشورہ لینا شروع کردیا۔ ایک طرح وہ مجھے ایس ایچ او ماننے سے بھی انکار کررہا تھا۔ تھانے کا عملہ بھی دو حصوں میں بٹ گیا تھا ایک گروپ جس میں ہندو اہلکار شامل تھے بدری نرائن کو ہی ایس ایچ او سمجھتا تھا کشیدگی کا یہ ماحول میرے اعصاب کو بُری طرح متاثر کررہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ کسی روز میں اپنی برداشت کھو کر اصل روپ میں آجاؤں گا اور اگر میرے اندر کا انسپکٹر نواز خان ایک بار بھڑک اُٹھتا تو بہت گڑ بڑ ہونا تھی۔ میں اب تک اگر خاموش تھا تو صرف اس لئے کہ ابھی میرے پاؤں پوری طرح اس تھانے میں نہیں جمے تھے اور شاید بدری نرائن بھی اس بات کو سمجھتا تھا وہ مجھے پاؤں جمانے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کی ریشہ دوانیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ وہ ہر طرح مجھے زچ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ایک روز میں نے ملک مشتاق کی فائل طلب کی تو پتہ چلا کہ فائل ریکارڈ سے غائب ہے

کوشش کے باوجود فائل نہیں ملی تو میں نے سب انسپکٹر کو بلایا میرے سوال کرتے ہی وہ آگ بگولا ہوگیا۔

نواز صاحب آپ مجھ پر شک کرتے ہیں بہانے بہانے سے ذلیل کرتے ہیں مجھے عملے کے سامنے .....لیکن یاد رکھئے۔ میں آپ کا نہیں سرکار کا ملازم ہوں آپ کو جواب دینے کا پابند نہیں ہوں میں اس بات کا جواب بھی ڈی ایس پی صاحب کو دوں گا۔

غصے سے میرا دماغ کھول اٹھا پہلی بار میں نے بدری نرائن کو بدری کے نام سے مخاطب کیا۔ میں نے کہا ''بدری لگتا ہے تجھے ابھی تک حرام خور افسروں سے ہی پالا پڑا ہے میرا نام انسپکٹر نواز خان ہے میں اپنے سامنے بدتمیزی کرنے والے کا منہ توڑ دیا کرتا ہوں۔''

بدری نرائن اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا ''انسپکٹر صاحب یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا یہاں اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی وہم ہے تو دل سے نکال دیں۔''

مجھے بدری سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی اگر میں مزید کچھ کہتا تو ہاتھا پائی ہوجاتی میں اس سے کمزور نہیں تھا لیکن وردیاں پہن کر اس طرح تھانے میں گتھم گتھا ہونا کم ازکم میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ میں صرف قہر آلود نظروں سے بدری کو دیکھ کر رہ گیا۔ اس نے نہایت بدتمیزی سے کرسی ایک طرف لڑھکائی اور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ اس شام میں تھانے سے گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ چودھری حاکم دین کا منیجر عارف عزیز آ گیا۔ اس نے کہا کہ ''چودھری صاحب آپ سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔'' میں چونکہ فارغ تھا اس لئے اسی وقت عزیز کے ساتھ چل دیا۔ چودھری کی حویلی دیہاتی اور شہری طرز تعمیر کا ملا جلا نمونہ پیش کرتی تھی یہی حال چودھری کے حلئے اور اس کی بول چال کا تھا۔ وہ نہ ان پڑھ تھا اور نہ پڑھے لکھوں میں شمار کیا جاسکتا تھا..... ہم اندر پہنچے تو اس نے اپنی سجی سجائی بیٹھک میں میرا استقبال کیا۔ ایک نہایت منحوس شکل والا بلڈاگ اس کے قدموں میں بیٹھا دُم ہلا رہ تھا۔ چودھری ایک منقشی کرسی پر براجمان تھا کرسی کی دائیں طرف ایک ٹرے میں گوشت کے ٹکڑے رکھے تھے چودھری کبھی کبھی گوشت کا ایک ٹکڑا ہوا میں اچھال دیتا جسے بلڈاگ لپک کر منہ میں دبوچ لیتا۔ میں چودھری کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا عارف عزیز ادب سے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ چودھری نے بارعب آواز میں پوچھا۔

''ایس پی ہاشمی آیا تھا؟''

عارف عزیز بولا ''جی ہاں آپ ہی نے بلایا تھا وہ آدھ گھنٹے سے باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

چودھری نے ہاتھ سے اشارہ کیا' عارف عزیز نے ڈوری کھینچ کر ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ کھڑکی میں بڑے بڑے شیشے لگے تھے دوسری طرف کا منظر میرے لئے حیران کن تھا۔ ایس پی ہاشمی ایک کرسی پر بیٹھے بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں رومال تھا جس سے وہ بار بار اپنے گنجے سر کا پسینہ پونچھتے تھے۔ چودھری نے اشارہ کیا اور عارف عزیز نے پردہ پھر برابر کر دیا۔

چودھری بولا۔

''ہاشمی سے کہہ دو میں مصروف ہوں اس لئے آج نہیں مل سکتا۔''

''جو حکم چودھری صاحب۔'' عارف عزیز سر جھکا کر بولا۔

چودھری حکم دین نے مجھے نفسیاتی دباؤ میں لانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں وہ اپنی توقع سے زیادہ کامیاب ہوا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ایس پی تک اس کے بلاوے پر یہاں کھنچے چلے آئے تھے اور آدھ گھنٹے سے باہر بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے بہرحال میں نے خود کو سنبھالا اور کہا ''فرمائیے چودھری صاحب مجھے کس لئے یاد کیا تھا؟''

چودھری نے کہا ''انسپکٹر صاحب آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ پر کوئی رعب ڈالنے کی کوشش کر رہا ہوں

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور فخریہ کاوش

اسلامی واقعات نمبر

قیمت ...... [illegible] شائع ہو گیا ہے۔

☆ رسولِ خدا، خلفاء راشدینؓ، صحابہ کرامؓ اور صالحینؒ کی قابلِ تقلید زندگیوں سے لیے گئے سنہری واقعات ....

☆ دورِ نبوت، خلافتِ راشدہ اور تاریخ میں موجود عدل و انصاف کی عظیم روایات ....

☆ مسلم خواتین کی ذہانت متانت اور شجاعت کے حیرت انگیز قصے ....

☆ دورِ جدید میں نئی نسل کے جذبہ ایمانی کو از سرِ نو تازہ کر دینے والے روح پرور واقعات ....

☆ ہر مسلم گھرانے کی لائبریری کی زینت، نوجوانوں کے لئے مشعل راہ۔ دعاؤں کے ساتھ ....

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 042-7245412

Pakistanipoint.com

میں نے صرف ایک حقیقت آپ کو دکھائی ہے۔ اگر میں چاہتا تو میرے بلاوے کی جگہ آپ کو نوکری سے برخاستگی کا پروانہ بھی مل سکتا تھا۔ لیکن نہیں میں کسی کی روزی پر لات نہیں مارتا صرف اتنا چاہتا ہوں کہ میرے کام سیدھے سادے طریقے سے ہوتے رہیں اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں کیلئے مجھے پریشان نہ ہونا پڑے۔ آپ ایک معمولی ملازم ہیں تاہم آپ کی ایک سرکاری حیثیت ہے اور میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ اس سرکاری حیثیت سے میرا ٹکراؤ نہ ہو۔ کام وہی اچھا ہوتا ہے جو سیدھے سادے طریقے سے ہو جائے۔''

میں نے کہا ''چودھری صاحب میں آپ کا مطلب کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔ کیا آپ تھوڑی سی وضاحت کریں گے۔''

''ضرور ضرور۔'' چودھری صاحب نے کہا۔ پھر عارف عزیز کو اشارہ کیا' وہ ایک دیوار گیر الماری کی طرف بڑھا اور سادہ کاغذ اور قلم لے آیا۔ پھر اس نے اپنی بوشرٹ کی جیب سے ایک اور تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور تینوں چیزیں میرے سامنے تپائی پر رکھ کر باادب کھڑا ہو گیا چودھری پرسکون آواز میں بولا۔

''اس تحریر کو پڑھ لو انسپکٹر صاحب میں چاہتا ہوں کہ ملک مشتاق کا جو چالان تیار ہو کر عدالت میں جائے وہ اس تحریر کے مطابق ہو۔''

میں نے جلدی جلدی تحریر پر نظریں دوڑائیں کسی وکیل یا پولیس والے کا کام لگتا تھا پھر اچانک میرے ذہن میں سب انسپکٹر بدری نرائن کا نام گونجا اور میں سمجھ گیا کہ یہ مضمون اسی کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ اس تحریر میں وہ تمام نقطے بیان کر دیئے گئے تھے جن سے میری درج کی ہوئی ایف آئی آر باطل ہو جاتی تھی اور میرا تیار شدہ چالان ملک مشتاق کی بریت کا پروانہ بن سکتا تھا۔ میں نے کاغذ پڑھ کر تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور سادے کاغذ کی طرف دیکھنے لگا۔ ''جی چودھری صاحب اور کوئی خدمت؟''

چودھری نے سادے کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''انسپکٹر صاحب بدری نرائن بڑا بھلا مانس بچہ ہے بس ذرا سر پھرا ضرور ہے اگر کبھی وہ کوئی اونچ نیچ کر دیا کرے تو آپ برداشت کر لیا کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ نے اس کیخلاف جو رپورٹ دی تھی وہ واپس لے لیں۔'' میری خالی نظریں سادے کاغذ پر مرکوز تھیں اور ذہن میں آگ سی بھڑک رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں چودھری حاکم دین مجھے حکم دے رہا تھا کہ میں یا تو اس تھانے سے بھاگ جاؤں یا بدری نرائن سے مستقل بے عزتی کرروانے کے لئے خود کو تیار رکھوں۔ اب یہ بات بھی یقینی نظر آ رہی تھی کہ ریکارڈ سے مشتاق کی فائل بدری نرائن ہی نے غائب کی ہوگی۔ میری خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو چودھری حقہ گڑ گڑا کر بولا ''کیا سوچ رہے ہیں انسپکٹر صاحب!''

میں نے تحریر شدہ کاغذ تہہ کرتے ہوئے کہا ''چودھری صاحب میں سوچنے کے لئے ایک آدھ دن کی مہلت چاہتا ہوں۔''

چودھری مسکرا کر بولا ''کوئی ایسی عذر طلب بات تو نہیں ہے انسپکٹر صاحب لیکن لگتا ہے آپ کو سوچنے کی بیماری ہے خیر ایسے ہی سہی آپ مجھے کل اس وقت اپنے جواب سے آگاہ کر دیں۔''

''اب مجھے اجازت دیجئے۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا' لیکن میرے کھڑے ہوتے ہی دیوہیکل کتا پھر کھڑا ہو گیا اور میری طرف دیکھ کر غرانے لگا اس کی دُم تیزی سے گردش کر رہی تھی۔

''مس ریٹا۔'' چودھری زور سے بولا۔

کمرے کی بائیں طرف ایک دروازے کا پردہ ہلا اور ایک انگریز عورت تیزی سے اندر داخل ہوئی اس نے ایک میلا کچیلا اسکرٹ پہن رکھا تھا اور آنکھوں میں نظر کی عینک تھی۔ چودھری نے اسے اشارہ کیا وہ تیزی سے لپکی اور کتے کی زنجیر تھام کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے غور سے دیکھا اس کی عمر اتنی زیادہ نہیں تھی یہی کوئی

Pakistanipoint.com

چوبیس پچیس سال رہی ہوگی وہ دلکش بدن والی ایک بھرپور عورت تھی مگر حلیے کی وجہ سے اصل عمر سے پانچ چھ سال بڑی لگتی تھی۔ عینک کے پیچھے اس کی شفاف نیلگوں آنکھیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں ایک لمحے کے لئے وہ مجھے کوئی مظلوم عورت دکھائی دی۔ اتنے میں چودھری حاکم دین نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ کتے کو لے کر باہر نکل گئی میں ابھی تک اپنی جگہ کھڑا تھا۔

''بیٹھ جاؤ تھانیدار۔'' چودھری نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ''چائے بن رہی ہے پی کر جانا۔''

میں بادل نخواستہ بیٹھ گیا۔ میری نگاہوں میں ابھی تک انگریز عورت کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ چودھری بولا ''تھانیدار صاحب میرا خیال ہے آپ اس انگریز عورت کی یہاں موجودگی پر حیران ہو رہے ہیں۔ اس کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ چودھری نے حقے کی نالی تھام کر کش لیا اور بولا ''چند ماہ پہلے کی بات ہے شیرو بیمار ہوگیا' شیرو میرے کتے کا نام ہے۔ عارف اسے گاڑی میں ڈال کر جام نگر لے گیا۔ تم جانتے ہی ہو جام نگر کافی بڑا قصبہ ہے وہاں دو تین ایم بی بی ایس ڈاکٹر موجود ہیں لیکن جس وقت عارف شیرو کو لے کر پہنچا صرف ایک کلینک کھلا تھا یہ کلینک مس ریٹا کا تھا۔

مس ریٹا اپنے مریضوں کو دیکھنے میں مصروف تھی عارف عزیز نے اس سے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ چودھری صاحب کا کتا ہے اسے دیکھ لیں۔ مس ریٹا نے کہا کہ وہ کتے کو نہیں دیکھ سکتی اسے کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس شہر لے جائیں۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ کتے کو نہیں دیکھ سکتی تھی بات یہ تھی کہ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ کتے کے اگلے پنجے پر زخم آ گیا تھا زخم پر کوئی سی دوائی لگا کر پٹی باندھ دینا اس کے لئے کوئی مشکل نہیں تھا لیکن وہ اس کام سے گھن کھا رہی تھی۔ جانتے ہو انسپکٹر مس ریٹا کو اس بدتمیزی کی کیا سزا ملی وہ اب صرف میرے کتے کی ڈاکٹر ہے۔ وہ اس کی دیکھ بھال کرتی ہے اس کی خوراک کا خیال رکھتی ہے اس کے ساتھ سوتی اور ساتھ جاگتی ہے۔ اس کام کا اسے اتنا معاوضہ ملتا ہے کہ وہ دس کلینک چلا کر بھی نہیں کما سکتی تھی۔ شاید وہ اسے ذلیل کام سمجھتی ہو لیکن وہ یہ کام کرنے پر مجبور ہے۔''

آخری جملہ کہتے کہتے چودھری کی آنکھوں میں عجیب پراسراری چمک نظر آنے لگی۔ میں فوری طور پر اس چمک کو کوئی نام نہ دے سکا اس دوران ملازم نے چائے کے برتن تپائی پر سجا دیئے۔ عارف عزیز نہایت ادب سے جھک کر چائے بنانے لگا۔

میں جتنا سوچ رہا تھا ذہن میں غصے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ چودھری حاکم دین نے اپنے گھر بلا کر مجھے ہر طرف سے ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ صرف آغاز تھا مجھے فضا میں ان دیکھے خطرات کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے چودھری سے خوف نہیں آ رہا تھا بلکہ خود سے ڈر لگ رہا تھا۔ چودھری کو رام کرنا تو کوئی بات نہیں تھی میں فرض کو پس پشت ڈال کر چودھری کی ہاں میں ہاں ملانے لگتا تو وہ رام ہی رام تھا لیکن میں جانتا تھا میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرے اندر کا انسپکٹر چودھری کی لاقانونیت کے سامنے کبھی نہیں جھکے گا پھر نتیجہ کیا ہوگا ٹکراؤ جرم اور قانون کا ازلی ٹکراؤ۔

میں نے سوچا مجھے سب سے پہلے ایس ایس پی سے بات کرنی چاہئے ایس ایس پی مسٹر رچرڈ کربی مجھے اچھی طرح جانتے تھے اور مجھے معلوم تھا وہ کسی چودھری نواب یا جاگیردار کے سامنے جھکنے والے آدمی نہیں' وہ وہی کریں گے جو قانوناً درست ہوگا۔ اور جس سے قانون کی بالادستی قائم ہوگی۔ میں یہاں انگریز حاکموں کی تعریف کرنا نہیں چاہتا لیکن جہاں ان میں بے شمار خامیاں تھیں وہاں چند خوبیاں بھی تھیں۔ انگریز پولیس افسر قانون کے معاملے میں بڑے سخت تھے وہ حیثیت دیکھ کر نہیں جرم دیکھ کر دفعہ لگانے کے قائل تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس دور میں ایک نوجوان عورت گہنے پہن کر تنہا پورا پنجاب گھوم جاتی تھی اور کوئی اس

کی طرف انگلی اٹھانے والا نہیں ہوتا تھا اس دور میں قانون کی جو بالادستی قائم تھی اس کے بارے میں کئی قصے آپ نے سنے ہوں گے درست ہے کہ وہ سب صحیح نہیں ان میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔

میں جب چودھری کی حویلی سے واپس آیا شام ہونے والی تھی۔ میرا دماغ بُری طرح کھول رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ اس کیفیت میں بدری نرائن سے میرا سامنا نہ ہو تو بہتر ہے لیکن جونہی میں نے تھانے میں قدم رکھا بدری نرائن سامنے بیٹھا نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں سازشی چمک میں صاف محسوس کر رہا تھا۔ اس کے پاس اس کے تین حمایتی کانسٹیبل بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کانسٹیبلوں نے اُٹھ کر مجھے سیلوٹ کیا لیکن بدری اطمینان سے ٹانگیں پسارے بیٹھا رہا۔ پانی اب سر سے گزرتا محسوس ہو رہا تھا' بدری کی بدتمیزی نظرانداز کرتا ہوا میں اپنے کمرے میں آ بیٹھا اس سارے جوڑ توڑ کا ذمہ دار بدری تھا۔ یقیناً صبح ہونے والی جھڑپ کے بعد اس نے چودھری حاکم دین کے کان بھرے تھے اور اس نے مجھے حویلی میں طلب کیا تھا اچانک مجھے یاد آیا کہ حویلی روانہ ہونے سے پہلے میں نے بدری کو ساتھ والے گاؤں میں چند اشخاص کے بیان لینے بھیجا تھا (یہ وہی نقب زنی والا کیس تھا) محرر کے ہاتھ میں نے بدری کو بلایا تو وہ منہ پھیلائے میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے بیانوں کے بارے پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ تو گیا ہی نہیں۔ میں جو پہلے ہی غصے میں تھا اس اطلاع پ بھنا اُٹھا اس سے نہ جانے کی وجہ پوچھی تو وہ بولا کہ میری ڈیوٹی کا وقت ختم ہونے والا ہے اگر میں بیان لینے چلا جاتا تو دیر ہو جاتی۔ میں نے کہا "اگر ایسی بات تھی تو تو مجھے اس وقت بتا دیتا اب تو اے ایس آئی بھی جا چکا ہے۔"

وہ بدتمیزی سے بولا "تو پھر میں کیا کروں؟"۔

میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا "بدری نرائن وہ بیان آج بہت ضروری ہیں اور تم ہی وہ بیان لینے جاؤ گے اور اسی وقت..... سمجھ رہے ہو میری بات۔"

میں نے انگلی اس کی طرف اُٹھا کر کہا "بدری تم مجھے جانتے نہیں ہو جو میں کہہ رہا ہوں ویسے ہی کرو ورنہ پچھتاؤ گے۔"

"مر گئے پچھتاوے دینے والے۔" وہ ہاتھ نچا کر بولا اور واپس مڑا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا کندھا تھام لیا' اس نے جلتی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ پیچھے کر دیا۔ میں اپنی برداشت کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا' بدری چند لمحے بے خوفی سے میری آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر بڑبڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

"میری بات سنو بدری۔" میں نے غصے سے کہا۔

بدری نے جیسے سنا ہی نہیں وہ لاپروائی سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ عملے کے افراد جو ہماری تکرار سن کر دروازے کے سامنے جمع ہو گئے تھے بدری کو باہر نکلتے دیکھ کر اِدھر اُدھر ہٹ..... یہ بدری سے میری آخری ملاقات تھی۔ رات میں دیر تک ایس ایس پی صاحب سے ملنے اور ان سے بات کرنے کے بارے میں سوچتا رہا۔ نجانے کس وقت نیند آ گئی۔ صبح کوئی چار بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ ابھی کافی اندھیرا تھا میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا سامنے میرا ہیڈ کانسٹیبل شاہو کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں میرے پوچھنے سے پہلے ہی اس نے بتایا "چودھری صاحب بدری قتل ہو گیا ہے۔"

"کون بدری؟" میں نے اپنے خوابیدہ ذہن کو بیدار کرتے ہوئے پوچھا۔

"سب انسپکٹر بدری نرائن جی..... اور کون؟ اس کی لاش اوپر والے کمرے میں پڑی ہے۔"

ابھی میں اس جھٹکے سے سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل نے ایک اور اطلاع دے کر مجھے جھنجوڑ دیا۔

اس نے کہا "خان صاحب بدری نرائن نے اپنے

نزاعی بیان میں کہا ہے.....اس پر آپ نے حملہ کیا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو شاہو۔'' میں حیرانی سے بولا۔

''جی ہاں خان صاحب۔'' ہیڈ کانسٹیبل جو میری بہت عزت کرتا تھا گلوگیر آواز میں بولا'' کانسٹیبل راجو اور حوالدار کلدیپ نے کہا ہے کہ بدری نے مرتے وقت آپ کا نام لیا ہے۔'' میں خاموشی سے ہیڈ کانسٹیبل کا منہ تک رہا تھا۔ اس نے مجھے یہ کہہ کر پھر چونکا دیا'' جناب مجھے پتہ چلا ہے کہ ڈی ایس پی راج گوپال کو اطلاع پہنچا دی گئی ہے اور وہ جلدی یہاں پہنچنے والا ہے۔''

میں ہیڈ کانسٹیبل کی ساری بات سمجھ رہا تھا۔ میں تھانے سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر موجود تھا اور مجھے اس واقعہ کی اطلاع نہیں پہنچائی گئی تھی جبکہ کئی میل دُور سے ڈی ایس پی کو بلایا گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا میرے خلاف تھانے میں کسی گہری سازش کا تانا بانا بنا جا رہا تھا۔ ہوسکتا تھا تھوڑی دیر بعد ڈی ایس پی مجھے گرفتار کرنے کے لئے یہاں پہنچ جاتا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کسی منصوبے کے سبب یا اتفاقیہ طور پر میں بُری طرح پھنس گیا ہوں۔ اس موقع پر ایک بار پھر میری نگاہوں میں ایس ایس پی رچرڈ کربی کا چہرہ گھوم گیا کتنا اچھا ہوتا اگر میں رات ہی ان سے رابطہ قائم کرلیتا بہرحال اب بھی مجھے دیر نہیں کرنی چاہئے تھی۔ میں نے فوراً لباس بدلا اور ان کی طرف روانہ ہوگیا۔

ابھی میں گاؤں سے بمشکل دو کوس دُور نکلا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے گرد اُڑتی دکھائی دی۔ جلد ہی میں ڈی ایس پی گوپال کی جیپ پہچان چکا تھا وہ نہایت تیزی سے میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ میں گھوڑے پر سوار تھا اور راستہ ایسا تھا کہ میں بآسانی راج گوپال کو چکمہ دے سکتا تھا لیکن میں کوئی مجرم نہیں تھا۔ ایک ذمہ دار پولیس افسر تھا میرا ریکارڈ اپنے ساتھی انسپکٹروں سے کہیں اچھا تھا اور محکمے میں میری عزت تھی۔ میں قانون سے بھاگ کر خود کو مجرم کیوں بناتا؟ میں نے گھوڑا آہستہ کرکے ایک طرف کھڑا کردیا اور ڈی ایس پی کی جیپ کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحے بعد سیاہ جیپ مجھ تک پہنچ گئی اس پر ڈی ایس پی کے علاوہ عملے کے پانچ چھ مسلح افراد بھی سوار تھے۔ میں نے گھوڑے سے اُتر کر ڈی ایس پی کو سیلوٹ کیا وہ سیلوٹ کا جواب دیئے بغیر جیپ سے اُترا اور دھیمے قدموں سے چلتا میرے پاس پہنچ گیا۔

''اپنا ریوالور مجھے دے دو نواز خان۔'' وہ ہاتھ بڑھا کر بولا۔

اس کا لہجہ مجھے یہ سمجھانے کے لئے کافی تھا کہ اس وقت اس کی نظر میں' میں ایک قاتل ہوں۔ میں نے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ریوالور ڈی ایس پی کو تھما دیا اس نے مجھے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا' میں خاموشی سے جیپ میں بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم تھا ڈی ایس پی سے کچھ کہنے سننے کا فائدہ نہیں اس کی نظروں میں' میں نہ صرف ایک قاتل تھا بلکہ فرار ہونے کی کوشش بھی کررہا تھا۔ راستے بھر ڈی ایس پی صاحب نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ تھانے پہنچ کر اس کا رویہ ایک دم بدل گیا نجانے کب سے اس کے اندر میرے لئے نفرت کا لاوا پک رہا تھا آج اس نفرت کے اظہار کا بہترین موقع تھا اس نے ایک جھٹکے سے میرے سر پر سے ٹوپی اُتار لی اور پیٹی کھولنے کا حکم دیا۔ مجھے اتنی جلدی ایسے سلوک کی توقع نہیں تھی بہرحال میں نے پیٹی اُتار کر اسے تھما دی اس نے مجھے مجرموں کی طرح اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اور پوچھ گچھ شروع کردی۔ تھانے کی عمارت دو منزلہ تھی پانچ یا چھ کمرے بالائی منزل پر بھی تھے یہ کمرے ملازمین کی رہائش کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ سب انسپکٹر بدری نرائن کا قتل ان میں سے ایک کمرے میں ہوا تھا۔ اسے سینے میں گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ فائر کی آواز سن کر دوسرے کمرے میں سوئے ہوئے ملازمین ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے تھے۔ کانسٹیبل راجو اور حوالدار کلدیپ سب سے پہلے بدری کے پاس پہنچے بدری کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ لوہے کے اسپرنگوں والے پلنگ

کے نیچے پڑا آخری سانسیں لے رہا تھا۔ مبینہ طور پر اس نے کہا کہ انسپکٹر نواز نے اسے اپنے ریوالور سے گولی ماری ہے اور اس دروازے سے نکل گیا۔

ڈی ایس پی نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''دیکھو نواز خان تمہارے خلاف بڑی مضبوط شہادتیں موجود ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ہی تھانے میں تمہاری بے عزتی ہو۔ اس لئے بہتر ہے کہ اقبال جرم کرلو۔''

ڈی ایس پی کی بات پر میرا دل بھر آیا۔ برسوں کی خدمت اور فرض شناسی کا یہ صلہ مل رہا تھا مجھے چند جھوٹی شہادتوں پر اعتبار کرکے مجھے بلا جھجک قاتل قرار دیا جارہا تھا ایسا سلوک تو عادی مجرموں اور پیشہ ور قاتلوں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ میں نے کہا۔

''ڈی ایس پی صاحب مجھے جھوٹی گواہی دینے والوں پر افسوس نہیں مگر آپ پر افسوس ہے کہ ایک ذمہ دار افسر ہوکر بھی بلا تفتیش مجھے قاتل قرار دے رہے ہیں۔'' ''بلا تفتیش کیوں؟'' ڈی ایس پی گرج کر بولا ''اب کیا مُردہ اُٹھ کر بتائے گا کہ مجھے اس نے گولی ماری ہے ساری شہادتیں تیرے خلاف ہیں تم بدری نرائن سے پرانی پرخاش رکھتے تھے کل شام تم دونوں میں ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہی انتقام میں اندھے ہوکر تم نے اسے گولی ماردی تمہاری بدقسمتی کہ حوالدار کلدیپ ایک کانسٹیبل کے ساتھ بدری کے مرنے سے پہلے اس تک پہنچ گیا۔ بدری نے اپنے نزاعی بیان میں تمہارے جرم کا بھانڈا پھوڑ دیا تم فرار ہونے کی کوشش میں تھے کہ پکڑے گئے اس کے بعد اور کیا ثبوت چاہئیں تمہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ ڈی ایس پی سے کچھ کہنا سننا فضول ہے۔ میں نے کہا ''گوپال صاحب آپ جو سمجھتے ہیں سمجھتے رہیں میں اپنا بیان صرف ایس ایس پی صاحب کو دُوں گا۔''

''ایس ایس پی کو بیان دوگے۔'' گوپال خطرناک لہجے میں بولا ''میں تیرا باپ یہاں بھاڑ جھونکنے بیٹھا ہوں دیکھتا ہوں کون ایس ایس پی آتا ہے یہاں تیرا بیان لینے۔''

''گوپال ذرا تمیز سے بات کر میں گالی سننے کا عادی نہیں ہوں۔'' میں نے بھی اس کے عہدے کا لحاظ کئے بغیر جواب دیا۔

''حرام زادے گالیاں چھوڑ تُو تو جوتیاں بھی سر جھکا کر کھائے گا۔'' ڈی ایس پی گوپال گرجا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر جڑ دیا۔

اب انتہا ہوچکی تھی میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی میرا داہنا ہاتھ گھوما اور پوری قوت سے ڈی ایس پی گوپال کے رخسار پر پڑا۔ اس کی کیپ اچھل کر دُور جا گری۔ اگلے ہی لمحے میرا ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ چکا تھا میں نے اسے اپنی طرف جھٹکا دیا اور وہ میز اُلٹتا ہوا فرش پر جا گرا لیکن پھر اس سے پہلے کہ میں اس پر ٹوٹ پڑتا دروازہ کھلا اور عملے کے چار پانچ مسلح افراد اندر آ گھسے۔

''پکڑ لو اسے۔'' ڈی ایس پی گوپال ہانپتا ہوا بولا۔

دو ہیڈ کانسٹیبل تیزی سے آگے بڑھے اور انہوں نے میرے بازو گرفت میں لے لئے۔ ایک ایس آئی نے جو گوپال کے ساتھ ہی شہر سے آیا تھا ریوالور نکال کر میری کنپٹی پر رکھ دیا۔ ڈی ایس پی گوپال کا چہرہ سرخ تھا اور آنکھوں سے جیسے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اس نے مجھے ایک غلیظ گالی دی اور دیوانوں کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ مجھے تین آدمیوں نے جکڑ کر بے بس کر رکھا تھا اس لئے میں گوپال کی ٹھوکریں اور گھونسے سہنے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔ اس نے پاگل کتے کی طرح کھینچ کھینچ کر میری قمیص پھاڑ دی۔ اور اس وقت تک مارتا رہا جب تک اس کے ہاتھ پاؤں شل نہ ہوگئے میں جانتا تھا اس وقت گوپال ڈی ایس پی نہیں بلکہ چودھری حاکم دین کا ایک زرخرید بندہ ہے جو اپنے مالک کو خوش کرنے کے لئے قانون کی دھجیاں بکھیر رہا ہے۔ چودھری حکم

دین اور گوپال کے زدیک میں بدری نرائن کا قاتل تھا اور بدری نرائن چودھری حکم دین کا پیارا پالتو کے قتل پر وہ میرا جو بھی حشر کرتے کم تھا گوپال جب تھک کر چور ہوگیا تو ایک غلیظ گالی دے کر ہانپتا ہوا بولا۔

''..... بند کردو اس کو کوٹھڑی میں۔''

میرے منہ سے نکلنے والا خون کمرے کے فرش کو داغدار کررہا تھا۔ مجھے صاف اندازہ ہورہا تھا کہ زبان کا اگلا حصہ بری طرح زخمی ہے۔ پیٹ میں لگنے والی شدید ٹھوکروں نے ریڑھ کی ہڈی تک کو ہلا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کمرہ میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ شاید اگر دونوں صحت مند ہیڈ کانسٹیبل میرے بازو چھوڑ دیتے تو میں نیچے بیٹھنے پر مجبور ہوجاتا مگر انہوں نے مجھے تھامے رکھا اور آہستہ آہستہ چلاتے کوٹھڑی تک لے آئے۔ لوہے کا زنگ آلود دروازہ کھول کر انہوں نے مجھے اندر دھکیل دیا۔ کچھ روز پہلے جب میں اس تھانے میں پہنچا تھا تو یہ کمرہ مجھے بدری نرائن نے دکھایا تھا اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ کچھ ہی روز بعد میں خود اس کمرے میں دھکیل دیا جاؤں گا۔ میں کمرے کے فرش پر بیٹھا تو ڈی ایس پی سلاخوں کی دوسری جانب نظر آیا وہ اپنی پھولی ہوئی سانس پر اب کافی حد تک قابو پا چکا تھا اپنی ٹوپی سر پر جماتا ہوا بولا

''میں تمہیں کل صبح تک کی مہلت دیتا ہوں اقبالی بیان لکھوا دے دوسری صورت میں ایسا حشر ہوگا کہ آج کی مار تجھے ماں کی لوری کی طرح لگے گی ساری انسپکٹری ناک کے راستے نکال دُوں گا۔''

میں اپنی پھٹی ہوئی قمیص کی دھجی سے اپنا خون پونچھتا رہا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا وہ گرجدار آواز میں ماتحتوں کو ہدایات دیتا ہوا باہر نکل گیا۔

یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ میرے اردگرد سازشیں ہورہی ہیں لیکن بدری نرائن کے قتل نے ایک دم مجھے تھانیدار کی کرسی سے حوالات کی کوٹھڑی میں لا پھینکا تھا۔ درحقیقت یہ کھیل اسی وقت شروع ہوگیا تھا جب میں نے صغراں کی بے حرمتی پر ملک مشتاق کو تھانے میں کھینچا تھا بعد میں صغراں نے خودکشی کی اور ملک مشتاق روپوش ہوگیا۔ پہلے تو میرا خیال تھا شاید چودھری حاکم دین یا کسی اور زمیندار نے اسے پناہ دے رکھی ہے مگر اب مجھے یقین ہوچکا تھا کہ ملک مشتاق واقعی روپوش ہے یہ بات مجھے الجھن میں مبتلا کررہی تھی۔ ملک مشتاق اگر چاہتا تو اپنے گھر میں رہ کر بھی آزاد رہ سکتا تھا وہ چودھری حاکم دین کا دوست تھا اور چودھری حاکم دین کی پہنچ اوپر تک تھی وہ بآسانی ملک مشتاق کی ضمانت کرا سکتا تھا اس کے بعد اس کیس کا بیڑا غرق کرنا بھی اس کے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا پھر ملک مشتاق سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر موقع سے غائب کیوں ہوا' کیا وہ مجھ سے اتنا ہی خوفزدہ ہوچکا تھا۔ اب یہ دوسرا مسئلہ بدری نرائن کا کھڑا ہوگیا تھا یہ تو ظاہر تھا کہ بدری نرائن کو میں نے نہیں مارا پھر اسے کس نے مارا۔ ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ شاید مجھے پھنسانے کے لئے چودھری حاکم دین نے ہی اسے مروا دیا ہو لیکن جب میں نے مختلف پہلوؤں پر غور کیا تو مجھے اس خیال کو رد کرنا پڑا اگر یہ کام مجھے پھنسانے کے لئے کیا جاتا تو زیادہ بہتر طریقے سے کیا جاتا۔ جس وقت بدری نرائن قتل ہوا میں اپنے گھر میں تھا سنتریوں کی نظر سے بچ کر رات کو تھانے میں داخل ہونا اور بدری کو قتل کرکے نکل جانا خاصا دشوار امر تھا پھر مجھے پھنسانے کے اور بھی کئی طریقے تھے اس کے لئے چودھری کو اپنے ایک وفادار آدمی کی قربانی دینے کی کیا ضرورت تھی اس کے علاوہ ڈی ایس پی گوپال کا رویہ بھی بتا رہا تھا کہ وہ لوگ مجھے یا میرے بھیجے ہوئے کسی شخص کو سب انسپکٹر کا قاتل سمجھ رہے ہیں۔ ایک امکان اور بھی تھا وہ یہ کہ بدری نرائن کسی نامعلوم وجہ سے قتل ہوگیا ہو قتل کے بعد چودھری کے ٹولے نے سوچا ہو کہ کیوں نہ مجھے اس کیس میں پھنسا دیا جائے۔ اپنی جگہ یہ ایک اہم مفروضہ تھا لیکن جب میں ڈی ایس پی گوپال کا وہ پاگل پن یاد کرتا تھا جو مجھے مارتے ہوئے اس پر طاری

ہوگیا تھا تو مجھے یقین ہونے لگتا تھا کہ چودھری گروپ مجھے ہی بدری کا قاتل سمجھتا ہے۔

جہاں تک نزاعی بیان کا تعلق تھا ممکن تھا بدری نے پران دیتے ہوئے ایک اور پاپ کمالیا ہو اگر ایسا نہیں تھا تو پھر کانسٹیبل راجو اور حوالدار کلدیپ نے اپنے طور پر یہ بیان گھڑا تھا تاکہ میرے خلاف کیس مضبوط ہو سکے بہرحال کچھ بھی تھا میں ایک سنگین ترین الزام میں ملوث ہو چکا تھا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ آیندہ چند دنوں میں کیا پیش آنے والا ہے اگر حقیقت پسندی سے دیکھا جاتا تو پھانسی کا پھندا بھی میری گردن سے زیادہ دُور نہیں تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم حوالات کے کچے فرش پر بیٹھا تھا رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی گاؤں کے سارے مچھر شاید آج انسپکٹر نواز خان کو حوالاتی کے روپ میں دیکھنے کے لئے تھانے پر حملہ آور ہوگئے تھے زنگ آلود جنگلے سے باہر ایک پرانی لالٹین روشن تھی اس کی زرد روشنی میں جنگلے کا سایہ کوٹھڑی کی شکستہ دیواروں پر لرز رہا تھا کبھی کبھی کسی کمرے سے کسی کے کھانسنے یا مدہم لہجے میں بولنے کی آواز آجاتی تھی۔ دفعتاً مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی کوئی دبے پاؤں کوٹھڑی کی طرف بڑھ رہا تھا وہ قریب آیا تو میں نے پہچان لیا وہ شاہو تھا میرا ہیڈ کانسٹیبل اس نے جنگلے میں ہاتھ ڈالا اور میرا ہاتھ تھام لیا پھر وہ ہاتھ کو اپنے ہونٹوں تک لے جاکر چومنے لگا میں نے شرمندہ ہوکر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا شاہو کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے وہ سرگوشی کے لہجے میں بولا۔

''خان صاحب آپ یہاں سے نکل جائیں ان لوگوں کے ارادے آپ کے متعلق بہت خطرناک ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اطمینان سے پوچھا۔

وہ کہنے لگا ''بہت ممکن ہے جناب کہ یہ لوگ آپ کی زندگی سے ہی کھیل جائیں۔'' شاہو آبدیدہ ہورہا تھا۔ میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''بے وقوف مت بنو شاہو۔ یہ تھانہ ہے اور میں حوالاتی ہوں مجھے مارنا اتنا آسان نہیں میری گرفتاری کا اندراج کاغذوں میں ہے۔ اور یہ خبر اب تک اعلیٰ افسروں تک بھی پہنچ چکی ہوگی۔''

شاہو نے گلوگیر آواز میں کہا ''جناب میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ آپ کو پولیس مقابلے کا ناٹک رچا کر..... گولی ماردی جائے گی۔''

ایک لمحے کے لئے میرا ذہن سنسنا اٹھا پھر میں نے سنبھل کر کہا ''شاہو ایسی نوبت نہیں آئے گی میرا خیال ہے کہ صبح ہونے سے پہلے کسی وقت ایس پی یا ایس ایس پی صاحب خود یہاں پہنچ جائیں گے سب ٹھیک ہوجائے گے تم گھبراؤ مت۔''

''سب ٹھیک نہیں ہوگا جناب۔'' شاہو بدستور رو رہا تھا ''مجھے یقین ہے کہ راج گوپال نے کسی افسر کو آپ کی گرفتاری کی اطلاع نہیں دی اور نہ ہی دے گا آپ اس عمارت کو تھانہ نہ سمجھیں چودھری حاکم دین کا عقوبت خانہ سمجھیں یہ لوگ یہاں جو چاہیں اور جب چاہیں کرسکتے ہیں۔''

مجھے شاہو کی باتوں میں وزن محسوس ہورہا تھا ویسے بھی وہ وہاں کافی دیر سے رہ رہا تھا کم از کم مجھ سے اس کی معلومات زیادہ تھیں۔ شاہو نے لرزاں آواز میں کہا ''خان صاحب میں یہ تالا کھول دیتا ہوں خدا کے لئے آپ یہاں سے نکل جائیں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے شاہو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ شاہو نے اپنی جیب سے ایک چابی نکالی اور میرے سامنے کردی۔ ''جناب یہ چابی میں نے آج شام آپ کی دراز سے لی ہے کسی کے ذہن میں نہیں آیا کہ حوالات کی ایک چابی آپ کے پاس بھی ہے یہ چابی آپ کی دراز کے بجائے آپ کی جیب میں بھی ہوسکتی تھی۔''

میں شاہو کا مقصد اچھی طرح سمجھ رہا تھا اگر یہ چابی میری جیب میں ہوتی اور میں اس چابی کو استعمال

اللہ کے رسول دین کے پیغمبر جو حیات و کائنات کی بنیاد ہیں

سیّارہ ڈائجسٹ

کا

عظیم الشان اور روح پرور

کا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے

اپنی سابقہ روایات کے شایانِ شان یہ نمبر پیغمبرانِ خُدا کی حیاتِ جاوداں اُن کے معجزات اور ایمان افروز واقعات پر مشتمل ایک متاع بے بہا اور جامع دستاویز ہوگا۔

Pakistanipoint.com

کر کے نکل جاتا تو کسی کے سر مجھے فرار میں مدد دینے کا الزام نہیں آ سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اسے ڈی ایس پی کی غفلت ہی قرار دیا جاسکتا تھا کہ اس نے اس دوسری چابی کا کھوج کیوں نہیں لگایا جو میرے پاس موجود تھی۔ شاہو نے ایک قابل عمل تجویز پیش کی تھی لیکن ضروری نہیں تھا کہ میرے نزدیک بھی یہ قابل عمل ہوتی مجھے یہ قدم اٹھانے سے پہلے بہت کچھ سوچنا تھا کافی دیر میں اپنی سوچوں میں گم رہا شاہو باہر ایک چکر لگا کر پھر واپس آ گیا۔ اس دفعہ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''خان صاحب خدا کے لئے آپ چلے جائیں صبح جو کچھ یہ کریں گے ہم سے برداشت نہیں ہوگا۔''

میں نے اطمینان سے کہا ''پھر کیا ہوا شاہو آدمی کی شان اس کے اپنے کرموں سے گھٹتی ہے دوسروں کی کرتوتوں سے نہیں۔''

''نہیں خان صاحب'' شاہو اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دے کر بولا ''یقین کریں اگر آپ یہاں سے نہ گئے تو صبح تھانے میں تصادم ہو جائے گا۔ آپ ذرا سوچیں اگر ڈی ایس پی یا کسی اور نے ہمیں آپ پر تشدد کا حکم دیا تو ہم ایسا کر سکیں گے؟ خدا کی قسم نہیں ہم اپنے ان ہاتھوں کو نہ توڑ دیں گے جو آپ پر اٹھنے کا ارادہ کریں گے..... ان آنکھوں کو نہ نکال ڈالیں گے جو آپ کو بے بسی کی حالت میں دیکھیں گی خدا کے لئے آپ یہاں سے نکل جائیں۔'' میں خاموشی سے شاہو کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی کہی ہوئی بہت سی باتیں درست تھیں یہ تھانہ واقعی چودھری حاکم دین کی مٹھی میں تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو ڈی ایس پی گوپال کو میرے ساتھ یہ رویہ اپنانے کی جرأت نہ ہوتی اور اب تک کوئی اعلیٰ افسر بھی یہاں پہنچا ہوتا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اگر قدرت مجھے موقع دے رہی ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ یہاں سے نکل کر اگر میں ایک بار ایس ایس پی صاحب تک پہنچ جاتا تو ڈی ایس پی کا باپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میرے اس طرح نکلنے سے کسی پر کوئی الزام آنے والا نہیں تھا۔

شاہو نے مجھے خاموش دیکھا تو لرزاں ہاتھوں سے تالا کھول دیا پھر سرگوشی میں بولا ''جناب آپ کا ملازم بلال شاہ نہر کے پل پر دو گھوڑے لئے موجود ہوگا۔ اس کے پاس ایک رائفل بھی ہے (ان دنوں بلال شاہ ملازم کے بھیس میں میرے ساتھ تھا چونکہ اس

مُسکرانا سیکھئے

آج کے اس نفسانفسی کے دور میں انسان آگے بڑھنے کی دُھن میں ایک روبوٹ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کیفیت نے انسان کے چہرے سے مسکراہٹ تک چھین لی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مسکراہٹ کی شکل میں ایسی صلاحیت دے رکھی ہے جس سے انسان دنیا فتح کرسکتا ہے۔ مسکراہٹ چہرے پر اچھے تاثرات پیدا کرتی ہے، مسکراہٹ ہمارے جذبات کو سکون پہنچاتی ہے اور ہمیں سچی خوشی دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہیں۔ مسکراہٹ سے ہماری آواز میں ایک خوش گوار تاثر پیدا ہوتا ہے لیکن ہم میں سے بے شمار لوگ اس طاقت اور صلاحیت سے واقف نہیں ہوتے۔ وہ اس کے کمالات سے آگاہ نہیں ہوتے یقین کریں کہ اگر لوگ اس طاقت سے آگاہ ہو جائیں تو یہ دنیا اُن کے قدموں میں آ گرے نفسا نفسی کے اس دور میں مسکرانا سیکھئے کیونکہ مسکراہٹ ہی اصل زندگی ہے۔

(مرسلہ: تبسم صابر۔ لاہور)

علاقے میں کوئی اسے پہچانتا نہیں تھا لہٰذا اس نے خود کو بہرہ مشہور کر رکھا تھا ویسے اس کا بہرہ پن بالکل فرضی بھی نہیں تھا ڈاکوؤں کی وادی' نامی کہانی میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ مخبری کے شبے میں اسے ایک خطرناک شخص نے اغوا کرلیا تھا جس کی قید میں وہ کافی عرصہ رہا تھا۔ اس قید کے دوران ہی اس کی سماعت کم ہوگئی تھی) میں سر جھکا کر آہنی جنگلے سے باہر نکلا تو گردن میں اٹھنے والی ٹیسوں نے صبح کے جنگ و جدل کی یاد دلا دی۔ پھٹی قمیص اور گرد آلود پتلون نے عجیب حلیہ بنا دیا تھا شاہو نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کوئی چیز نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دی یہ کچھ روپے تھے میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

''رکھ لیجئے جناب اللہ کی قسم یہ رشوت کے پیسے نہیں ہیں نہ ہی میں نے کبھی رشوت لی ہے۔''

میں شاہو کے جذبے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا' میں نے کہا ''شاہو تم غلط سمجھ رہے ہو میں کہیں فرار نہیں ہو رہا صرف ایس ایس پی صاحب تک جا رہا ہوں ہوسکتا ہے کل ہی تم پھر مجھے تھانے میں دیکھو۔''

''پھر بھی رکھ لیجئے راستے میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' اس نے پیسے زبردستی میری مٹھی میں دے دیئے محتاط قدموں سے چلتے ہم راہداری میں پہنچے تھانے کے گیٹ پر دو سنتری چارپائی پر بیٹھے تھے شاہو سرگوشی میں بولا ''خاں صاحب میں انہیں جا کر باتوں میں لگاتا ہوں آپ ان کے پیچھے سے ہوکر چھوٹے دروازے سے نکل جائیں۔''

''دروازہ بند تو نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب میں نے ادھر سے گزرتے ہوئے کھول دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' میں نے کہا۔

شاہو نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور دھیمے قدموں سے چلتا سنتریوں کی طرف بڑھ گیا وہ دھوتی قمیص میں ملبوس تھا اور نیم تاریکی میں مجھے اس کا ہیولا صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ سنتریوں کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ ذرا دیر بعد سنتری اس کی طرف متوجہ ہوگئے ان دونوں کا رُخ ایسی سمت ہوگیا کہ میں ان کی نظروں میں آئے بغیر دبے پاؤں چلتا چھوٹے دروازے تک پہنچ سکتا تھا اللہ کا نام لے کر میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور دروازے کی طرف بڑھا ذرا سی آہٹ بھی سنتریوں کو میری طرف متوجہ کرسکتی تھی چند گز کا یہ فاصلہ میں نے جیسے ایک مدت میں طے کیا آخرکار میرا ہاتھ چھوٹے دروازے کے ہینڈل پر پڑا..... اور اس لمحے مجھ پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ دروازہ بند ہے۔ اس کی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔ یہ بہت نازک لمحہ تھا اگر میں چٹخنی اُتارنے کی کوشش کرتا تو لازم تھا کہ آہٹ ہوتی اور دونوں مسلح سنتری میری طرف متوجہ ہوجاتے اگر واپس لوٹتا تو بھی ان کی نظروں میں آجاتا ایک ہی لمحے میں ذہن نے بے شمار سوچیں سوچ ڈالیں ان میں جو سب سے ہولناک سوچ تھی وہ یہ تھی کہ شاہو نے مجھ سے دھوکہ کیا ہے شاید وہ خود بھی اس ناٹک کا ایک کردار ہے جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔ مجھے گولی مار دی جائے گی اور ظاہر کیا جائے گا کہ میں فرار ہونے کی کوشش میں مارا گیا ہوں میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ چھوٹ نکلا چودھری اور اس کے ٹولے کے لئے مجھے مارنا اس گھڑی کتنا آسان تھا۔

دفعتاً ایک سنتری نے گردن گھمائی اور میرا ہیولا دیکھ کر ٹھٹھک گیا ''کون ہے؟'' وہ تیزی سے بولا پھر اس کے ہاتھ خودبخود کندھے پر لٹکی تھری ناٹ تھری رائفل کی طرف بڑھ گئے اس وقت میرے دل نے پکار کر کہا ''نہیں نواز خان ..... تمہیں اس چار دیواری سے زندہ نکلنا ہے..... اس لڑکی کو انصاف دینے کی خاطر جس نے کنویں میں کود کر تمہیں اپنی مظلومیت کا ثبوت فراہم کیا ہے.....''

(جاری ہے)

کرشن چندر

خوشی

وہ کہنے لگی ''آج صبح آپ نے مجھے پندرہ روپے جو دیئے تھے۔'' میں کانپنے لگا وہ بولی ''پھوپھا مجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ بستر پر سو جانے کے لئے مجبور کرتے تھے اور پھر مجھ سے سب روپے بھی چھین لیا کرتے تھے۔ آپ بھی اگر مجھ سے روپے چھیننا چاہتے ہو تو ابھی واپس لے لو۔''

ایک گڑیا کی کہانی جسے بڑوں کے ہاتھوں میں دیدیا گیا تھا

وہ کہنے لگا ''نوکر تو نہیں البتہ ایک نوکرانی کا ضرور بندوبست کرسکتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ آیندہ سٹا میری معرفت کھیلا کریں۔''

میں نے کہا ''تم تو مذاق کرتے ہو۔''

وہ بولا ''جی نہیں مذاق اور آپ سے؟ سچ کہتا ہوں مجھے کمیشن ملتا ہے۔ سٹے باز جو رقم داؤ پر لگاتے ہیں اس پر مجھے پانچ فیصد کمیشن ملتا ہے۔ اس دفتر کے سب ملازم میری ہی معرفت سٹا کھیلتے ہیں ورنہ آپ ہی بتایئے کو جو تنخواہ مجھے یہاں سے ملتی ہے اس میں کسی بھلے مانس کا گزارا کیسے ہوسکتا ہے۔''

میں نے پوچھا ''اسکی عمر کتنی؟.....کیا..... کے.....؟'' بیس برس کے تجرد نے مجھے بوکھلا دیا۔

وہ مسکرا کر بولا ''جی نہیں کوئی چودہ پندرہ برس کی ہوگی۔ رنگ نہ گندمی نہ سانولا بیچ کا رنگ جیسے فاختہ کے سینے کا ہوتا ہے بس آپ اسے ایک فاختہ ہی سمجھئے۔''

میں نے کہا ''میں شکاری نہیں ہوں مجھے تو نوکر چاہئے۔''

وہ بولا ''کھانا پکانا' سینا پرونا سب جانتی ہے پھر آپ اکیلے ہیں وہ آپ کے گھر کا سب کام سنبھال لے گی۔''

''مگر بھئی نوکرانی.....لوگ کیا کہیں گے۔''

وہ ہنسا' آپ کی آزاد خیالی تو دفتر بھر میں مشہور ہے اور آپ تو لوگوں کو اخلاق کا سبق دیتے ہیں اوراشتراکی بنانا پسند کرتے ہیں۔ دیکھئے نا اگر اب آپ بھی؟.....اور پھر وہ بے چاری یتیم ہے۔''

''یتیم ہے؟'' میں نے ترس کھاتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں' اس کے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ وہ اب تک اپنے چچا کے پاس تھی۔ جب وہ تیرہ برس کی ہوئی تو چچا نے اس پر ہاتھ صاف کرنا چاہا۔''

''تمہارا مطلب ہے اس کے دامن عصمت؟''

''جی ہاں اس کا دامن عصمت پارہ پارہ کرنا چاہا۔ اس کی زندگی کی متاع عزیز لوٹ لینی چاہی' اس کی دوشیزگی کی معصومیت اپنی رندی و ہوس ناکی کی شکار بنانی چاہی۔ اس کی باکرہ روح کی مقدس عفت اپنی بہمیت وشیطنت.....''

میں نے کہا ''یہ بکواس ختم کرو میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔''

وہ بولا ''جی دیکھئے نا لوگ سچائی کو ناپسند کرتے ہیں۔ زنا بالجبر کہہ دینا گناہ عظیم ہے۔ دفتر کے بڑے بابو بھی کہتے ہیں اور پھر میں مترجم ٹھہرا جو وہ کہتے ہیں اسی طرح کرتا ہوں۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے یہ فعل شنیع اپنی زبان میں ادا کرنے کے لئے ایک سو فقرے یاد کر رکھے ہیں۔ دفتر کے بڑے بابو کہتے ہیں کہ سچائی عریاں صورت میں کبھی پیش نہیں کرنی چاہئے بلکہ ہمیشہ لباس پہنا کر۔''

میں نے کہا ''مگر ذکر تو نوکرانی کا ہو رہا تھا۔''

وہ بولا ''جی نہیں ذکر اسکے چچا کا ہو رہا تھا جس نے اس پر ہاتھ صاف یعنی میرا مطلب ہے۔''

میں نے جلدی سے کہا ''میں سمجھ گیا آگے چلو۔''

''تو وہ اپنے چچا کے گھر سے بھاگ نکلی اور اپنی موسی کے گھر آ گئی۔ یہاں موسی نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی' اسے اچھے کپڑے پہنائے دو چار اپنے زیور نکال کر اسے دے دیئے۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگایا اسے اپنے سینے سے لگایا۔ کیوں جی جب عورت عورت کو سینے سے لگاتی ہے تو اس سے عریانی تو پیدا نہیں ہوتی۔''

میں نے کہا ''معلوم ہوتا ہے بڑے بابو نے کسی غلط ترجمے پر تمہیں ڈانٹ پلائی ہے۔ بہرحال خیر آگے بڑھو۔''

''تو صاحب۔'' وہ بولا ''لڑکی بالکل نوجوان تھی اور اس کی موسی کا خاوند ذرا آں..... میرا مطلب ہے کہ ذرا 'وہ' تھا۔ چنانچہ وہ بھی لڑکی پر عاشق ہوگیا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ موسی کا خاوند اور موسی کا بیٹا دونوں اس پر عاشق ہوگئے۔ یعنی باپ اور بیٹا دونوں بیک وقت.....''

''پھر کیا ہوا؟''

''ہوتا کیا' موسی نے دو طمانچے لگا کر لڑکی کو گھر سے نکال دیا۔ اب وہ اپنے پھوپھا کے گھر پہنچی۔ پھوپھا ذرا شریف قسم کا بدمعاش تھا یعنی اسے بڑے دم دلاسے دے کر اپنے گھر رکھا۔ اکیلا تھا وہ آپ کی طرح' چنانچہ جہاں اور لوگ کامیاب نہ ہوئے وہ کامیاب ہوگیا۔ پھر کچھ عرصے بعد اس نے لڑکی کو پیشہ کرنے پر مجبور کردیا۔''

''پیشہ کرنے پر؟''

''جی ہاں آپ کو اس کا مطلب سمجھاؤں؟ یعنی اس لڑکی کو مجبور کردیا گیا کہ وہ چند روپہلی ٹکیوں کے عوض اپنی عصمت وعفت' اپنی تقدس مآب حیا پرور دوشیزگی یعنی اپنی متاع عزیز' خزینہ حیات.....''

''خدا کے لئے۔'' میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا ''مجھے تمہارے ترجمے سے کوئی سروکار نہیں۔''

وہ مسکرایا ''مجھے شبہ ہے کہ آپ عریاں پسند ہوتے جارہے ہیں۔ خیر مجھے آپ کی عریاں پسندی سے کیا سروکار' میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ اس شریف بدمعاش پھوپھا نے اس بدقسمت لڑکی کو بازار کی فاحشہ بن جانے پر مجبور کردیا۔ چند ہفتے اسی طرح گزرے پھر وہ بیمار ہوگئی سوزاک۔''

''سوزاک؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔

وہ چڑ کر بولا۔ ''آپ بدکتے کیوں ہیں' کس شہر میں کس گلی میں' ہندوستان کے کس گاؤں میں آپ نے اس کا نام نہیں سُنا؟ زندگی کے کس نکڑ پر آپ نے اس منحوس بیماری کا نام نہیں سُنا؟ کیا کبوتر کے آنکھیں بند کرنے سے بازحملہ نہیں کرتا؟ کیا وہ اشتہار آپ نے نہیں دیکھے' پیپ جلن دو دن میں بند' وہ کون سا مکان ہے' کون سا شہر ہے' کون سا گاؤں ہے؟ مندر سے لے کر غریب کی جھونپڑی تک وہ کون سی دیوار ہے جہاں اس خوف ناک بیماری کی پیپ اور جلن دو دن میں بند کردینے کا ذکر نہ ہو' وہ کون سا شریف گھر ہے؟''

میں نے کہا ''اب تم گالی دینے پر اُتر آئے ہو۔''

''چلئے نہ سہی سوزاک نہ سہی یہ سمجھ لیجئے اسے ایک خوفناک شرمناک بیماری لاحق ہوگئی۔ گو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس کے لئے شرم ناک کہا جائے۔ اس لڑکی کے لئے یا اس شریف سماج کے لئے جو اس سے دن رات پیشہ کراتا ہے؟''

میں نے کہا ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے یہ وعظ سننا پڑے گا.....'' وہ بولا ''معاف کیجئے گا واقعی میں بہت باتونی ہوں' اب مختصراً بیان کرتا ہوں۔ تو صاحب اب وہ لڑکی وہاں سے بھاگ نکلی۔ پھوپھا اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ وہ دونوں لڑنے لگے۔ لڑکی چیخنے لگی۔ اتفاق سے میں سڑک سے گزر رہا تھا ادھر دفتر آنا تھا بغل میں فائل والے.....''

''ہیرو ہوگئے تم؟'' میں نے طنزاً کہا۔

''جی نہیں'' اس نے کہا ''بھلا دفتر کا مترجم کبھی ہیرو ہوسکتا ہے۔ بھلا چالیس روپے تنخواہ پانے والا کبھی ہیرو ہوسکتا ہے۔ ہاں تو صاب میں اسے اس کے پھوپھا سے چھڑا کر اپنے گھر لایا۔ یہاں میں اپنے بڑے بھائی اور بھابی اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں میں رہتا ہوں۔ وہ لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ بھابی نے میری شرافت کو سراہا اور اس لڑکی کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ لیکن صاحب اس لڑکی کی قسمت ہی بُری ہے۔ میں اگر اس لڑکی سے دو

باتیں بھی کرلوں تو بھابی خفا ہوجاتی ہیں۔ اگر وہ لڑکی کبھی میرا بستر بھی ٹھیک کردے تو آگ بگولا ہوجاتی ہیں۔ اب گھر میں ہر وقت چخ چخ سی رہتی ہے' سکون تباہ ہوگیا ہے۔ لڑکی کے علاج پر میں نے چند روپے کیا صرف کردیئے اب تک گالیاں پڑرہی ہیں۔ بھابی نے آج لڑکی سے کہہ دیا ہے کہ جہاں اس کا جی چاہے چلی جائے میں اسے گھر پر نہیں رکھ سکتی۔''

''تو اس لئے تم اسے میرے ہاں بھیجنا چاہتے ہو؟ ایک بدمعاش عورت کو میرے ہاں ملازم کرانا چاہتے ہو؟'' میں نے غصے سے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ ''مجھے آپ کے معصوم چہرے اور گنجے سر نے دھوکہ دیا' میں سمجھتا تھا آپ کو غریبوں سے ہمدردی ہے مگر آپ محض باتیں ہی باتیں بناتے ہیں یا ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔''

''مگر وہ لڑکی؟'' میں نے شرمندہ ہوکر کہا ''بیمار ہے اسے سوزاک ہے میں اسے کیسے؟ میں خود بیمار ہوجاؤں گا تم سمجھتے نہیں' یہ چھوت کی بیماری ہے اور..... ذرا سوچو تو۔''

''سنئے اب وہ اچھی ہے' میں نے اسّی روپے صرف کئے ہیں اس کے علاج معالجے پر' دیکھئے آج بھابی اسے گھر سے نکال دیں گی میں اسے پھر قحبہ خانے کے جہنم میں واپس نہیں بھیجنا چاہتا اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور میری تنخواہ اتنی زیادہ نہیں ہے کہ اسے ایک الگ مکان لے کر دوں۔''

''ایک الگ مکان؟'' میں نے حیران ہوکر کہا۔

وہ بولا ''ہاں میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

چاند میرے گھر نوکرانی بن کر آگئی۔ میں نے کہا ''چاند'' وہ بولی ''جی۔''

''دیکھو میری عمر پینتیس سال سے کچھ زیادہ ہے میرا سر گنجا ہوچکا ہے میری آنکھیں کمزور ہوچکی ہیں' میں نے بھی شادی نہیں کی۔ میں عورتوں سے دُور بھاگتا ہوں۔ ساڑھے تین سو روپے تنخواہ پاتا ہوں۔ لوگ مجھے ازلی شریف سمجھتے ہیں۔ میری شرافت پر بٹا نہ لگانا' مجھے زیادہ پریشان نہ کرنا' بال سنوار کر آنکھوں میں کاجل لگا کر مجھے دعوت نظارہ نہ دینا۔ بس چپکے سے گھر کا کام کاج کرتی جاؤ پندرہ روپے تنخواہ اور روٹی کپڑا۔''

وہ بولی ''یہ دعوت نظارہ کیا ہوتا ہے جی؟''

میں ہنسا ''کچھ نہیں میں ذرا ترجمہ کررہا تھا۔ اب تم کچن میں جا کر برتن صاف کرو' صبح مجھے دو انڈے نیم برشت اور ایک گلاس دودھ کا چاہئے۔ دوپہر کو کھانا جس میں ٹماٹر اور کدو اور شلغم کبھی شامل نہ ہوں' سہ پہر کی چائے میں دفتر ہی میں پیوں گا شام کے کھانے میں چاول ضرور ہونے چاہئیں۔ سوتے وقت میرے گنجے سر میں روغن بادام کی مالش تمہیں کرنی ہوگی اس کے بعد تم اپنے کمرے میں سو سکتی ہو۔ ہاں اندر سے زنجیر ضرور لگالینا ورنہ میں ذمہ دار نہیں ہوں۔''

وہ پھٹی پھوٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ چھوٹی سی لڑکی تو وہ تھی' وہ عورت کہاں تھی؟ ابھی تک نوجوانی کے سن میں بڑی مشکل سے آئی ہوگی لیکن اس کا جسم..... نہیں اس کی آنکھیں کہے دیتی تھیں کہ اس نے سب کچھ دیکھا ہے۔ جہنم کے وہ شعلے جن کے متعلق ہمارے ہندوستانی شاعر کبھی شاعری نہیں کرتے' سماج کے وہ گھناؤنے مناظر جن کا حسن ہمارے افسانہ نگار کبھی بے نقاب نہیں کرتے'

خرید و فروخت کے وہ ادارے جن کا ذکر ہمارے چیمبر آف کامرس میں کبھی نہیں ہوتا۔ لیکن جو ہمارے ہندوستان کی ہر گلی میں' ہر گاؤں میں پائے جاتے ہیں' اس لڑکی نے اپنے جسم اور اپنی روح کے ہر سانس میں گھستے ہوئے' اسے اجاڑتے ہوئے' تباہ و برباد کرتے ہوئے' اسے نوچ نوچ کر چیرتے پھاڑتے ہوئے' ایک بھوکے وحشی بھیڑیئے کی طرح جھنجھوڑتے ہوئے دیکھے تھے۔ اس کی آنکھیں ابھی تک زخمی تھیں۔ اس کا اوپر کا لب اندر بھنچا ہوا تھا کسی اذیت ناک کرب کی وجہ سے اور اس کا نچلا ہونٹ ذرا آگے جھکا ہوا تھا اور کسی مرد کو اپنے قریب آتے دیکھ کر تھرانے لگتا تھا اور سینے کے خم کانپنے لگتے تھے۔

میں نے اسے ہنسانے کی کوشش کی۔

''میاؤں۔'' وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ وہ کچن میں دال بگھار رہی تھی۔ پوچھنے لگی ''کیا ہے؟''

میں نے کہا ''میں بلی ہوں تم چوہا بلکہ چوہیا ہی ہی ہی.....'' وہ خاموش رہی' میں شرمندہ ہو گیا اور اپنا گنجا سر کھجانے لگا' خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔

ایک دن کہنے لگی ''میں دھوپ میں تمہارا کھانا لے کر آتی ہوں میرے پاؤں جلتے ہیں۔''

میں نے اس کے گندے گرد و غبار میں اٹے ہوئے پاؤں پر نظر ڈال کر کہا ''ارے ارے تم نے مجھے پہلے کیوں نہ کہا۔''

میں نے اسے بازار سے ایک جوتی خرید کر دی اور سفید دھوتیاں جن کے کنارے رنگین تھے۔ اپنا گنجا سر چھپانے کے لئے میں ایک سمور کی ٹوپی لایا' ایک سینٹ کی شیشی' کریم اور اس کے لئے ہیئر کلپ۔ جب بھی وہ نہ مسکرائی۔

پورے ایک ماہ بعد میں نے اسے پندرہ روپے دیئے ''لو یہ تمہارے ہیں' انہیں تم جس طرح چاہو خرچ کر سکتی ہو۔'' اس نے غور سے میری صرف دیکھا پھر آنکھیں جھکا کر پیسے لے لئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور بھی زیادہ اُداس ہو گئی ہے۔ ''چاند'' میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے جی۔''

''کچھ نہیں۔''

رات کو وہ میرے گنجے سر پر روغن بادام کی مالش کر رہی تھی' کہنے لگی ''کیا آج رات مجھے یہاں سونا ہوگا؟''

میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا ''کیوں؟ کیوں؟ کیا بات ہے؟ میں نے تم سے؟.....''

وہ کہنے لگی ''آج صبح آپ نے مجھے پندرہ روپے جو دیئے تھے۔'' میں کانپنے لگا۔ وہ بولی ''پھوپھا مجھے دوسرے لوگوں کے ساتھ بستر پر سو جانے کے لئے مجبور کرتے تھے اور پھر مجھ سے سب روپے بھی چھین لیا کرتے تھے۔ آپ بھی اگر مجھ سے روپے چھیننا چاہتے ہو تو ابھی واپس لے لو۔''

میں نے کہا ''تمہیں یہ شبہ کیسے ہوا ہے؟۔''

وہ بولی ''تو آپ یہ روپے مجھ سے واپس نہیں لیں گے؟۔''

''اور..... اور مجھے.....'' اس نے اشارہ کر کے کہا ''یہاں بھی نہ سلائیں گے؟''

''نہیں ہرگز نہیں۔ تم کیوں اس طرح.....'' وہ چپ چاپ اُٹھ کر چلی گئی۔ اس کی آنکھیں حیران تھیں۔

ایک دن وہ کچن میں بیٹھی تھی' شیشہ سامنے رکھے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور ایک گیت گا رہی تھی۔ کچھ عجیب سا گیت تھا فحش' بازاری لیکن اس میں بھی عورت نے مرد کیخلاف اور سماج کیخلاف

کام شروع کرنے سے پہلے

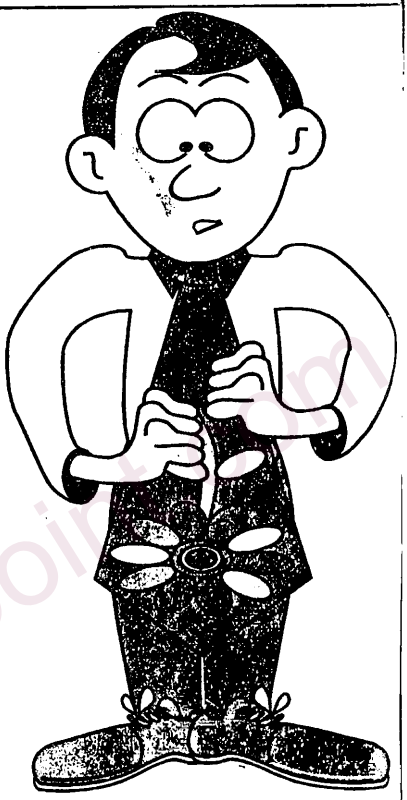

سیفٹی منیجر : جناب محترمی عزت ماب ورکر صاحب !
اِس وقت آپ فیکٹری ایریا کے اندر ہیں اِس لیے یہ رنگینی یہ شوقینی اُتاریئے اور کور آل ہلمٹ اِسپکٹیکل گلوز اور کوٹلہ کے سیفٹی شوز پہن لیجیے

ورکر : جانے دیجیے سیفٹی منیجر صاحب آپ بھی کوٹلے والوں کی باتوں میں آ گئے ان چیزوں کا شور مچا مچا کر بیچنا تو اُن کا بزنس ہے حالانکہ اِن چیزوں کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے

تین گھنٹے کے بعد

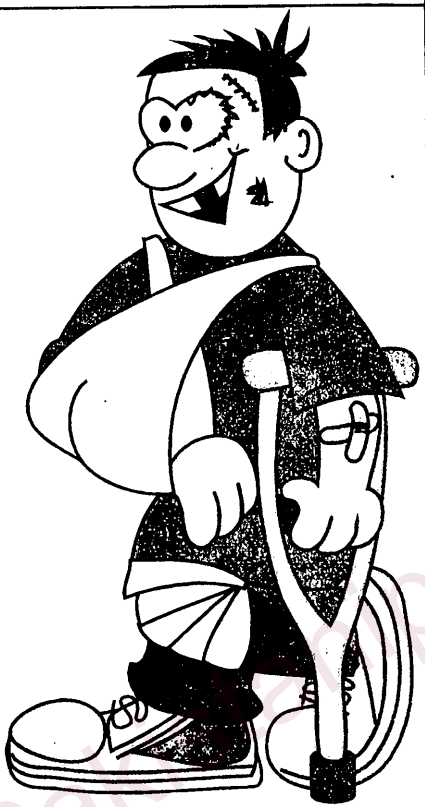

سیفٹی منیجر : کہو میاں کیسے ہو کتنے دنوں کی چھٹی پر جا رہے ہو واپس بھی آ سکو گے یا نہیں

ورکر : آپ مزاق کر رہے ہیں منیجر صاحب میں ایک ماہ کے اندر ہی واپس آ جاؤں گا ہاں آپ ایک کام کریں اِن میں سے جو جو چیزیں کم ہیں کوٹلہ شوز فون کریں اور فوراً منگوالیں ایک بات اور میری توبہ میں آئندہ کبھی بھی اِن چیزوں کے بغیر کام نہیں کروں گا۔

KOTLAA SHOES 1ST FLOOR, ASLAM ARCADE, 16-McLEOD ROAD, LAHORE. PH : 7314287-88, FAX : 722529

جو مرد کا سماج ہے اپنا غم بیان کیا تھا۔ ایک عجیب سا گیت تھا جس کے الفاظ اجازت نہیں دیتے کہ اسے یوں ادب کی زبان میں بیان کیا جائے۔ اس گیت کا ترجمہ بہت ہی مشکل ہے۔ وہ گیت تھا ایک بازاری عورت کی گالی بھی تھی جو اس نے جل کر مردوں کیخلاف بکی تھی اور چاند اسے آہستہ آہستہ نفرت کے احساس سے متاثر ہوکر گا رہی تھی۔ یہ گیت رات کے اندھیرے میں پیدا ہوا تھا۔ یہ گیت قحبہ خانے کی غلام فضا میں اجاگر ہوا تھا۔ یہ گیت صدیوں کے ظلم و ستم، جبر و استبداد کیخلاف عورت کی مسکی، کچلی زخمی روح کا احتجاج تھا۔ ایک موٹی مسلسل سی گالی لیکن احتجاج کی روح تو پاک صاف تھی، اس کا غم اور غصہ تو شعلے کی طرح کندن تھا۔ گیت اچھا تھا لیکن ماحول نے اسے ایک غلیظ سانس عطا کی تھی۔ اس مفلس و نادار دوشیزہ کی طرح جو اپنی معصومیت گندے چیتھڑوں میں چھپائے ہوئے ہو۔

''چاند کیا گا رہی ہو؟'' میں نے شرارت سے پوچھا۔ وہ چپ ہوگئی ''چاند'' وہ بولی ''جی کچھ نہیں۔''

اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا نام و نشان نہ تھا۔ اوپر کا لب اندر بھنچا ہوا تھا اور نچلا لب ذرا آگے جھک کر کانپ رہا تھا اور دانتوں کی لڑی بیچ میں جھلک رہی تھی۔ مجھے اس وقت وہ اس بے بس ہرنی کی طرح نظر آئی جو چاروں طرف سے ناامید ہوکر ایک کونے میں آ کر کھڑی ہوگئی ہو آخری مدافعت کے لئے۔

میں نے کہا ''تمہیں معلوم ہے وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ آج کل وہ تمہارے لئے بہت سٹا کھیلتا ہے شاید اسکی قسمت پھر جائے اور وہ تمہارے لئے ایک گھر لے سکے۔''

وہ کہنے لگی ''پھوپھا کے ہاں ہر مرد یہی کہا کرتا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے گا۔ وہ مجھ سے شادی کرے گا؟'' اس نے آئینہ اُلٹا کر دیا اور کنگھی بھی زمین پر رکھ دی۔

اس روز قیمے کے پراٹھے اور مرچوں کا اچار اور مکھن دسترخوان پر تھا اور ہم لوگ کھا رہے تھے۔ میں اور چاند اور وہ۔ چاند کی صحت اب پہلے سے بہت بہتر تھی اور گالوں پر ہلکی سی سرخی آ گئی تھی جیسے پکتے ہوئے آٹے کی جلد ملائم پڑ گئی ہو۔ جسم گدرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آنکھوں کی چمک بھی اس قدر اُداس نہ تھی پھر بھی لبوں پر مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے یہ لڑکی اب کبھی مسکرا نہیں سکتی، جیسے یہ لڑکی اب کبھی عورت نہیں بن سکتی، جیسے یہ چاند ہمیشہ کے لئے گہنا گیا ہے۔ جیسے اس روح کو کبھی قرار، سکون، اعتماد اور محبت عطا نہیں ہوسکتی، جیسے یہ زندگی کبھی خوشی، مسرت اور محبت سے معمور نہیں ہوسکتی، جیسے یہ حیات اس مرمریں ٹھلیا کی طرح ہے جس میں لوگوں نے جابجا سوراخ کر دیئے ہوں۔ ادھر پانی ڈالو ادھر غائب۔ اس خالی گیت کو جو ایک تلخ گالی تھا، اب کوئی خوشی سے معمور نہیں کر سکتا۔

وہ دسترخوان پر بیٹھی تھی، پہلی مرتبہ میں نے اسے اپنے ساتھ دسترخوان پر شریک کیا تھا کیونکہ وہ بھی موجود تھا لیکن چاند کو اس عزت افزائی کا مطلق احساس نہیں تھا۔ نہ ہمارے ساتھ بیٹھنے کی خوشی تھی۔ قیمے کے پراٹھے اور مکھن کی ڈلی اسے مرعوب نہیں کر سکی۔ رنگین کنارے والی دھوتی اور اونچی ایڑی کا سینڈل پہننے کی خوشی بھی نہیں تھی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی اور ہم لوگ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی

سے کام لیکر اسے ہنسانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ بالکل ٹس بیٹھی تھی۔ خاموش' اُداس' پژمردہ' یکا یک مجھے احساس ہوا کہ سماج کے عفریت کا گھاؤ' عصمت دری سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اس کی عصمت چھن جانے کا مجھے اتنا افسوس نہیں تھا' ہر عورت کی عصمت ایک دن چھین لی جاتی ہے۔ اپنے خاوند کے ہاتھوں یا کسی غیر مرد کے ہاتھوں' افسوس تو یہ تھا کہ سماج نے اس چودہ برس کی لڑکی کی مسکراہٹ چھین لی تھی۔ اس کا اعتماد چھین لیا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی ہنسی چھین لی تھی اور جب کسی انسان سے اس کی ہنسی چھین لی جائے تو اس سے بڑھ کر بدقسمت فرد کوئی نہیں ہوسکتا۔

کھانا کھا کر مجھے گہری نیند آئی۔ جب آنکھ کھلی تو چھ بجے تھے۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا لیکن دھوپ بالکل ماند پڑ گئی تھی اور سائے گہرے ہوگئے تھے۔ ایک ہلکا سا جھکڑ چل رہا تھا۔ میں آہستہ سے اُٹھا کیونکہ سٹے بازوں کا دلال ابھی تک غالیچے پر چت لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ سونے دو کم بخت کو اسے کیا معلوم بہار کسے کہتے ہیں۔ کھڑکی کھول کر دیکھا تو شمال سے بادلوں کے پرے کے پرے صف باندھ کر چلے آرہے تھے۔ میں نے اپنے گنج پر ہاتھ پھیر کر کہا ''آہا آج بارش ہوگی۔'' جب گنجے سر پر بارش کی پہلی بوندیں پڑتی ہیں تو روح کو وہ بالیدگی حاصل ہوتی ہے جو قیمے کے پراٹھے کھانے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر یقین نہ آئے تو سر منڈا کر دیکھئے۔ اولوں سے بچئے لیکن بارش کی بوندیں اپنے سر پر برس جانے دیجئے۔ تراوٹ حاصل ہوتی ہے' بے حد خوشی ہوتی ہے۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور غسل خانے کی طرف جانے لگا۔ غسل خانے کے باہر پتھر کے چبوترے پر چاند بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں طشتری تھی اور طشتری میں آم کی کیری کے قتلے سرخ مرچ اور نمک اور نیبو کے رس

ملاقات

شمالی مغربی صوبے کے گورنر مسٹر ٹامس مولوی نذیر احمد کے بڑے قدردان تھے ایک دفعہ مولوی صاحب ان سے ملنے گئے چپڑاسی نے دیکھا تو دروازے پر ہی روک لیا۔ مولوی صاحب اس کو دو روپے دے کر آگے گئے۔ ٹامس صاحب کھڑے ہوگئے اور مزاج شریف کہہ کر ہاتھ آگے بڑھایا۔ مولوی صاحب نے کہا ''میں آپ سے ہاتھ نہیں ملا سکتا اور میرا مزاج بھی اس وقت تک ٹھیک نہ ہوگا جب تک آپ چپڑاسی سے میرے روپے واپس نہ دلا دیں۔'' صاحب یہ سُن کر آگ بگولا ہوگئے اور چپڑاسی کو ملازمت سے فارغ کر دیا پھر مولوی صاحب سے کہا کہ لائیے' ہاتھ' ملائیے ..... مولوی صاحب نے ہاتھ نہیں بڑھایا اور کہا ''مگر میرے دو روپے؟'' ..... صاحب نے چپڑاسی سے دو روپے واپس دلا کر کہا کہ اب ہاتھ ملائیے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میرے دو روپے مجھے مل گئے اب اسے معاف کر دیجئے ..... صاحب چیں بہ چیں ہوئے مگر مولوی صاحب کی بات ٹال نہ سکے چپڑاسی کو بحال کر دیا اور پھر ہاتھ بڑھایا اور اب کے مولوی صاحب نے بھی ہاتھ بڑھایا۔

(گنجینہ گوہر سے اقتباس۔ مرسلہ: ثمینہ غوری۔ منڈی بہاء الدین)

میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک چور کی طرح جھینپی۔ میں نے کہا ''مزے دار ہیں؟''

''بے حد۔ کھاؤ گے؟''

میں نے سر ہلایا۔ اس نے ایک قتلہ مجھے دیا۔ وہ میرے بالکل قریب آ گئی۔ آہستہ سے کہنے لگی ''میں نے پتھر مار کر اس پیڑ پر سے یہ امیاں توڑی ہیں بے حد مزے دار ہیں نا؟''

''ہوں' ہوں'' میں نے کھاتے ہوئے کہا ''کیسے چٹپٹے اور مزے دار ہیں۔''

یکا یک وہ مسکرائی' یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے بڑھ کر اس کے سارے چہرے پر' سارے جسم پر' ساری فضا پر پھیلتی گئی۔ اس کا اوپر کا ہونٹ جو اندر بھنچا ہوا تھا آہستہ سے نرم پڑتا گیا اور اپنی اصلی حالت پر آتا گیا۔ اس کا غم پرانا تھا لیکن اس کی مسکراہٹ پرانی نہیں تھی' نئی تھی نوجوان تھی' خوبصورت تھی' معصوم اور غیر ملوث تھی۔ اس حیا پرور کلی کی طرح جو کھلنا چاہتی ہو اور پھر شرما کر پردوں کی اوٹ میں چھپ جانا چاہتی ہو لیکن اب یہ مسکراہٹ کھلتی گئی گیت نے اپنا غلیظ لباس اُتار پھینکا اور اس کے جسم میں خوشی کا نغمہ تیرنے لگا۔ ہم دونوں ہنسنے لگے' قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ میں نے کہا ''کوئی نہیں دیکھ رہا ہے ایک پتھر اور مارو امیاں تو بڑی مزے دار ہیں۔'' اس نے پتھر اٹھایا اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

''یہ تم نے کیا کیا؟ اسے اپنے گھر بھیج دیا؟''

میں نے کہا ''میں نے اپنی ماں جی کو لکھ دیا ہے کہ چاند میرے ایک عزیز دوست کی منگیتر ہے۔ گھبراؤ نہیں وہ چاند کی دل جوئی کریں گی۔''

''لیکن وہ وہاں خوش رہ سکے گی؟''

میں نے کہا ''میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن ہیں۔ وہاں اس سے کوئی عشق کرنے والا نہیں ہے۔ چاند کو اب عشق کی ضرورت نہیں ہے' اسے رنگین دھوتیوں اور سینڈلوں کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ خوشی قیمے کے پراٹھوں میں بھی نہیں اور دسترخوان پر اپنے ساتھ بٹھا کر کھلانے میں بھی نہیں اور اس سے ازراہ ترحم شادی کرنے میں بھی نہیں۔ ان چیزوں سے اس کی مسکراہٹ اس کی خوشی لوٹ کر نہیں آ سکتی۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے کہا ''میں گنجا ہوں اور تم اندھے فلسفی ہو اور دنیا ناپاک پھوپھاؤں سے بھری ہوئی ہے۔ ذرا اسے میری ماں کی ممتا اور شفقت کی چھاؤں میں دم لینے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کے معصوم قہقہوں سے اپنے زخموں پر مرہم لگانے دو۔ اسے ہنسنے دو اور اسے باقی سب بھول جانے دو۔''

یکا یک وہ سمجھ گیا اور دیر تک میری طرف دیکھتا رہا پھر میری گنجی چاند پر چٹکی لیکر بولا ''تم کورے جذباتی ہو' میرا شبہ درست نکلا۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری عقلیت کے پس پردہ جذباتیت ہے۔ کون تھی وہ جس نے تمہیں یہ کرب ناک محویت عطا کی۔ جس نے تمہاری آنکھوں کا نور چھین لیا' جس نے تمہارے گھنے بالوں کے جنگل اجاڑ دیئے۔ جس نے تمہاری مسکراہٹ میں یاس و قنوط کی تلخی جھلکا دی۔ کون تھی وہ؟''

میں نے کہا ''زندگی ایک جوا ہے یہ بتاؤ آج سٹے میں کیا لگے؟ نو سے دو یا پانچ سے سات؟''

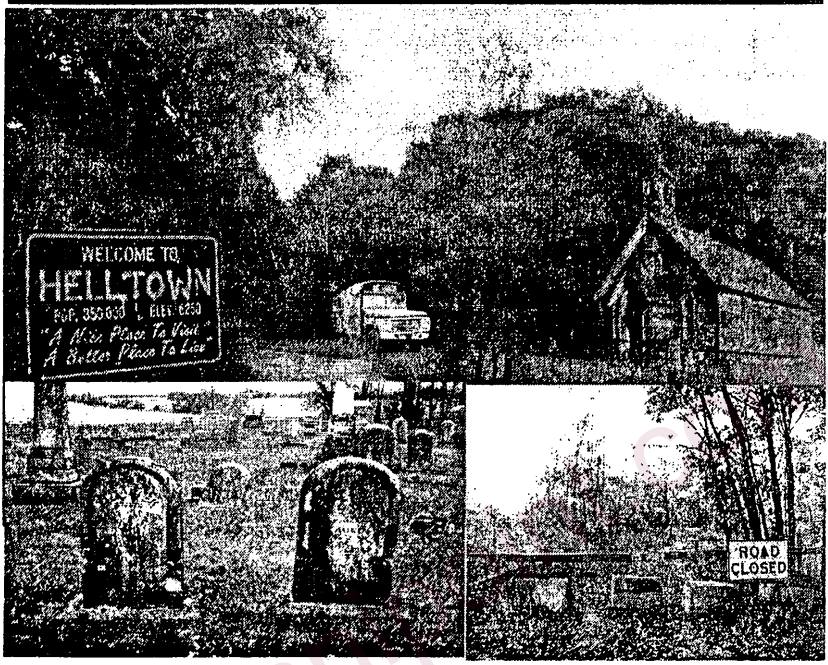

زمین پر جہنم

رُوحوں، چمگادڑوں اور سانپوں کا مرکز امیر کی قصبہ، جہاں جاتے ہوئے انسان کی روح لرز جائے!

عارف محمود اپل

امریکہ جسے دُنیا کا سب سے ترقی یافتہ ملک قرار دیا جاتا ہے اور جہاں قدم قدم پر ایسے مقامات موجود ہیں جنہیں دیکھنے کیلئے دنیا بھر کے سیاح بیتاب رہتے ہیں، اسی امریکہ میں ایک قصبہ ایسا بھی ہے جسے روحوں، بھوتوں، چمگادڑوں، سانپوں اور جنونی قاتلوں کی سرزمین قرار دیا جاتا ہے۔ اس قصبہ میں جاتے ہوئے انسان خوف و دہشت کا شکار ہوجاتا ہے۔ امریکی ریاست اوہائیو کی کاؤنٹی سمٹ کے شمالی جانب واقع یہ قصبہ اس قدر خوفناک اور دہشت انگیز ہے کہ اس کا نام ہی HELLTOWN رکھ دیا گیا ہے۔ مقامی لوگوں کے مطابق یہ قصبہ دراصل قہر زدہ ہے اور یہاں آنے

والا ہر شخص اس قصبہ کے شیطانی اثرات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس علاقے کا نام پہلے بوسٹن ٹاؤن تھا۔ امریکی حکومت نے اس قصبہ کو سیاحتی مقام بنانے کیلئے یہاں بہت بڑا نیشنل پارک تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں مقامی لوگوں کو نقل مکانی کرنا پڑی اور حکومت نے ان کے گھر مسمار کر دیئے تاہم یہ منصوبہ کبھی بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اس قصبہ کی ڈھلوانی سڑک جہاں ختم ہوتی ہے اس مقام کو ''دی اینڈ آف دی ورلڈ'' کا نام دیا گیا ہے۔

بہت سے لوگ اس مقام ''دی اینڈ آف دی ورلڈ'' کو دیکھنے کیلئے آتے ہیں مگر اس شوق میں کئی افراد جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ یہاں بھوتوں اور روحوں کی موجودگی کے دعویدار لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر اس مقام پر کوئی شخص زیادہ دیر تک رُکا رہے تو وہ جنگلوں سے نکل کر آنے والی بدروحوں کی فوج کا شکار ہو کر اپنی زندگی کے لمحۂ آخر تک پہنچ جاتا ہے۔

اس قصبہ میں بدروحوں اور بھوتوں کو کسی نے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو مگر کچھ خوفناک چیزیں یہاں آنے والے ہر شخص کو نظر آتی ہیں جو اس قصبہ کے بارے میں مشہور عجیب و غریب باتوں کو مزید پختہ کرتی ہیں۔ ان میں شیطانی فرقہ ''Ku Klux Klan'' کے ارکان سب سے نمایاں ہیں۔ یہ شیطان کے پیروکار کہلانے والے لوگ جنگل سے عجیب حلیہ میں برآمد ہوتے ہیں اور لوگوں کو خوفزدہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ بائبل کے منکر ہیں۔ ان کے علاوہ پاگل خانے سے فرار دو مرد بھی یہاں بسیرا کیے ہوئے ہیں۔ یہ جنگل سے نکل کر یہاں آنے والوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی ان سے بھی خوفزدہ نہ ہو تو ہیل ٹاؤن میں دُنیا کے سب سے بڑے سانپ بھی موجود ہیں جو کسی بھی انسان کو خوفزدہ کر دینے کے لیے کافی ہیں۔

قصبہ کے حوالے سے ایک اور بات یہ مشہور ہے کہ یہاں کی مٹی کو ہاتھ لگانا بہت گھاٹے کا سودا ہے۔ اس بات میں کچھ حد تک صداقت بھی ہے۔ دراصل یہاں آنے والے درجنوں افراد کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا کہ انہوں نے قصبہ میں کسی پتھر یا درخت کو ہاتھ لگایا اور ہمیشہ کیلئے انفیکشن کا شکار ہوگئے۔ اس کی وجہ یہاں حکومت کی طرف سے کیمیکل پر مبنی مواد کا ضیاع ہے۔ اگر کوئی شخص ان سب چیزوں سے بھی خوفزدہ نہ ہو تو یہاں ایک قدیم قبرستان بھی ہے جو سترہویں صدی میں بنایا گیا تھا۔ مقامی لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس قبرستان میں بہت سے بھوت رہتے ہیں۔ بالخصوص ایک بوڑھے مرد کا بھوت اکثر قبرستان میں بنے بنچ پر بیٹھا نظر آتا ہے۔ قصبہ میں جانے والوں کو اکثر لٹیرے بھی لوٹ مار کا نشانہ بناتے ہیں، اس وجہ سے بھی لوگ یہاں آنے سے کتراتے ہیں۔ ہیل ٹاؤن کی ایک اور نمایاں ''خصوصیت'' یہاں پائے جانے والے ''حرکت کرنے والے درخت'' ہیں۔ ان درختوں کو دیکھ کر لوگ بے حد خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔

بلاشبہ یہ قصبہ دنیا کے دہشت ناک ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ کسی ہارر موویز میں جتنی خوفناک چیزیں دکھائی جاتی ہیں وہ سب یہاں موجود ہیں۔ ایک امریکی ٹیلی ویژن چینل کے رپورٹر نے اس قصبہ کے حوالے سے خصوصی رپورٹ تیار کرتے ہوئے بتایا کہ ''میں جب قصبہ کے بارے میں پھیلائی جانے والی افواہوں کی حقیقت جاننے کے لئے یہاں پہنچا تو قصبہ میں داخل ہوتے ہی درختوں کے مرجھائے پتوں اور اندھیروں نے میرا استقبال کیا۔ سرِشام ہی یہاں گہری خاموشی اور تاریکی پھیلی نظر آرہی تھی۔ جیسے ہی میں درختوں کے درمیان بنی سڑک کے عین وسط میں پہنچا۔ مجھے کچھ لوگ نظر آئے جو سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں شمعیں

پکڑے ہوئے تھے۔ وہ سب عجیب سے انداز میں ایک مقام پر گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ میں اپنے ساتھی کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہا تھا اور ہم دونوں بھی یہ منظر دیکھ کر خوفزدہ تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ان خوفناک لوگوں نے ایک زوردار نعرہ بلند کیا اور پھر ایک جانور کو فضا میں بلند کر کے اسے ذبح کر دیا۔ پھر اس جانور کے خون کو اپنے چہروں پر ملتے نعرے لگانے لگے۔ یہ منظر اس قدر خوفناک تھا کہ ہم دونوں اُلٹے قدموں واپس لوٹ آئے''۔

ایک اور واقعہ اس قصبہ میں جانے والے مارٹن نامی شخص نے یوں بیان کیا ہے: ''میں اپنے دو دوستوں کے ساتھ شام کے وقت خاص طور پر قصبہ میں گیا تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ قصبہ کے بارے میں پھیلائی جانے والی باتیں بے بنیاد ہیں، ہم قریب دو گھنٹے قصبہ میں اِدھر اُدھر پھرتے رہے ہمیں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ پھر ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں ایک پرانی سکول بس کھڑی تھی، ہم اس سکول بس سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھے کہ ہمیں اس کے اندر کوئی شخص بیٹھا نظر آیا۔ عجیب سے حلیہ والا وہ شخص منہ میں سگریٹ ڈالے بیٹھا تھا۔ یہ یقیناً وہی سکول بس کا بھوت تھا جس کے بارے میں لوگ اکثر باتیں کرتے ہیں۔ ہم ابھی اس کے بارے میں غور کر رہے تھے کہ اچانک درختوں میں سے ایک ننگ دھڑنگ شخص ہاتھ میں بڑا سا پتھر اُٹھائے ہماری طرف دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا ارادہ یقیناً ہمیں مارنے کا تھا۔ اسے دیکھ کر ہم خوفزدہ ہوئے اور بھاگ کھڑے ہوئے''۔

سکول بس کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ ایک بچوں کی بس کو لے کر جانے والا ڈرائیور جب اس قصبہ میں پہنچا تو شیطان نے اس کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اسے بچوں اور اپنی قربانی پیش کرنی چاہئے۔ اس لئے ڈرائیور نے جان بوجھ کر تیز رفتار بس درختوں سے جا ٹکرائی جس کے نتیجے میں کئی بچے اور وہ خود ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد سے یہ بس اسی حالت میں قصبہ میں موجود ہے اور کئی لوگ ڈرائیور

اردو میں ''کرپشن''

کچھ ''پڑھے لکھوں'' کا کہنا ہے کہ اردو میں شامل ہونے والے ہزاروں الفاظ اب اُردو کا حصہ ہی بن چکے ہیں۔ میں یہ عذر لنگ رکھنے والے خواتین وحضرات سے یہ بات دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ بلاجواز اردو کی جگہ انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کرنا مجبوری ہے یا معذوری؟ بے شک! جدید ایجادات و اختراعات کے انگریزی نام (یہ اور بات ہے کہ وہ بھی انگریزی زبان کے الفاظ نہیں بلکہ لاطینی، یونانی یا فرانسیسی زبان کے راستے انگیزی میں داخل ہوئے) اگر انگریزی ہی میں بولے یا لکھے جائیں تو کسی حد تک گوارا کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ''گوارا'' اس لئے کہا ہے کہ ترقی یافتہ اقوام تو کجا متعدد ترقی پذیر ممالک نے بھی ان ایجادات اور اشیاء و آلات کے ناموں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا یا اُن کا مترادف تلاش کر لیا۔ مثلاً عربی زبان میں ''موبائیل فون'' کے لئے ''ہاتف المتحرک''، ''بس'' کے لئے ''منقل''، ''ٹیکسی'' کے لئے ''نقول'' اور ''ایکس رے'' کے لئے ''عکس شق'' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ''ٹیلی وژن'' کو ہندی میں ''دور درشن'' کہا جاتا ہے مگر ہم بھارت کے پڑوسی اور ٹیلی وژن کے میدان میں اس سے پہل کرنے کے باوجود ''دُور نما'' کہنے سے شرماتے ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ایکس ریز کے لئے ''عکس ریز'' جیسا عام فہم مترادف بتایا مگر ہمیں یہ لفظ یا الفاظ بولتے اور لکھتے ہوئے نامعلوم کیوں لاج آتی ہے۔

کے بھوت کو بس میں بیٹھے دیکھنے کا دعویٰ کر چکے ہیں۔

ہیل ٹاؤن میں گھنے درختوں کے عین درمیان ایک پُراسرار آدھ جلا گھر موجود ہے۔ یہاں رات کے وقت آنے والوں کا دعویٰ ہے کہ رات کے وقت اس گھر کی بالائی منزل کی ایک کھڑکی سے روشنی جلتی صاف دکھائی دیتی ہے۔

قصبہ میں ایک قدیم چرچ بھی ہے مگر یہاں نہ تو عبادت کی جاتی ہے اور نہ ہی لوگ یہاں آتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی اس چرچ میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو ایک نقاب پوش بھوت اس شخص کو مار ڈالتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شیطان نما بھوت چرچ کے نیچے بنے تہہ خانہ میں رہتا ہے اور باہر سے آنے والے کسی بھی شخص کو چرچ میں داخل ہونے نہیں دیتا۔ اس کا چہرہ کبھی کسی نے نہیں دیکھا اور وہ کسی کے آنے پر غائب ہو جاتا ہے۔ اس چرچ کے بارے میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ شیطان کے پجاریوں کا گروہ اس چرچ کا مالک ہے اور چرچ کے اندر ہمیشہ ایک موم بتی جلتی رہتی ہے۔

''دی اینڈ آف دی ورلڈ'' کہلانے والی شاہراہ کے بارے میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اس سڑک پر بھوتوں کا راج ہے اسی لئے یہاں گاڑی پر آنے والے حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہونے والے بے شمار حادثات کی وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ بھوت گاڑی کا کنٹرول سنبھال لیتے ہیں اور گاڑی حادثہ کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایک فیملی کے مطابق جو اس شاہراہ پر اپنی گاڑی میں سوار ہو کر آئی جب وہ اس سڑک کے عین درمیان میں پہنچے تو کچھ سیاہ پوش لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور انہیں پکڑنے کی کوشش کی، تاہم خوش قسمتی سے وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس شاہراہ کو ''ہائی وے ٹو ہیل'' کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

قصبہ میں سب سے خوفناک جگہ ''Funeral Home'' ہے جو قبرستان کے بالکل ساتھ بنی ہوئی ہے۔ اکثر لوگوں نے یہاں روحوں اور بھوتوں کو دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ بعض افراد کے مطابق رات کے وقت یہاں کھڑکی سے موم بتیاں جلتی دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ افراد نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے موم بتیوں کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے جنازگاہ کے قریب جانے کی کوشش کی تو عجیب و غریب مخلوق نے ان پر پتھر برسانے شروع کر دیئے۔ جس پر انہیں وہاں سے پیچھے ہٹنا پڑا۔

قبرستان میں ایک قبر کے اوپر بچوں کی اجتماعی قبر کی تختی لگی ہے، کہا جاتا ہے کہ یہاں بس حادثہ میں مرنے والے بچے دفن ہیں۔

ہیل ٹاؤن کے بارے میں مشہور مختلف کہانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہاں شکاری سانپ بہت بڑی مقدار میں رہتے ہیں اور کسی بھی باہر سے آنے والے شخص کا شکار کر کے اسے ہڑپ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہ سانپ خود کو جنگل کے ماحول میں چھپائے رکھتے ہیں اور پھر اچانک سامنے آ کر پہلے شکار کو مسمرائز کرتے ہیں اور پھر اسے ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ان اژدھوں کے بارے میں بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کوئی ماورائی مخلوق ہیں اور اس قدر اچانک نمودار ہوتے ہیں کہ شکار کو بچنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

ہیل ٹاؤن کو جانے والے لوگ یہاں کے خوفناک مناظر اور ماورائے عقل چیزیں دیکھ کر دہشت زدہ رہ جاتے ہیں اور یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ دُنیا کا خوفناک ترین مقام ہے یا پھر اسے زمین پر جہنم کا نام بھی دیتے ہیں۔ امریکہ جیسے دُنیا کے ترقی یافتہ ترین ملک کا یہ حصہ بلاشبہ آج کی دُنیا کے لیے ایک معمہ ہے!

پرعزم

عاصمہ زیدی

"بیٹا یہ تم ابھی نہیں سمجھو گی۔" پروفیسر اُٹھ بیٹھا تھا۔ "باہر چلو، ہمیں اس کی مدد کرنی ہے۔" اور اسی وقت کیبن کے دروازے پر دستک ہونے لگی، دانش آواز دے رہا تھا۔ "زنوبیہ دروازہ کھولو، اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔"

وطن کے سرفروش سپاہی کی کہانی جو تنہا ملک دشمنوں سے ٹکرا گیا تھا

وہ عمارت مشہور سائنس دان حماد گرزیزی کی نگرانی میں تھی اور یہ ایک جزیرے میں تعمیر کی گئی تھی۔ حماد ایک خاص اور حساس نوعیت کے پراجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ اس جزیرے کی طرف کسی کی آمد ورفت نہیں تھی سوائے ان لوگوں کے جو خصوصی اجازت سے وہاں آیا کرتے۔ بغیر اجازت آنے والوں کے لیے قدم قدم پر گھات لگائے ہوئے کمانڈوز تھے جو درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان چھپے رہتے اور ایک آن میں موت کی بارش کر دیا کرتے تھے۔

پروفیسر کی ایک ہی بیٹی تھی زنوبیہ۔ ویسے تو اس کا قیام شہر میں تھا لیکن وہ چھٹیوں میں اس جزیرے

پر آجایا کرتی تھی۔ زنوبیہ کے لیے اس جزیرے پر آنے جانے میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ وہ پورے جزیرے پر کسی بے چین اور اُداس روح کی طرح منڈلاتی رہتی اور محافظوں میں سے کوئی بھی اس کے قریب آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ باپ بیٹی کی ملاقات رات کے کھانے پر ہوا کرتی۔ اس وقت پروفیسر ایک عام انسان بن جاتا جو اپنی بیٹی سے دنیا بھر کی باتیں کیا کرتا، اسے اپنے حالات بتایا کرتا اور زنوبیہ بھی اسے اپنے تجربات سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔

زنوبیہ کی زندگی بہت لگے بندھے اصولوں کے تحت گزر رہی تھی۔ اس کی زندگی میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنا دوست کہہ سکتی۔ انتہائی محتاط انداز سے زندگی گزار رہی تھی۔ ایک دن پروفیسر نے اس سے کہا۔ ”بیٹا میں جانتا ہوں کہ تم کس انداز سے زندگی گزار رہی ہو، تم اپنی شخصیت میں تنہا ہو کر رہ گئی ہو اور یہ سب میری وجہ سے ہے کہ میں تم پر دھیان نہیں دے پارہا۔“

”نہیں بابا، ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ تو میری نیچر سے واقف ہیں کہ میں کسی سے زیادہ گھلنا ملنا پسند نہیں کرتی۔ میرے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ میں آپ جیسے بڑے آدمی کی بیٹی ہوں۔“

”نہیں بیٹا، عمر اور جذبوں کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ تمہاری ماں تو تمہارے بچپن میں ہی اس دنیا سے چلی گئی تھی۔ زندگی گزارنے کے لیے ایک بہترین ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے میری طرف سے اجازت ہے کہ تم خود سمجھ دار اور باشعور لڑکی ہو، میرا خیال ہے کہ تمہارا انتخاب غلط نہیں ہوگا۔“

پروفیسر نے اسے اشارہ دے دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا ساتھی خود چن سکتی ہے۔ اس کے باوجود ابھی تک کوئی بھی زنوبیہ کے قریب نہیں آسکا تھا۔ یا اس نے کسی کی ہمت افزائی نہیں کی تھی۔ وہ شہر سے جزیرے کی طرف آکر بھٹکتی رہتی تھی۔ عام طور پر ساحل کی طرف نکل جاتی اور ایک مخصوص پتھر پر بیٹھ کر گہرے سمندر کی طرف دیکھتی رہتی۔ رات کی تاریکی میں سمندر بہت ہولناک اور پراسرار دکھائی دیا کرتا تھا۔ وہ جس طرف آکر بیٹھا کرتی وہ سمت جزیرے کی جنوبی سمت تھی، اس طرف مسلح محافظ بھی نہیں ہوا کرتے تھے اور نہ کسی قسم کا خطرہ تھا۔

اس شام بھی زنوبیہ اس طرف چلی گئی تھی۔ سورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی۔ دُور دُور تک پھیلا ہوا نیلگوں سمندر اسے بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق ہی تھا۔ وہی چمکتا ہوا دن، اُڑتے ہوئے پرندے، سفید بادلوں کی ٹولیاں اور جزیرے پر پھیلی ہوئی اُداس کردینے والی خاموشی۔ پھر اچانک ایک ہلچل سی برپا ہوگئی۔ یہ ہلچل سطح آب پر ہوئی تھی، دُور ایک لانچ بہت تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی آرہی تھی جس کی رفتار ایسی تھی جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو۔ زنوبیہ کو اس لانچ کا تعاقب کرتے ہوئی ایک اور لانچ بھی دکھائی دی جس کی مخصوص ساخت اور رنگ کی وجہ سے زنوبیہ کو یہ اندازہ کرنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی تھی کہ یہ تعاقب کرنے والی لانچ کوسٹ گارڈز والوں کی تھی۔ اس چھوٹی سی لانچ میں صرف ایک آدمی دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں لانچوں کا رُخ جزیرے ہی کی طرف تھا۔ یقیناً جزیرے والوں نے بھی ان لانچوں کو دیکھ لیا ہوگا پھر اچانک ایک بڑی لانچ کی طرف سے فائرنگ کر دی گئی۔ ایک برسٹ مارا گیا اور چھوٹی لانچ میں موجود شخص اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا،

وہ اُلٹ کر سمندر میں جا گرا تھا جبکہ اس کی لانچ سطح آب پر تیرتی رہ گئی تھی۔

یہ ایک حیرت انگیز اور خوف زدہ کرنے والا نظارہ تھا۔ زنوبیہ خالی الذہن ہو کر یہ سب دیکھتی رہ گئی تھی پھر اس نے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی، کوئی اس کے قریب آرہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اس جزیرے کا سیکورٹی انچارج علی زیب تھا۔ وہ اس کے قریب آکر ادب سے بولا۔

''زنوبیہ بی بی، آپ یہاں سے ہٹ جائیں پلیز۔''

''علی زیب تم نے کچھ دیکھا، یہ کون لوگ ہیں۔ کیوں مارا ہے اسے؟'' زنوبیہ دہشت زدہ ہو کر بولی۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے، وہ ایک اسمگلر تھا جسے کوسٹ گارڈز والوں نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔'' علی زیب نے بتایا۔

یہ بات تو خود زنوبیہ نے بھی سمجھ لی تھی لیکن اب علی زیب سے اس کی تصدیق ہوگئی تھی۔

''آپ ہٹ جائیں یہاں سے پلیز۔ پروفیسر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' علی زیب نے کہا۔

زنوبیہ نے ایک نگاہ سمندر کی طرف دیکھا، کوسٹ گارڈز کی بڑی لانچ اب تک وہاں موجود تھی جبکہ وہ چھوٹی تنہا لانچ لہروں کے سہارے ڈولتی پھر رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

وہ اپنی قیامت کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی لیکن اس کی قیامت کا کوئی پتا نہیں تھا۔ ماریہ نے سب سے پہلے اس کے دوست عامر کو فون کیا۔

''عامر، دانش کہاں ہے، کئی دنوں سے دکھائی نہیں دیا۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کے بارے میں تم سے زیادہ اور کون جانتا ہے؟''

''یہ بات تو ہے لیکن پچھلے دنوں سے موصوف کی سرگرمیاں کچھ پراسرار ہوگئی ہیں۔ نجانے کہاں رہتے ہیں، بہرحال اگر تمہیں مل جائیں تو فوری طور پر میرے پاس بھیج دینا۔''

''ظاہر ہے وہ تمہارے علاوہ اور جا بھی کہاں سکتا ہے۔''

ماریہ اور دانش ایک دوسرے کے گہرے دوست تھے۔ ان دونوں کے درمیان اگرچہ کبھی اظہار محبت نہیں ہوا تھا، اس کے باوجود دونوں کو ایک دوسرے سے گہری محبت تھی۔ دونوں کا تعلق ایک کھاتے پیتے روشن خیال گھرانے سے تھا، اس لیے ملاقاتوں میں بھی کسی قسم کی دشواریاں نہیں تھیں۔ جب چاہا ایک دوسرے سے مل لیے۔ ان کی شامیں اکثر ایک دوسرے کے ساتھ گزرا کرتی تھیں، دونوں کو ایک دوسرے کی سرگرمیوں کا اچھی طرح علم تھا لیکن گذشتہ کچھ دنوں سے دانش کی سرگرمیاں کچھ تبدیل ہوگئی تھیں، وہ ماریہ کے پاس آنے کی بجائے کہیں اور نکل جاتا تھا۔ ماریہ اپنے کمرے میں بند ہو کر بہت دیر تک دانش کے بارے میں سوچتی رہتی، دانش کا تصور اسے ہمیشہ سرشار کر دیا کرتا تھا۔ وہ ایک خوب صورت ذہین اور بے تکلف نوجوان تھا جس کی باتیں بہت خوب صورت ہوا کرتی تھیں اور جس کے سینے میں ایک ایسا دل تھا جس کی دھڑکنیں ماریہ کے لیے مخصوص ہو چکی تھیں۔

بہت دیر کے بعد فون کی بیل بج اٹھی۔ دوسری طرف عامر تھا۔ ''ماریہ مجھے تم سے بہت ضروری ملنا ہے، دانش کے سلسلے میں یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔''

''کیوں خیریت تو ہے نا؟'' ماریہ پریشان ہوگئی۔

''تم..... تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟''

''اس لیے کہ میں خود یہ سب دیکھ رہی تھی۔''

''اوہ.....'' نوجوان نے گہری سانس لی۔ ''تم کون ہو اور اس جزیرے پر کیا کر رہی ہو؟''

''یوں سمجھ لو کہ میں اسی جزیرے پر رہتی ہوں۔''

''تم یہاں رہتی ہو۔''

''ہاں کیونکہ پروفیسر گردیزی میرے والد ہیں۔'' زنوبیہ نے بتایا۔

''پروفیسر گردیزی.....'' نوجوان نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''شاید تم میرے پاپا کو نہیں جانتے، وہ اس ملک کے بہت بڑے سائنٹسٹ ہیں۔'' زنوبیہ نے بتایا۔

''اوہ..... وہ پروفیسر گردیزی۔ ہاں میں نے ان کا بہت نام سنا ہے۔''

''تم زندہ کس طرح بچ گئے؟'' زنوبیہ نے پوچھا۔

''میں سمجھ گیا، تم مجھے باتوں میں اُلجھا کر گرفتار کرانا چاہتی ہو، تم یہ چاہتی ہو کہ اس جزیرے کے محافظ اس طرف آنکلیں۔''

''بیوقوف ہو تم، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اپنی کھڑکی میں کھڑی تھی، میں نے تمہیں وہیں سے دیکھا تھا اور اکیلی اسی لیے اس طرف آئی ہوں کہ شاید تمہاری کوئی مدد کرسکوں۔''

''کیوں؟ تم میری مدد کیوں کرنا چاہتی ہو؟''

''بس یونہی، شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ یہاں کے ماحول میں کچھ تبدیلی چاہتی تھی، تمہارے آنے کے بعد یہاں تبدیلی آگئی ہے۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟''

''دانش ہے میرا نام۔'' اس نوجوان نے جواب دیا۔ زنوبیہ اس نوجوان کے لیے کھانے کے ڈبے اور پانی کی بوتل لے آئی تھی۔ اس نے دانش کے لیے ایک ایسی جگہ تلاش کر لی جہاں وہ آسانی سے اس جزیرے پر چھپ سکتا تھا۔ زنوبیہ کو اس سے ہمدردی ہوگئی تھی اور کچھ انسیت بھی محسوس ہونے لگی تھی جیسے وہ نوجوان بہت دنوں سے اس کے ساتھ ہو، اب اس نوجوان کے آنے سے اس جزیرے کی بوریت اچانک ختم ہوگئی تھی۔ ایک سنسنی سی تھی، اس جزیرے پر رہنے کا ایک مقصد اس کے سامنے آگیا تھا۔

اس نے دانش کے لیے دوسرے لباس کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔ یہ لباس وہ اپنے باپ کے وارڈ روب سے چرا کر لائی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پروفیسر کو اپنے کپڑوں کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اسی لیے اسے اس چوری کا احساس بھی نہیں ہو سکے گا، کھانے کے ڈبوں اور پانی کی بوتلوں کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

''آخر کیوں تم میرے لیے یہ سب کچھ کر رہی ہو؟'' دانش نے پوچھا۔

''سچ تو یہ ہے کہ میں یہ سب تمہارے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کر رہی ہوں۔'' زنوبیہ نے کہا۔

''میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔''

''تم شاید یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں کس انداز کی زندگی گزار رہی ہوں، ایک خاموش، ویران اور اُداس زندگی، ایک جیسے شب و روز، کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کو دوست کہہ کر مخاطب کرسکوں۔ ہر طرف احترام کرنے والے لوگ ہیں۔ اسی لیے تمہارے آنے کے بعد زندگی میں ایک ہلچل محسوس ہونے لگی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے مجھے شاید اسی ہلچل کی ضرورت تھی۔''

''زنوبیہ، تمہارا احسان ہے کہ تم نے ایک اسمگلر کو اس قابل سمجھا۔''

''مجھے یقین نہیں آتا کہ تم جیسا آدمی اسمگلر

بھی ہوسکتا ہے، آخر تم اسمگلر کیسے ہو گئے؟ کیوں ہو گئے؟''

''بس وقت اور حالات نے اس مقام پر پہنچا دیا ہے مجھے، زندگی میں جب پریشانیاں بڑھنے لگیں اور واپسی کی کوئی راہ نہیں رہی تو پھر کچھ ایسے لوگ مل گئے جنھوں نے مجھے یہ راہ دکھائی اور میں بھی آنکھیں بند کر کے اس راہ پر چل پڑا۔''

''اور اب، اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا۔'' دانش نے ایک گہری سانس لی۔ ''حالانکہ میں فزکس میں ایم ایس سی ہوں۔''

''کیا.....؟'' زنوبیہ یہ سن کر اچھل پڑی۔ ''فزکس میں ایم ایس سی۔''

''ہاں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، اتنی پڑھائی کا، زندگی جس طرح پہلے دشوار تھی اسی طرح آج بھی دشوار ہے۔''

''اگر تم کہو تو میں اپنے پاپا سے تمہارے لیے بات کروں۔''

''کیا بات کرو گی؟''

''یہی کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھ لیں۔ تم ان کے معاون کے طور پر ان کی لیبارٹری میں کام کر سکتے ہو۔''

''کیا تمہارے پاپا کسی اسمگلر کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے؟''

''اوہو، پاپا کو یہ تو نہیں بتایا جائے گا کہ تم کوئی اسمگلر ہو، بلکہ تم میرے دوست ہو اور میں تمہیں اپنے ساتھ شہر سے لے کر آئی ہوں۔''

''لیکن یہ سب کس طرح ہوگا؟''

''ہوگا یوں کہ میں تمہیں ایک چھوٹی بوٹ کا بندوبست کر دوں گی، رات میں تھوڑی دُور تک تم اس لانچ کو چپوؤں کے ذریعے دور تک لے جاؤ گے اس کے بعد اس کا انجن اسٹارٹ کر کے شہر تک جاؤ گے، میں دو چار دن کے بعد شہر آجاؤں گی، جہاں موبائل کے ذریعے ہم دونوں رابطہ کریں گے پھر میں شہر سے تمہیں لے جا کر اپنے پاپا سے متعارف کراؤں گی، تم میرے مہمان بن کر آؤ گے، پاپا سے تمہاری سفارش ہو گی اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری سفارش مان لیں گے۔''

''کیا مجھے اسمگلر کی حیثیت سے شناخت نہیں کر لیا جائے گا؟''

''اس کے لیے تمہیں اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی ہوگی۔ اس کے علاوہ کسی کو شبہ بھی ہوسکتا ہے، یقین نہیں ہوسکتا کیونکہ دانش نام کا اسمگلر کوسٹ گارڈز سے جھڑپ میں مارا جا چکا ہے۔''

''اوہ..... اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے پہلے سے سب کچھ سوچ رکھا ہے۔''

''سب کچھ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ پھر تمہاری باتیں سنی تھیں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر میں تیار ہوں، اب اصل مسئلہ جزیرے سے نکلنے کا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو، بس میں جس بوٹ کی نشاندہی کروں تم اس تک پہنچ کر اس میں چھپ جانا۔ رات کو دو بجے ڈیوٹی بدلتی ہے، بس تم نے اس دوران ہوشیاری سے بوٹ کو ساحل تک لے جانا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' دانش نے کہا پھر وہ ہوشیاری سے بوٹ میں جا کر چھپ گیا اور وقت مقررہ پر بوٹ کو ساحل تک لے گیا۔ پھر اس نے چپوؤں کی مدد سے اسے دھکیلنا شروع کر دیا اور کافی دُور تک لے گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اطمینان سے بوٹ کا انجن اسٹارٹ کیا اور شہر کی طرف چل پڑا۔ زنوبیہ دُور بین سے سب کچھ دیکھ رہی تھی پھر وہ اطمینان سے کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر اپنی جگہ آگئی تھی۔

شہر پہنچنے کے بعد دانش نے زنوبیہ کو فون کر کے اپنے صحیح سلامت پہنچنے کی اطلاع دی اور زنوبیہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ دو دن کے بعد شہر پہنچ گئی تھی، وہاں پہنچ کر دانش سے ملی اور پروگرام کے مطابق دونوں واپس جزیرے پر پہنچ گئے۔ زنوبیہ کسی انتظار اور تاخیر کے بغیر دانش کو اپنے پاپا کے پاس لے آئی تھی۔ اس نے دانش کے بارے میں پروفیسر کو بتاتے ہوئے کہا۔

''پاپا، دانش وہ آدمی ہے جس کی مجھے تلاش تھی، مضبوط، مخلص، بہادر اور ساتھ دینے والا۔''

''بہت خوب'' پروفیسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی اور وہ متلاشی نگاہوں سے دانش کا جائزہ لے رہا تھا۔

''پاپا یہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے، اس نے فزکس میں ماسٹر کی ڈگری لے رکھی ہے۔''

''جی جناب۔'' دانش ادب سے بولا۔ ''میں نے اب تک کی جو زندگی گزاری ہے میں اسے فراموش کر دینا چاہتا ہوں، بہت پریشان رہا ہوں ہر وقت کی بھاگ دوڑ۔ سر پر خوف اور موت کی تلوار لٹکی ہوئی، اسی لیے چاہتا ہوں کہ زندگی کو کسی اور انداز سے گزارنے کی کوشش کروں اور اس کوشش کے لیے مجھے آپ سے بہتر اور کون مل سکتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' پروفیسر کچھ سوچنے لگا۔ ''دیکھو نوجوان بُرا ماننے کی بات نہیں ہے، تم ایک مجرم ہو پولیس کو تمہاری تلاش ہے، اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود اس معاشرے میں تمہاری حیثیت بہت مشکوک ہے جبکہ میں ایک معزز آدمی ہوں۔ ایک ساکھ ہے میری، عوام میں بھی اور حکومت کی نگاہوں میں بھی، اب ایسے میں اگر میں نے تمہیں پناہ دی تو خود میری پوزیشن کیا رہ جائے گی، اس کا تمہیں اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے۔''

''جی ہاں مجھے اندازہ ہے۔''

''دوسری طرف تمہاری اپنی صلاحیتیں ہیں، تم نے جس انداز سے زنوبیہ کی حفاظت کی ہے، اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں سارے خدشوں سے بے نیاز ہو کر تمہاری مدد کروں۔''

''پاپا..... آپ کو یہ تو کرنا ہی ہوگا، میں دانش کو اب یہاں سے جانے نہیں دُوں گی۔''

''اوکے اوکے۔'' پروفیسر نے کہا ''لیکن میں ابھی اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ دو چار دن سوچنے کے بعد بتاؤں گا۔'' اور دو چار دن کے بعد پروفیسر کا فیصلہ ان دونوں کے حق میں تھا۔

''ٹھیک ہے، میں دانش پر اعتماد کرتے ہوئے اسے اپنی ٹیم میں شامل کر رہا ہوں، یہ لیب میں میرے ساتھ رہے گا لیکن اس طرح نہیں، اسے شہر جانا ہوگا اور وہاں جا کر یہ اپنے آپ کو تھوڑا بہت تبدیل کر لے، اس کے بعد زنوبیہ تم شہر جا کر اسے اپنے ساتھ لاؤ گی اور یہ ظاہر کیا جائے گا کہ تم اپنے کزن کو میری مدد کے لیے لے کر آئی ہو۔''

یہ پلان طے پا گیا اور اس پلان کے تحت دانش کو شہر بھیجا گیا، جہاں اس نے اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی بھی کر لی، کچھ دنوں کے بعد زنوبیہ بھی پلان کے مطابق دانش کے پاس پہنچ گئی اور اب ان دونوں کو جزیرے کی طرف واپس جانا تھا۔

پروفیسر بہت گہری نگاہوں سے دانش کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کمرے میں دانش، پروفیسر اور زنوبیہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ البتہ ایک اعصاب شکن خاموشی ضرور تھی۔

''نوجوان، تم ہر لحاظ سے میرے معیار پر پورا اُترے ہو۔ تم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زندگی کے اس تھکا دینے والے سفر میں تم زنوبیہ کے بہترین رفیق بن سکتے ہو۔''

ڈاکٹر ایم اے فاروقی کی ایک اور معرکۃ الآرار کتاب

لوک دوائیں
لوک علاج

شائع ہوگئی ہے

خدا کرے آپ ہمیشہ صحت مند رہیں لیکن خدانخواستہ اگر آپ کسی بھی جسمانی مرض میں مبتلا ہوں تو فوراً ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے استفادہ حاصل کریں۔ یہ کتاب نہیں ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جسمیں ہر بیماری کیلئے کئی طریقہ علاج بتائے گئے ہیں۔

300/=

یہ کتاب ہر گھر کی ضرورت ہے

''جناب میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا، آپ تو جانتے ہیں کہ میرا بیک گراؤنڈ کیا ہے، میں کیسا آدمی ہوں؟''

''ہاں تم ایک مجرم ہو، ایک خطرناک مجرم، تمہارے بارے میں ساری معلومات مجھے حاصل ہو گئی ہیں۔ میرے آدمیوں نے تمہاری ہر بات کا سراغ لگا لیا ہے، تم سے ایک قتل بھی سرزد ہو گیا ہے، پولیس تمہارے تعاقب میں ہے اور شاید تمہیں یہ نہ معلوم ہو کہ پولیس تمہارے باپ اور بھائی کو تمہاری وجہ سے گھر سے اٹھا کر لے گئی ہے۔'' دانش لڑکھڑا کر رہ گیا تھا، اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

''حوصلہ رکھو دانش، اب تم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ان کے بارے میں سوچنے اور پریشان ہونے سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔''

''میں کوشش کروں گا کہ انہیں چھوڑ دیا جائے، ویسے بھی اگر تم پولیس کے ہاتھ نہیں آئے تو وہ انہیں چھوڑ ہی دے گی، اب تمہیں وہ بات بتانی ہے جس کے لیے اس وقت تمہیں بلایا ہے۔''

''یس سر۔'' دانش نے جواب دیا۔ ''ابھی میرے پاس آپ کی بات سننے کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں ہے کیونکہ میں نے اپنی ساری کشتیاں جلا دی ہیں، واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''تم اُداس مت ہو، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' یہ کہہ کر پروفیسر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ''اب میں تمہیں ایک مختصر سی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ اس کہانی کو سن کر تمہیں یہ اندازہ ہو جائے گا کہ میں تم سے کیا چاہتا ہوں۔''

''یس سر، میں سن رہا ہوں۔''

''جو کچھ میں سنانا چاہ رہا ہوں وہ زنوبیہ کے لیے بھی نیا ہوگا، یہ کہانی ایک ذہین ترین طالب علم کی ہے جس نے سائنس کے شعبے میں اپنی مہارت اور ذہانت تسلیم کروالی تھی۔ استاد اسے پسند کرتے تھے اور اب اس کا مستقبل شاندار قرار دیتے تھے۔ اس نے زمانہ طالب علمی میں ایسی ایسی چیزیں ایجاد کر لی تھیں جو پوری دنیا میں تہلکہ مچا سکتی تھیں، وہ شخص میرا بڑا بھائی تھا۔''

''ڈیڈی آپ نے پہلے کبھی مجھے نہیں بتایا کہ آپ کے بڑے بھائی بھی سائنس دان تھے۔''

''بیٹا اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ بہر حال اس کی کہانی سن لو جو مجھ سے کہیں زیادہ ذہین تھا، اس کی وجہ سے میں بھی سائنس کے شعبے میں آ گیا۔ ایک بہت بڑا سائنس دان بننے کی آرزو کی اور میں اس سے زیادہ خوش نصیب ثابت ہوا ہوں۔ بہر حال ہوا یہ کہ اس غریب نے ایک شاندار فارمولا دریافت کیا، میں اس وقت اس کی تفصیل نہیں بتاؤں گا بس اتنا سمجھ لو کہ اس فارمولے کی وجہ سے اس ملک کو بہت فائدہ ہو سکتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اس فارمولے کی وجہ سے اس کی پورے ملک میں پذیرائی ہوگی، اسے سر آنکھوں پر بٹھایا جائے گا لیکن اس کے برعکس اسے مروا دیا گیا۔''

''کیا کہہ رہے ہیں ڈیڈی۔''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، یہاں کے بڑوں نے اس کا قتل کروا دیا کیونکہ ان کے مفادات اس کی دریافت سے تباہ ہو جاتے۔ یہ میرے لیے بہت بڑا دُکھ تھا۔ بہت بڑا المیہ تھا پھر میں نے ایک بات کا تہیہ کر لیا، وہ میری زندگی کا وہ فیصلہ تھا جس پر میں آج تک عمل کرتا آ رہا ہوں اور اب اس فیصلے کا نتیجہ سامنے آنے والا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں سر، کیا فیصلہ تھا آپ کا؟'' دانش نے پوچھا۔

''وہ فیصلہ یہ تھا کہ میں اس ملک کے وسائل سے کام لوں گا، یہاں کے وسائل کو استعمال کروں

گا لیکن اس ملک کو اپنی ذات سے کوئی فائدہ نہیں پہنچاؤں گا کیونکہ یہ اس قابل ہی نہیں ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔

یہ ایک انوکھا سفر تھا، زنوبیہ کو سب سے زیادہ حیرت ہو رہی تھی، بالآخر پروفیسر نے اپنی کہانی سُنا دی تھی اور کہانی کا اختتام کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''تو اس طرح میں نے ایک اہم فارمولے پر کام شروع کر دیا، میں ایک ایسی دریافت کرنے والا تھا جو پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیتی اور یہ فارمولا جس ملک کے ہاتھ لگ جاتا اس کی طاقت، عظمت کو سب جھک کر سلام کرتے، اسی دوران مجھے کچھ غیر ملکی ملے اور انہوں نے پیشکش کی کہ میں یہ فارمولا مکمل ہونے کے بعد اسے لے کر ان کے ملک آ جاؤں۔ جہاں وہ مجھے دنیا بھر کی سہولیات دینے کو تیار ہیں۔ میں کئی ہفتوں تک اس پیشکش پر غور کرتا رہا پھر میں نے ان کی پیشکش قبول کر لی۔''

''ڈیڈی یہ تو شاید اچھی بات نہ ہوئی۔'' زنوبیہ نے کہا۔

''نہیں بیوقوف! یہی تو اچھی بات ہوئی ہے، یہاں کیا ملا ہے مجھے اور اس ملک سے اپنا انتقام بھی لینا تھا بہر حال اب وہ فارمولا تیار ہے اور میں اس ملک سے روانہ ہو رہا ہوں، میرے ساتھ تم ہو اور دانش ہے جو مستقبل میں تمہاری زندگی کا ساتھی بننے والا ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ میں آپ کا ساتھ دوں گا؟'' دانش نے پوچھا۔

''پورا یقین ہے کیونکہ تمہارے پاس اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے، تم اور کہاں جاؤ گے؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں اور کوئی راستہ نہیں ہے میرے پاس لیکن ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟''

''بہت آسانی سے، کل رات اس ملک کی آبدوز آنے والی ہے، وہ ہمیں اپنے ساتھ لے جائے گی۔''

''ڈیڈی، کیا آپ کو یہ سب کرتے ہوئے دُکھ نہیں ہوگا؟'' زنوبیہ نے پوچھا۔

''نہیں کیونکہ میں ناقدروں کے ملک میں زندگی نہیں گزارنا چاہتا۔ یہ شاید دنیا کا واحد ملک ہے جس میں ٹیلنٹ کی کوئی قدر نہیں ہے، یہاں اپنے فائدے کے چکر میں ٹیلنٹ کا سر کچل کر رکھ دیا جاتا ہے اور پوری قوم تماشا دیکھتی رہ جاتی ہے، یہ المیہ صرف ایک شعبے کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ہر شعبے کا یہی حال ہے۔ اول تو کسی بھی ٹیلنٹ کو ملک میں آنے نہیں دیتے، اگر کوئی ملک میں پیدا ہو جائے اور وہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنا چاہے تو اسے تباہ کر کے رکھ دیا جاتا ہے، جیسے میرے بھائی کو کر دیا گیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' دانش نے کہا۔

''تو بس اسی لیے میں تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں، ایک نئی دنیا میں، ایک نئی زندگی کی طرف، اس مرحلے میں مجھے سب سے زیادہ فکر زنوبیہ کی تھی، اس کا کیا ہوگا۔ ہم جہاں جا رہے ہیں وہاں کا کلچر بالکل مختلف ہے، زنوبیہ کا جیون ساتھی بھی اسی انداز کا ملتا لیکن اب تم ہمارے ساتھ ہو۔''

''لیکن میں تو ایک مجرم ہوں۔''

''مجرم تم یہاں ہو، وہاں تمہیں ایک خاص اہمیت حاصل ہو گی، تم کو معزز شہری سمجھا جائے گا کیونکہ تم پروفیسر کے ہونے والے داماد ہو گے۔''

زنوبیہ نے ایک نظر پروفیسر پر ڈالی اور پھر دانش کی طرف دیکھ کر اپنی گردن جھکا لی۔

اسی رات پروفیسر کے کہنے کے مطابق ان کا وہ

غائب دماغ

ایک غائب دماغ پروفیسر سے ان کی بیوی بولی، مبارک ہو ہمارا بیٹا اب چلنے لگا ہے۔

پروفیسر صاحب: کب سے؟

بیوی بولی: آٹھ دن سے۔

پروفیسر صاحب: اور تم مجھے اب بتا رہی ہو وہ اتنے دنوں میں کتنی دُور نکل گیا ہوگا۔

سفر شروع ہو گیا تھا، جزیرے کے محافظ، اعلیٰ حکام سب کے سب بے خبر رہے تھے اور ایک آبدوز انہیں لے کر ایک انجان سفر کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔

اس آبدوز تک وہ اپنی لانچ میں آئے تھے، ان سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا تھا، ظاہر ہے پروفیسر اپنی بیٹی اور قابل اعتماد اسسٹنٹ کے ساتھ سمندر کی سیر کو جا رہا تھا اسی لیے انہیں کون روک سکتا تھا۔

اس سفر میں کسی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا صرف پروفیسر کے پاس ایک بریف کیس تھا اور بقول پروفیسر کے اس بریف کیس میں ایک قیمتی خزانہ موجود تھا۔ اس آبدوز کا عملہ پروفیسر کے سامنے بچھا جا رہا تھا، بہر حال یہ سب کچھ زنوبیہ کے لیے ایک خواب ہی لگ رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

گہرے سمندر میں اس آبدوز کے علاوہ ایک اور آبدوز موجود تھی۔ اس آبدوز میں کمانڈر علی تھا جس کے ذمے یہ فریضہ تھا کہ غیر ملکی آبدوز کی نگرانی اور اس کا گھیراؤ کیا جائے، اس مہم کو ''آپریشن بلیک نائٹ'' کے نام سے پکارا جا رہا تھا۔ غیر ملکی آبدوز کے بارے میں لمحہ بہ لمحہ رپورٹ کمانڈر علی کو دی جا رہی تھی۔ انہیں دوسری آبدوز کی طرف سے ایک سگنل کا انتظار تھا اور ان کا آپریشن شروع ہو جاتا، سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ سگنل ملنے سے پہلے وہ آبدوز کہیں بین الاقوامی سمندر کی حدود میں نہ پہنچ جائے۔

''سر! آخر یہ معاملہ کیا ہے؟'' ایک آفیسر نے چائے کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا مقصد ہے اس آپریشن کا؟''

''وقت آنے پر سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔'' علی نے کہا ''بس اتنا سمجھ لو کہ یہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے اور ہمیں ہر حال میں اس آپریشن میں کامیاب ہونا ہے۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک سامنے والی آبدوز سے سگنل موصول ہونا شروع ہو گیا تھا۔

زنوبیہ کے لیے یہ سب کچھ ایسا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے یا کوئی حیرت انگیز فلم سامنے اسکرین پر دکھائی جا رہی ہو، جو کچھ بھی ہوا یا جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ اول دانش کا جزیرے پر آنا، زنوبیہ اور دانش کی ملاقات پھر پروفیسر کا حیرت انگیز انکشاف کہ وہ کسی اور ملک کے لیے کام کر رہا ہے اور اب یہ ایک بھیانک سفر اور اسی سفر میں اچانک وہ سب کچھ جو ایک حیرت انگیز خواب کی طرح تھا۔

دانش نے اچانک اپنی جیب سے پستول نکال کر اس کا رُخ پروفیسر کی جانب کر دیا تھا۔ ''بس پروفیسر اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔'' اس نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

دانش نے کوئی جواب دینے کی بجائے پروفیسر پر حملہ کر دیا، اس نے پستول کے دستے سے ضرب اس کے سر پر لگا دی تھی، پروفیسر بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ اس وقت یہ تینوں ایک کیبن میں تھے۔ زنوبیہ دم بخود ہو کر یہ سب دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہی حقائق وہی کہانیاں جو روز و شب ہمارے چاروں طرف رقص کناں ہیں

کالی دھوپ سنہری چھاؤں

نوشابہ اختر

نئی کتاب نیا انداز نئے حقائق نئی سچائیاں

دراصل دھوپ کبھی کالی نہیں ہوتی لیکن ارتداد زمانہ کا کوڑا جب لگاتار برستا ہے تو سردیوں کی نرم ملائم دھوپ بھی بدن کو جھلسا کر سیاہ کر دیتی ہے۔ نگاہ جب اوپر اُٹھتی ہے تو بندے کی کراہ میں سورج کی کرنیں سیاہی مائل ہو جاتی ہیں۔

قیمت: 500 روپے

رنگین سرورق ○ اعلیٰ سفید کاغذ ○ صفحات 400

منگوانے کا پتہ: سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور فون 37245412

''یہ...... یہ تم نے کیا کیا؟'' اس نے دانش سے پوچھا۔

''تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنے ملک کا ساتھ دینا ہے یا اپنے باپ کا؟''

''ظاہر ہے اپنے باپ کا۔''

''شاباش......'' دانش نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ''اب سب ٹھیک ہے، تم یہیں پروفیسر کے پاس رہو کیبن کا دروازہ اندر سے بند رکھنا اور صرف اس وقت کھولنا جب تمہیں میری آواز سنائی دے۔''

''لیکن تم...... تم کہاں جا رہے ہو؟''

''مجھے صرف کنٹرول روم پر قبضہ کرنا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کام میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔''

دانش کیبن سے باہر چلا گیا، پروفیسر ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ زنوبیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ باپ کی یہ حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی، پروفیسر نے ایک کراہ کے ساتھ کروٹ بدلی، زنوبیہ دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئی۔ ''ڈیڈی......! آپ نے ایسا کیوں کیا، کیوں کیا ایسا؟''

''نہیں میری جان، میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔'' پروفیسر کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی پھر اس نے پوچھا۔ ''وہ دانش کہاں ہے؟''

''وہ کنٹرول روم کی طرف گیا ہے۔'' زنوبیہ نے بتایا۔

''کاش وہ کامیاب ہو جائے۔'' پروفیسر دھیرے سے بولا۔

''ڈیڈی آپ......''

''بیٹا یہ تم ابھی نہیں سمجھو گی۔'' پروفیسر اُٹھ بیٹھا تھا۔ ''باہر چلو، ہمیں اس کی مدد کرنی ہے۔'' اور اسی وقت کیبن کے دروازے پر دستک ہونے لگی، دانش آواز دے رہا تھا۔ ''زنوبیہ دروازہ کھولو، اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔''

دانش اس منصوبے کا ایک اہم رکن تھا، اس پر انحصار کرتے ہوئے اسپیشل برانچ والوں نے اسے پروفیسر کے ساتھ اٹیچ کیا تھا، اصل میں وہ اسپیشل برانچ کا ایک اہم رکن تھا اور یہ بات اس کے گھر والے تک نہیں جانتے تھے، ایک پروگرام کے تحت اسے اسمگلر کی حیثیت دی گئی۔ اصل بات یہ تھی کہ پروفیسر ایک فارمولے پر کام کر رہا تھا اور غیر ملک کے لوگوں نے اس سے رابطے کیے تھے لیکن پروفیسر اگر اپنے ملک کے اعلیٰ حکام کو آگاہ کر دیتا تو ان حکام میں کچھ لوگ ایسے تھے جو اندر سے اس ملک سے ملے ہوئے تھے چنانچہ پروفیسر نے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس کے ملک کے ان حکام کو بھی ساتھ لے جایا جائے۔ جب ان حکام سے بات کی گئی تو انہوں نے بیرون ملک جانے کی خوشی میں اس پیشکش کو قبول کر لیا۔

پھر پروگرام کے تحت پروفیسر، زنوبیہ اور دانش کے ساتھ ان تمام افراد کو بھی آبدوز میں ساتھ لے لیا گیا۔ اس طرح جب تمام افراد اس ملک کی طرف چل پڑے تو ان کا گھیراؤ شروع کر دیا گیا اور دانش نے دشمن کی آبدوز کے کنٹرول روم پر قابو پا لیا اور اپنے ملک کی آبدوز کو سگنل دے دیا اس طرح وہ سب لوگ آبدوز سمیت پکڑے گئے جو اس غداری کے مرتکب تھے۔

دانش کو اس جرأت مندانہ کارنامے کے لیے حکومت کی طرف سے انعام دیا گیا اور سب سے بڑا انعام اس کے لیے زنوبیہ تھی جس سے اس کی شادی کر دی گئی۔

Pakistanipoint.com

بے جوڑ رشتے

فرحت قادر

ماضی میں رشتہ جوڑتے وقت دونوں خاندانوں کی پہچان حسب نسب سے نہیں اسلامی ماحول' پابندیٔ صوم وصلوٰۃ' سیرت وکردار' لڑکے کی آمدنی حلال' لڑکی کے سلیقہ شعار وحیادار ہونے سے ہوتی تھی۔ مگر اب شادی دفاتر نے ہماری روایات اور بزرگوں کی طرف سے طے شدہ اصولوں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

ایک اہم معاشرتی مسئلہ کی طرف توجہ دلاتی پُراثر تحریر

سال 2019ء کی آخری شب تھی اور سال 2020ء کی پہلی..... آپ سمجھ گئے ہونگے کہ اس سے میری مراد 31 دسمبر 2019ء اور یکم جنوری 2020ء کی درمیانی شب ہے۔ سردی کی شدت نے انسانوں کے ساتھ چرند و پرند کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ دھند نے بری وہوائی سفر کو بُری طرح متاثر کررکھا تھا۔ بے پناہ خنکی کی وجہ سے سرشام گلیوں اور بازاروں میں سناٹا چھا جاتا اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں لحاف لئے آگ سینکتے' ڈرائی فروٹ یعنی خشک میوہ جات' حلوہ جات اور چائے

کافی سے لطف اندوز ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ سردی اور سردی کی وجہ سے ہونے والی بیماریوں سے بچنے کے لئے سرکاری اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں گزشتہ سالوں کی نسبت سال 2019ء میں کچھ زیادہ ہی تعطیلات کردی گئی تھیں اور جنوری 2020ء میں سردی میں کمی نہ ہونے کے باعث تعطیلات میں مزید اضافہ کردیا گیا۔ ہر ایک یہی اندازہ لگائے بیٹھا تھا کہ اب سردی کی شدت میں کمی ہونے کے بعد ہی عوام کی ریل پیل سڑکوں پر دکھائی دے گی۔ مگر ہوا یہ کہ جیسے ہی 31 دسمبر 2019ء کا سورج غروب ہوا پوری دنیا میں عوام سال 2020ء کا جشن منانے سڑکوں پر نکل آئے۔ زبردست چراغاں کیا گیا' دوست احباب اور عزیز و اقارب نے حتیٰ کہ مختلف ممالک کے حکمرانوں نے بھی ایک دوسرے کو نئے سال کی خوشی میں مبارکبادیں دیں اور وصول بھی کیں۔ زبردست چراغاں کیا گیا' یکم جنوری 2020ء کا آغاز ہوتے ہی یعنی کہ رات 12 بجکر ایک منٹ پر پاکستان ٹیلی ویژن نے نہ صرف اپنے ملک بلکہ پوری دنیا کے ممالک میں ہونے والی چراغاں اور عوام کے اجتماعات کا منظر پیش کیا۔ اخبارات اور میگزین بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ دعوتیں اُڑائی گئیں' رات گئے تک عوام ساحل سمندر' تفریحی مقامات' پارک' چوراہوں اور ہوٹلوں میں دکھائی دیئے۔ خوب ہلا گلا کیا گیا۔ محفل موسیقی اور رقص و سرود کی محافل کا انعقاد بھی کیا گیا۔ ہمارے اپنے پیارے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان کے عوام بشمول مرد' عورتیں' بچے' بوڑھے اور جوان ان سب کے چہرے بڑے ہی ہشاش بشاش اور خوش و مسرت سے اس قدر لبریز دکھائی دے رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب ہم ہر غم ہر دُکھ ہر مصیبت سے آزاد ہوگئے ہیں۔ ہمیں ظالموں سے نجات مل گئی ہے۔ دہشت گردوں کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ نہ کوئی ڈاکو رہا ہے نہ چور نہ ہی دھوکہ باز' اب تو ایک بڑی تبدیلی آکر رہے گی۔ یہ ریاست' ریاست مدینہ ہی ہوگی۔ نشہ اور آئس کا دھندہ کرنے والوں کا ستیاناس ہوگا' رشوت لینے والے کہیں دکھائی نہ دیں گے' والدین کی نافرمانی کرنے والے راہ ہدایت پائیں گے' ہر شخص انفرادی طور پر اپنے متعلقہ فرائض اور ذمہ داریوں کو پہچانے گا' راتوں رات امیر بننے کے خواب اب کبھی نہیں آئیں گے۔ رزق حلال کو عین عبادت سمجھیں گے۔ اب کوئی کسی کے ہاتھوں خوامخواہ' بغیر کسی قصور اور بغیر کسی جرم کے قتل نہیں کیا جائے گا۔ ناپ تول میں کمی' چور بازاری' لوٹ مار' ناجائز منافع خوری' معصوم بچوں کا گھروں' دکانوں' ہوٹلوں پر ملازم ہونا جسے ہم عرف عام میں چائلڈ لیبر کہتے ہیں..... ختم ہوجائے گا۔ لاکھوں بچوں کا تعلیمی اداروں سے باہر ہونا' خواتین پر ظلم ستم' معصوم بچیوں سے زیادتی اور پھر قتل جیسے واقعات..... اب بالکل ایسا نہیں ہوگا۔

میڈیا کی ایک خبر کے مطابق ہمارے ملک کے 45 فیصد عوام کی یہ رائے تھی کہ نیا سال 2020ء ہم سب کے لئے خوش آیند ہوگا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو' آمین ثم آمین۔ یقیناً ہوگا کیونکہ پاکستانی ایک زندہ قوم ہے بڑی بہادر اور غیور ہے۔ جس کام کا عہد کرتی ہے اس سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ اگر ان کی یہ رائے ہے کہ 2020ء کا سال پاکستان کے لئے اور پاکستانی قوم کے لئے خوش آیند ہوگا تو وہ ایسا کرکے ضرور دکھائیں گے انشاء اللہ۔

قارئین ہر ایک انسان کی زندگی میں اس کی عمر

کے مطابق کئی سال آتے ہیں۔ پورا سال انتظار کے بعد نیا سال آتا ہے مگر جب آتا ہے تو ایسے تیزی سے گزر جاتا ہے کہ جیسے پلک جھپکتے دیر نہیں لگتی۔ ابھی نئے سال 2020ء کو ہی دیکھ لیجئے' نئے سال کی خوشی کے بعد یوم یکجہتی کشمیر گزرا ہے اور اب اس ماہ میں 23 مارچ کو قرارداد پاکستان کا دن منایا جائیگا جو پاکستان کی تاریخ کا بڑا ہی اہم باب ہے جس کو یوم پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔ اکثر لوگ ہر سال اپنے یوم پیدائش پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنے عزیز و اقارب کو سالگرہ کی دعوت پر مدعو کرتے ہیں' مبارکیں اور تحائف وصول کرتے ہیں اس طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی کہ یہ تو ہماری عمر میں تخفیف کا دن ہے۔ آج سے صرف دو ماہ قبل سال 2020ء کا شدت سے انتظار تھا اب اس ماہ کے آخری میں اس کی پہلی سہ ماہی ختم ہونے کو ہے۔ زندگی ریل کی مانند اپنے سفر پر رواں دواں ہے' وہ سفر جس کو ہم موت کہتے ہیں' فنا کہتے ہیں۔ جی ہاں یہ دنیا بھی فانی ہے اور ہر ذی روح کو بھی فنا ہے۔ ہمیشہ قائم رہنے والی ذات تو صرف اللہ رب العزت کی ہے۔

سال 2020ء کے ساتھ ہمارے عوام نے جو نیک خواہشات اور توقعات وابستہ کی ہیں ان کے برعکس بہت سے خوفناک' خطرناک اور دردناک واقعات منظر عام پر جوں کے توں آرہے ہیں۔ اس سال کا سب سے بڑا تحفہ کرپشن ہے جو کہ سرفہرست دکھائی دے رہا ہے۔ دوسرے نمبر پر ہر شخص کا اپنے آپ کو اعلیٰ سمجھنا اور دوسروں کو حقیر جاننا خود کو کسی بھی عہدہ' حیثیت کے اہل سمجھنا دوسروں پر کیچڑ اچھالنا ان کے ہر کام میں کیڑے نکالنا' بلاجواز تنقید کرنا' اب تو یہ کام حکومتی سطح پر بھی ہونے لگا ہے۔ کرپشن اور خود پرستی نے ہماری پریشانیوں میں اضافہ کردیا ہے اور نہ صرف قومی سطح پر بلکہ گھر گھر میں بے سکونی پیدا کردی ہے۔

اس وقت چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی بلاخوف و خطر کرپشن میں ملوث ہے۔ احساس نام کی کوئی چیز معاشرے میں دکھائی نہیں دیتی۔ مہنگائی عروج پر ہے۔ آٹا جو ہر آدمی کی بنیادی ضرورت ہے اس کا سخت بحران پیدا کردیا گیا ہے۔ ایک طرف میڈیا کی مہنگائی اور آٹے کے بحران کی پریشان کن خبریں ہیں دوسری طرف معاشرے میں رواج پانے والی جدید فضول خرچیاں' عیش و عشرت' اُدھار کی لت' دوسروں کے منہ سے جبری نکال کر کھانے کی عادت' ایک

کام

دکان کا مالک اپنے نئے ملازم سے بولا ''تمہیں ہمارے منشی جی نے کام سمجھا دیا ہے نا.....؟''

نیا ملازم بولا ''جی ہاں.....! اُنہوں نے مجھے سمجھا دیا کہ جب میں آپ کو دکان کی طرف آتا دیکھوں تو ان کو فوراً جگا دُوں۔''

وجہ

افسر: ''تم نے کمپنی کے منیجر کا ہاتھ کیوں جلایا؟''

ملازم: ''صاحب نے خود کہا تھا..... پہلے میری مٹھی گرم کرو، تو میں نے جلتا ہوا کوئلہ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔''

تیاری

ایک لڑکی اپنی سہیلی سے: پاپا نے کہا ہے کہ اس بار فیل ہوئی تو تمہاری شادی کردُوں گا۔

سہیلی: تو تم نے کتنی تیاری کی ہے؟

لڑکی: بس ولیمے کا سُوٹ رہ گیا ہے۔

طبقہ سفید ڈبل روٹی' براؤن ڈبل روٹی' نان' روغنی نان' پیزا' برگر' شوارما' بروسٹ' نگٹس' تکہ کباب اور قیمتی بیکری آئٹم کے علاوہ کچھ پسند ہی نہیں کرتا۔ دوسرا طبقہ آٹے کی روٹی کھانے میں ہی خوش ہے۔ اللہ کا شکر گزار ہے کہ پیٹ بھر کر کھاتا ہے۔ تیسرا طبقہ اپنے بجٹ کے اندر گزر بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے سے اونچے لوگوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ زیادہ اچھا کھانے والوں کو اپنا ماہانہ بجٹ ترتیب دیتے ہوئے دیکھ کر یہ نہیں سوچتا کہ اسے کتنی روٹی درکار ہے۔ آمدن کو مدنظر رکھتے ہوئے آٹا خریدتا ہے اور اس آٹے کو پورا مہینہ سامنے رکھ کر استعمال کرتا ہے اور افراد خانہ روٹی پیٹ بھر کر کھانے کے بجائے جو حصہ میں آتی ہو وہ ہی کھاتے ہیں۔ ہم اسی تیسرے طبقے کو سفید پوش کہتے ہیں۔ کیا مجال کہ کسی کے سامنے اپنی ضروریات کی کمی کا رونا روئیں یا ہاتھ پھیلائیں یا اللہ سے شکوہ کریں۔ چوتھا طبقہ بھیک مانگنے والوں کا ہے جنہیں آج تک نہ کوئی سمجھا سکا نہ ہی انہوں نے خود سمجھنے کی کوشش کی کہ اللہ تعالیٰ کو بھیک مانگنا پسند نہیں۔

یہ طبقاتی نظام جو تیزی سے ہمارے ملک میں رواج پا رہا ہے یہ ہمارا خود ساختہ ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قطع کا لفظ اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے' خالق کائنات نے مسلمانوں کو آپس میں مل جل کر رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ حدیث مبارکہ ہے کہ کل مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں خونی رشتوں کو توڑنے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آقا و غلام کا ایک ہی دستر خوان پر ایک جیسا کھانا تناول کرنا پسند کیا ہے۔ مگر اب ایسا نہیں ہے غلاموں کا دور بھی ختم ہوگیا ہے ان کی جگہ روزانہ یا ماہانہ اُجرت والے ملازمین نے لے لی ہے۔ ہمارے خوشحال خاندان نہ صرف ملازمین کے ساتھ رہن سہن اور کھانے پینے کے معاملے میں امتیازی سلوک کررہے ہیں بلکہ اپنے جنم دینے والوں یعنی ماں باپ اور ساتھ جنم لینے والوں یعنی کہ سگے بہن بھائیوں کے ساتھ بھی ایسا سلوک ہی روا رکھے ہوئے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بے جوڑ رشتے صرف نو بیاہتا جوڑوں کو ہی کہا جاتا ہے۔ وہ رشتے جو شادی دفاتر کی مدد سے غیر خاندان اور بالکل اجنبی لوگوں کے ساتھ جوڑے جائیں۔ قارئین کرام آپ یقیناً میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ ہر وہ رشتہ بے جوڑ ہوتا ہے جو معاشرے کے ساتھ مل کے نہ چلے۔ دوسروں کے حقوق کی پاسداری نہ کرے۔ ان بے جوڑ رشتوں میں ماں باپ' بہن بھائی' بیٹے بیٹیاں میاں بیوی' ددھیال' ننھیال' ہم سفر' ہم پیشہ' افسران' ماتحت' پڑوسی' معالج' دکاندار سب ہی ہوسکتے ہیں۔ اور جس کو آپ نے اپنا قیمتی ووٹ دے کر اپنے اوپر مسلط کیا اور وہ ملازم' ملازمہ یا لے پالک بچے جنہیں آپ نے اپنوں سے بھی زیادہ عزیز رکھا اندھا اعتماد کیا بالآخر انہوں نے سانپ بن کر ڈس لیا۔ اس تحریر کا مقصد قطعاً کسی کی دل آزاری نہیں ہے نہ ہی کسی کو تنقید کا نشانہ بنانا ہے بس عمومی آراء ہیں۔ اسے پڑھ کر کوئی ہرگز اپنے ساتھ منسوب نہ کرے۔

رشتوں کے تقدس کی پامالی جو آج ہورہی ہے ماضی میں کبھی سننے میں نہ آئی تھی۔ نہ ہی خاندان کے بزرگوں اور قریبی عزیز و اقارب کو کبھی کسی نے اس طرح سے نظرانداز کیا تھا۔ جدید دور کے جدید

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور فخریہ کاوش

لازوال اسلامی واقعات نمبر

شائع ہوگیا ہے

★ رسولِ خدا، خلفاء راشدینؓ صحابہ کرامؓ اور صالحینؒ کی قابلِ تقلید زندگیوں سے لیے گئے سنہری واقعات

★ دورِ نبوت، خلافتِ راشدہ اور تاریخ میں موجود عدل و انصاف کی عظیم روایات

★ مسلم خواتین کی ذہانت متانت اور شجاعت کے حیرت انگیز قصے

★ دورِ جدید میں نئی نسل کے جذبہ ایمانی کو از سرِ نو تازہ کر دینے والے روح پرور واقعات

★ ہر مسلم گھرانے کی لائبریری کی زینت، نوجوانوں کے لئے مشعل راہ۔

دعاؤں کے ساتھ

سیارہ ڈائجسٹ 240 ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 042-7245412

نظریات نے خاندان کو منتشر کردیا ہے' آپس میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ پیار محبت کے رشتوں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں' نفاق پیدا ہوگیا ہے۔ اتنی نفرتیں بڑھیں کہ رشتہ داریاں قائم کرنا تو کجا ایک دوسرے کو دیکھنا پسند نہیں ہے۔ ماں باپ نے قریبی رشتہ داروں کیخلاف اپنی اولاد کو من گھڑت جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر متنفر کردیا ہے۔ اولاد کے جوان ہونے پر والدین کو اگر اپنی ماضی کی غلطیوں کا احساس ہو بھی جائے اور وہ اپنی برادری میں بچے بچیوں کی شادی کرنا چاہیں تو اولاد کے اندر انہی کی طرف سے پیدا کی گئی نفرت ناکامی کا باعث بنتی ہے۔ ایسے میں اولاد کے گھر بسانے کے لئے غیر برادریوں کی طرف رُخ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں اکثر والدین رشتہ کرانے والی موسیوں اور شادی دفاتر سے رابطہ کرتے ہیں اور یہ دونوں بھاری فیس کے عوض خاندانی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو ایسے نوسر بازوں کے ساتھ جوڑتے ہیں جن کا کوئی جوڑ ہو ہی نہیں سکتا۔ مجبوراً باقی زندگی سسک سسک کر گزار دیتے ہیں یا طلاق ہوجاتی ہے یا خلع لیا جاتا ہے۔ تیزاب پھینکنے اور قتل جیسے واقعات بھی دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ کچھ وحشی لوگ اپنی اولاد تک کو قتل کردیتے ہیں۔ میڈیا پر دکھائے جانے والے غیر ثقافتی ڈراموں نے بھی ہمارے نوجوان بچے بچیوں کو مرضی اور محبت کی شادی کرنے کی ترغیب دی ہے جس کے نتیجہ میں نوجوان نسل غلط ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ عموماً یہ شادیاں پائیدار نہیں ہوتیں اور معاملہ طلاق و علیحدگی پر چلا جاتا ہے۔ والدین اور خاندان والے لڑکے لڑکی کی جان کے دشمن بن جاتے ہیں اور موقع ملتے ہی دونوں کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ کچھ لڑکیاں سکول کالج' یونیورسٹی مارکیٹ اور یہاں تک کہ گھر کی چار دیوار کے اندر سے بھی اغوا کرلی جاتی ہیں اور اس معاملے میں بالکل بے قصور ہوتی ہیں مگر ان کے اہل خانہ نہ تو ان کو تلاش کرتے ہیں نہ ہی ان کا سراغ لگنے پر ان کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ یہ لڑکیاں ساری عمر مجبوراً ان بے جوڑ رشتوں کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ وٹے سٹے کی شادیوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

سیلاب' طوفان' زلزلہ' ہجرت' بازاروں اور مزاروں' میلوں اور تفریحی مقامات پر بچھڑنے والی بچیاں بھی بے جوڑ رشتوں میں زندگی گزارتی ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں ہر مصیبت ہر دشمنی اور قتل و زنا کے موقع پر جب فیصلہ مقامی پنچایت کے سپرد کیا جاتا ہے تو صلح میں بیٹی کے بے جوڑ رشتے کی قربانی ہی دینا پڑتی ہے۔ جائیداد کے برادری سے باہر چلے جانے کا خوف والدین کے اولاد کے لئے غلط فیصلوں کا باعث بنتا ہے۔ کبھی بیٹی کو ساری عمر کے لئے کنوارا ہی رہنے دیا جاتا ہے' کبھی قرآن پاک سے اس کی شادی کردی جاتی ہے اور کبھی ایک ہی دادا کی اولاد کے ساتھ بے جوڑ بیاہ دی جاتی ہے۔ ایک ایسا واقعہ بھی دوران سروس دیکھنے میں آیا کہ ضعیف العمر کنواری خاتون کو سخت نگرانی میں رکھا گیا تھا کہ کہیں پڑوس میں رہنے والی اس کے دوسرے بھائیوں کی اولادیں جائیداد کے کاغذات پر دستخط نہ کروالیں۔ افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس خاتون کے کمرے میں صحن کی طرف کھلنے والے دروازے میں اینٹوں کی چنائی کرکے اسے بند کردیا گیا تھا۔ اور بھائی بھاوج کے کمرے سے داخلے کا راستہ بنایا گیا تھا۔

غیر قانونی پابندیوں' بے جوڑ رشتوں پر اعتراض کرنے والی خواتین کڑی سزا کی مستحق قرار پاتی ہیں۔ اور اپنے بہت ہی پیارے رشتہ داروں یعنی باپ اور بھائی کے ہاتھوں قتل ہوجاتی ہیں۔ گو پاکستان میں اس وقت حقوق انسانی اور حقوقِ نسواں پر کئی تنظیمیں فعال ہیں مگر آج تک چار دیواری کے اندر ہونے والے مظالم پر کوئی آواز نہیں اُٹھا سکا۔ کچھ شادی شدہ جوڑے سب اچھا ہونے کے باوجود نام نہاد پیروں' جوتشی' نجومی فال نکالنے والے اور ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتانے والوں سے جھوٹی اور غلط باتیں سن کر اپنے ساتھی سے نالاں رہنے لگ جاتے ہیں یا علیحدگی اختیار کرلیتے ہیں۔ اس وقت جبکہ پوری دنیا بدل گئی ہے۔ حضرت انسان حیرانگی کی حد تک ترقی کرچکا ہے اور مزید ترقی کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔ ہمارا مستقبل کیسا ہوگا؟ کوئی نہیں جانتا۔ ہماری رہائش گاہیں' ہمارے سامان' ہماری سواریاں' ہماری ملازمتیں' ہمارے لباس' انداز گفتگو' ہمارے دوست احباب' سکول' کالج' یونیورسٹیاں' ہسپتال' سڑکیں' ہوٹل' کھانے پینے کے انداز کتنے بدل گئے یہ سب؟ ماشاء اللہ خوب ترقی ہوئی ہے اپنے ملک پاکستان میں۔

لفظ پاکستان کا نام آتے ہی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ دل سے دعا نکلتی ہے کہ اے وطن تُو ہمیشہ سلامت رہے۔ بس نہیں بدلے تو یہ دھوکے باز جنہوں نے ہماری نوجوان نسل کو اپنے جال میں پھنسا کر ان کی زندگیوں کو جہنم بنا دیا ہے۔ ہم سب کو مل کر ان کا محاسبہ کرنا ہوگا۔ اپنے بچوں کو ایسے لوگوں سے بچنے کے لئے شعور و آگہی دینا ہوگی۔ قارئین کرام! آپ یقیناً اس بات سے بخوبی واقف ہونگے کہ ماضی بعید میں دو خاندانوں کے آپس میں ملاپ اور رشتہ جوڑتے وقت دونوں خاندانوں کی پہچان حسب نسب سے نہیں اسلامی ماحول' پابندیٔ صوم وصلوٰۃ' سیرت و کردار' لڑکے کی آمدنی حلال' لڑکی کے سلیقہ شعار وحیادار ہونے سے ہوتی تھی اور انہی صفات کو ترجیح دی جاتی تھی۔ مگر اب شادی دفاتر اور شادی ہالز نے ہماری اسلامی روایات اور خاندان کے بزرگوں کی طرف سے طے شدہ حکمت عملی کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اب لڑکیوں میں اچھی صفات دیکھی ہی نہیں جاتیں۔ اسی لیے تو وہ آمدن سے بڑھ کر خرچ کرنے والی یعنی کہ کرپشن اور بدعنوانی کو فروغ دینے والی ہیں' بے پردہ' فضول خرچ' سلیقہ سے عاری' موبائل میڈیا کی گرویدہ' پورے سسرالی خاندان میں صرف اور صرف شوہر کی شیدائی' مہمان نوازی سے اکتاہٹ محسوس کرنے والی' کثرت سے ہوٹلنگ اور آرڈر پر منگوائی جانے والی فاسٹ فوڈز کی دلدادہ ہیں' قدرت کے تشکیل کردہ نظام کائنات میں ردوبدل کرکے اس کو جدیدیت کا رنگ دینے والی ہیں۔ بے وقت سونا' بے وقت اٹھنا' بے وقت کھانا پینا عام معمول ہے۔ اوپر سے میڈیا میں دیئے گئے کچھ اشتہارات سے ہماری نوجوان خواتین کو جو ترغیبات دی جارہی ہیں ان سے اچھی بھلی سلیقہ شعار خواتین پر بھی غلط اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ ایک اشتہار مثال کے طور پر پیش خدمت ہے کہ اب کچن کو تالا لگاؤ فوڈ پینڈا اپنا۔

بے جوڑ رشتوں سے پریشان حال خاندانوں کی تکالیف اور مسائل کا اصل سبب دین سے دُوری ہے۔ صرف نام کے مسلمان ہونے سے ہمیں راحت نہیں مل سکتی۔ اسلام میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ ہمیں دین میں استقامت دے۔ آمین۔

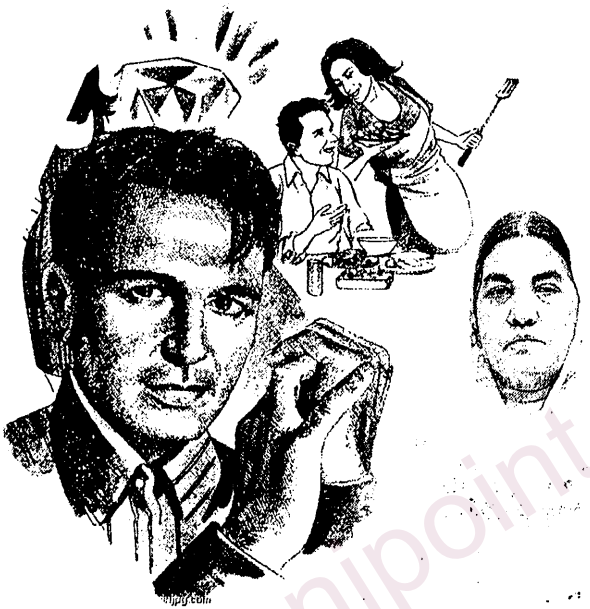

احساسِ زیاں

محمد شبیر خان

وہ بے اختیار کمرے میں داخل ہوا، ماں مصلے پر بیٹھی، پہلے آسمان پر جلوہ افروز اپنے رب سے راز و نیاز میں مصروف تھی، عمیر پاس ہی بیٹھ گیا اور ماں کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر ان کی گود میں اپنا سر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

ایک شخص کی کہانی جو راستے سے بھٹک گیا تھا

موبائل کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی، اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں اور صوفے کے نیچے موبائل ٹٹولنے لگا۔ نیم وا آنکھوں سے اس نے بٹن پریس کیا۔ ''ہیلو''

''یار کب سے آپ کو فون ملا رہا ہوں، موبائل نہیں اُٹھا رہے، لگتا ہے جناب ابھی تک نیند کے مزے لے رہے ہیں، اُٹھ جاؤ نواب صاحب! گیارہ بج چکے ہیں۔'' عاطف ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

''ہاں، بس ابھی اُٹھتا ہوں'' عمیر نے کہا اور کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سورج کی روشنی نے پورے کمرے کو روشن کر لیا تھا۔ ''اچھا میں نے اس

لیے فون کیا تھا کہ آج شام کو سہیل کے گھر برتھ ڈے پارٹی ہے، سب آرہے ہیں، تم سات بجے سے پہلے تیار ہو جانا، میں لینے آجاؤں گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے!" عمیر نے کہہ کر فون رکھ دیا۔

فریش ہو کر وہ واش روم سے نکلا تو ملازم ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہا تھا۔ قیمتی قالین پر جا بجا سگریٹ کے ٹکڑے، کولڈ ڈرنکس کی خالی بوتلیں اور کھانے کی چیزیں بکھری پڑی تھیں، جو اس بات کا ثبوت تھیں کہ رات دیر تک یہاں بھی محفل جمی رہی ہے۔ اس کے موبائل پر میسج ٹون سنائی دی' بال سنوارتے ہوئے اس نے دیکھا تو حاشر کی طرف سے ایک وٹس ایپ ویڈیو آئی تھی۔ اس نے اوپن کی۔ "انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جس کو سوچنے اور احساس کی نعمت ملی ہے۔" پھر نصیحت..... وہ زیر لب بڑبڑایا اور ویڈیو بند کر کے اونچی آواز میں میوزک لگا دیا۔

.....

عمیر ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ شہر میں اس کے والد کا گاڑیوں کا ایک بہت بڑا شوروم تھا، وہ عموماً سال میں تین چار بار کاروبار کے سلسلے میں جاپان' کوریا وغیرہ کا چکر لگا لیتے تھے مگر اس دفعہ ان کو گئے پانچ ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ دراصل وہ وہاں بھی اپنا کاروبار جمانا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے ان کو مکمل وقت دینا پڑ رہا تھا۔ چونکہ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی اس لیے عمیر کا زیادہ تر وقت دوستوں اور سیر سپاٹے میں گزرتا تھا۔ بڑی مشکل سے گریجویشن مکمل کر لینے کے بعد اس نے مزید پڑھنے سے ہاتھ اُٹھا لیے تھے۔ باپ کی عدم موجودگی میں وہ غلط لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے لگا۔ نتیجتاً وہ سگریٹ نوشی اور دیگر برائیوں کی طرف مائل ہونا شروع ہو گیا۔ ماں نے پہلے نرمی سے سمجھایا، پھر کچھ سختی دکھانی شروع کی تو عمیر نے تنگ آ کر اپنا کمرہ ہی چھوڑ دیا اور گھر کے ڈرائنگ روم میں رہنے لگا۔

.....

ہلا گلا اور ہر طرح اودھم مچانے کے بعد جب وہ

انگوٹھی کا نگینہ

حضرت سعدیؒ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی انگشتری میں ایسا نگینہ جڑا ہوا تھا جس کی صحیح قیمت کا اندازہ جوہری بھی نہ کر سکتے تھے وہ گویا دریائے نُور تھا جو رات کو دن میں بدل دیتا تھا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ ایک سال سخت قحط پڑ گیا۔ لوگ بھوکے مرنے لگے۔ حضرت کو ان حالات کا علم ہوا تو لوگوں کی امداد کے لئے اپنی انگشتری کا وہ قیمتی نگینہ فروخت کر دیا اور جو قیمت ملی اس سے اناج خرید کر تقسیم کروا دیا۔

جب اس بات کا علم آپ ہی کے بہی خواہوں کو ہوا تو ان میں سے ایک نے آپ سے کہا، یہ آپ نے کیا کیا؟؟ ایسا بیش بہا نگینہ بیچ ڈالا!؟؟

حضرت نے یہ بات سُن کر فرمایا کہ وہ نگینہ مجھے بھی پسند تھا، لیکن میں یہ بات گوارا نہ کر سکتا تھا کہ کو لوگ بھوک سے تڑپ رہے ہوں اور میں قیمتی انگوٹھی پہنے بیٹھا رہوں۔

کسی بھی حکمران کے لئے یہ بات زیبا نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو تکلیف میں مبتلا دیکھے اور اپنے آرام اور زیب و زینت کے سامان کو عزیز رکھے۔ یہ فرماتے ہوئے آپ کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

(مرسلہ: نورین خالد۔ سرگودھا)

سب تھک گئے تو واپسی کے لیے نکلنے لگے۔عاطف کی کار میں بیٹھ کر اچانک اس کو صبح حاشر والی ویڈیو یاد آئی ،اس میں کوئی شخص ''احساس'' کی بات کر رہا تھا۔''انسان ،احساس.....مگر کس چیز کا احساس؟'' وہ خود سے بولنے لگا۔''زندگی کا احساس تو مجھے ہے اسی لیے تو ہنسی خوشی گزار رہا ہوں ۔خود بھی خوش رہتا ہوں ،دوسروں کو بھی مزے کراتا ہوں ۔مگر یہ شخص کس احساس کی بات کر رہا تھا؟'' تذبذب سے مجبور ہو کر اس نے دوبارہ ویڈیو اوپن کی۔

''آپ کا اصل استاد وہ ہے جو آپ کو سوچنے پر مجبور کر دے.....وقت انسان کا سب سے بڑا استاد ہے جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ انسان کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ یہ زندگی برف کی سِل کی مانند ہے جو لمحہ بہ لمحہ پگھل رہی ہے.....اگر صرف دنیا میں آنا' وقت گزارنا اور کھانا پینا ہی زندگی ہے تو یہ سب کچھ تو جانور بھی کر رہے ہیں' پھر انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا کیا فائدہ؟''

الفاظ تھے کہ نشتر ،جو مسلسل اس کی روح پر لگ رہے تھے۔عمیر بولنے والے شخص کی گفتگو میں مکمل طور پر کھو گیا تھا۔کب عاطف نے گاڑی روکی ،کب وہ نیچے اُترا اور کیسے وہ ڈرائنگ روم تک پہنچا ،اس کو بالکل پتہ نہیں چلا ،وہ بس موبائل پر نظریں جمائے قاسم علی شاہ کے الفاظ سُن رہا تھا جو مسلسل اس کے دِل پر دستک دے رہے تھے۔ وہ صوفے پر لیٹا ،ویڈیو ختم ہوگئی ،یوٹیوب پر جا کر مزید ویڈیوز نکالیں اور ایک کے بعد ایک سننے لگا۔

''قرآن میں اللہ بار بار کہتا ہے ،اور تم غور نہیں کرتے؟ غور' غور.....غور کا مطلب یہ ہے کہ میں یہاں پر کیوں ہوں اور میں نے جانا کہاں ہے؟ جہاں جانا ہے کیا اس کے لیے میرے پاس تیاری مکمل ہے؟ اللہ مزید کہتا ہے: زمانے کی قسم! بے شک انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے۔''

.....

خیالات کی دنیا سے نکل کر اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی ،رات کے تین بج چکے تھے۔نہ معلوم کتنے آنسو تھے جو اشکِ ندامت بن کر اس کی آنکھوں سے نکلے اور اس کے چہرے سے ہوتے ہوئے گریبان میں جذب ہوئے۔وہ اپنی زندگی کے ان قیمتی لمحات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس نے غلط اور بے مقصد کاموں میں ضائع کر دیے تھے وہ حیران تھا کہ عقل و فہم ہونے کے باوجود بھی اتنی واضح بات اسے سمجھ نہ آئی۔اچانک اس کو اپنی ماں کا شفیق چہرہ یاد آیا۔کتنی بار اس نے بدتمیزی سے ان کا دِل دکھایا تھا۔ایک ہی گھر میں ہوتے ہوئے بھی اپنی ضد اور جھوٹی انا کی وجہ سے چھ دن سے ان کا چہرہ نہ دیکھ پایا تھا۔وہ اُٹھا اور تیزی سے ماں کے کمرے کی طرف گیا۔ان کے قدموں میں سر رکھ کر وہ دِلی بے چینی دُور کرنا چاہتا تھا ،دروازہ کھلا تھا ،رب اپنے بندوں کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھتا ہے۔ماں نے بھی بیٹے کے لوٹنے کی آس پر دروازہ کھلا چھوڑا تھا۔وہ بے اختیار کمرے میں داخل ہوا ،ماں مصلے پر بیٹھی ،پہلے آسمان پر جلوہ افروز اپنے رَب سے راز و نیاز میں مصروف تھی ،عمیر پاس ہی بیٹھ گیا اور ماں کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر ان کی گود میں اپنا سر رکھ دیا۔اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ پچھتاوے کے آنسو.....تشکر کے آنسو.....البتہ ان میں عزم ایک ہی تھا ''رب کی رَضا اور بامقصد زندگی.....''

اگلی صبح اس کی زندگی کا ایک نیا سورج طلوع ہونے والا تھا۔

.....❁.....❁.....

سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور عظیم پیشکش

ازواجِ مطہراتؓ

شائع ہو گیا ہے

- کائنات کی مقدس، مطہر اور پاک ہستیاں۔
- پیغمبرِ آخر الزماں کے حرم رُشد و ہدایت کی روشنیاں۔
- اسلام کے نام لیواؤں کی مائیں۔
- وہ جنہوں نے اللہ کے رسولؐ کو اُس آنکھ سے دیکھا جس آنکھ سے دیکھنا کسی اور کے نصیب میں نہ تھا۔
- جنہوں نے نبی کریمؐ کے خلوت و جلوت کے نوری نظارے دیکھے

وہ حقائق و روایات جو آج تک کسی ایک جگہ اکٹھے نہ کیے جا سکے

قیمت: 250 روپے

یارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 245412

Pakistanipoint.com

بزمِ شاعری

نعت رسول ﷺ

میری آنکھوں سے جو دیکھے کوئی روضہ تیرا
جاگتی آنکھوں سے دیکھے گا وہ جلوہ تیرا
حوضِ کوثر سے پلائینگے یقیناً آقاؐ
اُمتی جانتا ہے ہر ایک یہ پیاسا تیرا
بعد مرنے کے وہ کیا دیکھے گا جنت کو
جیتے جی دیکھا نہیں جس نے بھی روضہ تیرا
دھوپ محشر کی :جلا ڈالے گی لوگو
جھوم اُٹھے گا جسے مل گیا سایہ تیرا
تیری خاطر ہی سجائی گئی ہے دنیا
چاند سورج بھی ترا کعبہ و بطحا تیرا
شوق کو تجھ سے ہے اُلفت تری آل سے بھی
ساتھ لے جائے گا جنت میں نواسہ تیرا
(شوق خانواہنی۔خانواہن)

غزل

کوئی راستہ ہے نہ رہگزر
کوئی ہم سفر ہے نہ راہبر
یہ سفر تمام ہوا، مگر
ابھی چل رہا ہوں، بھٹک رہا ہوں
کہ جانے کونسے موڑ پر
مری ابتدا کہیں کھو گئی!
مری ابتدا جہاں کوئی اور بھی ساتھ تھا
مجھے یاد ہے، مرے ہاتھ میں کوئی ہاتھ تھا!!
(ایس امتیاز احمد۔کراچی)

غزل

پھولوں کے رخسار پہ شبنم کا بسیرا
پیڑوں کے ہاتھ میں کرنوں کا چہرا
میں سویا تھا کچھ کچھ جاگا سا
ایک پلک میں تھا سویرا ایک میں اندھیرا
سجی تھیں راہیں کرنوں کے نور سے
آسماں کا رنگ تھا، سنہرا سنہرا
صدا آئی ایک مڑ کے دیکھ
پیچھے تھا غبار، روپہلا روپہلا
نظر آتی تھی زمین چمکتا موتی
آسمان جیسے آنگن ستاروں بھرا
(جاوید اقبال)

نظم

اک دن ماما نے مابدولت سے کہا
چندا ذرا مجھ کو گوندھ دو آٹا
یہ سُن کر ہم چکرانے لگے
تارے سامنے آنکھوں کے ناچنے لگے
خیر خود کو دے کر ذرا سنبھالا
آٹا لیکے پرات میں بہت سا پانی دیا ملا
آٹا ہم سے بہت ہی پتلا ہو گیا

Pakistanipoint.com

فقط آٹے کا آٹا پانی کا پانی ہو گیا
مامانے آٹے کا ہوتے جب حشر نشر دیکھا
زور سے دھموکہ لگایا اور فرمایا
نہ کبھی تجھ کو کھانا پکانا آئے گا
نہ ہی تجھے سینا پرونا آئے گا
چپاتی بناتی ہے یا نقشے بناتی ہے
ملک ملک کی ہم کو سیر کراتی ہے
یاد رکھو سسرال میں تیری اک بات نہ چلے گی
ساس اُلٹا مجھ کو بدنام کرے گی
کہ کیسی تربیت دی ہے صاحبزادی کو
مستطیل ہی بنا دیا ہے مربع کو
واہ رے اللہ تیری ہی ہے دہائی
عقل کی کوئی بات اس کے بھیجے میں نہ سمائی
یہ سُن کر ہم نے دل میں اک آہ بھری
اگلے دن سنبھال لی امور خانہ داری
رفتہ رفتہ بن کے ماہر ٹک بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے
دیکھو علی وردہ آج کیا ڈش بنا رہی ہے

(وردہ سماوی۔لاہور)

غزل

خواب مرتے نہیں
خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں، نہ آنکھیں نہ سانسیں
کہ جو ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے
خواب مرتے نہیں
خواب مرتے نہیں
خواب تو روشنی ہیں، نوا ہیں، ہوا ہیں
جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں
ظلم کے دوزخوں سے بھی دبتے نہیں
روشنی اور نوا اور ہوا کے الگ
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں
خواب تو حرف ہیں، خواب تو نور ہیں
خواب سقراط ہیں، خواب منصور ہیں
خواب مرتے نہیں
خواب مرتے نہیں

(احمد فراز۔انتخاب: شیریں سید)

غزل

آنکھوں سے پرے نیند کی رفتار میں رہنا
ہر پل کسی نادید کے دیدار میں رہنا
کھو جانا اسے دیکھ کے عریاں کے سفر میں
چھوتے ہی اسے حجلہ اسرار میں رہنا
اک خواب دریدہ کورگ حرف سے سینا
پھر لے کے اسے کوچہ و بازار میں رہنا
خود اپنے کو ہی دیکھ کے حیران سا ہونا
نرگس کی طرح موسم بیمار میں رہنا
مرنا یونہی ابریشم و کمخواب ہوس میں
دم توڑ کے زندہ کبھی دیوار میں رہنا
بادل کبھی پروا کبھی پھولوں سے لپٹنا
ہر لمحہ ترے آنے کے آثار میں رہنا
حسرت سی لئے خلقت معصوم میں پھرنا
سازش کی طرح گردش دربار میں رہنا
سرمد تپش نارسخن میں ہوں کہ مجھ کو
گل کرتا رہا شعلہ و انگار میں رہنا

(سرمد صہبائی۔انتخاب: شاہد شاہ)

غزل

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے
گرمی محفل فقط اک نعرہ مستانہ ہے

اور وہ خوش ہیں کہ اس محفل سے دیوانے گئے
میں اسے شہرت کہوں یا اپنی رسوائی کہوں
مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے
یوں تو وہ میری رگ جاں سے بھی تھے نزدیک تر
آنسوؤں کی دھند میں لیکن نہ پہچانے گئے
وحشتیں کچھ اس طرح اپنا مقدر ہوگئیں
ہم جہاں پہنچے ہمارے ساتھ ویرانے گئے
کیا قیامت ہے کہ خاطر کشتہ شب بھی تھے ہم
صبح بھی آئی تو مجرم ہم ہی گردانے گئے
(خاطر غزنوی)

غزل

ہر بے زباں کو شعلہ نوا کہہ لیا کرو
یارو سکوت ہی کو صدا کہہ لیا کرو
خود کو فریب دو کہ نہ ہو تلخ زندگی
ہر سنگ دل کو جانِ وفا کہہ لیا کرو
گر چاہتے ہو خوش رہیں کچھ بندگان خاص
جتنے صنم ہیں ان کو خدا کہہ لیا کرو
یارو یہ دور ضعف بصارت کا دور ہے،
آندھی اٹھے تو اس کو گھٹا کہہ لیا کرو
انسان کا اگر قدوقامت نہ بڑھ سکے
تم اس کو نقص آب و ہوا کہہ لیا کرو
اپنے لئے اب ایک ہی راہ نجات ہے
ہر ظلم کو رضائے خدا کہہ لیا کرو
دکھلائے جا سکیں جو نہ کانٹے زبان کے
تم داستان کرب و بلا کہہ لیا کرو
لے دے کے اب یہی ہے نشان ضیا قتیل
جب دل جلے تو اس کو دیا کہہ لیا کرو
(قتیل شفائی۔ انتخاب: نائلہ انیس)

غزل

تیری آنکھوں سے ملی جنبش مری تحریر کو
کردیا میں نے مکمل خواب کی تعبیر کو
جب محبت کی کہانی لب پہ آتی ہے کبھی
وہ برا کہتے ہیں مجھ کو اور میں تقدیر کو
اُف رے یہ شور سلاسل نیند سب کی اُڑ گئی
دو رہائی آ کے تم پابستہ زنجیر کو
یہ عرق آلودہ پیشانی یہ رنج و اضطراب
دیکھ جا آ کر شکست عشق کی تصویر کو
زندگی یوں ان کے قدموں پر نچھاور میں نے کی
جیسے پروانہ جلا دے نور پر تقدیر کو
اے مرے معصوم قاتل اتنی مہلت دے مجھے
چوم لوں آنکھوں سے اپنی برہنہ شمشیر کو
جس نے چاہت کے تجسس میں گنوادی زندگی
وہ کہاں توڑے گا تشنہ ظلم کی زنجیر کو
(یوگندر بہل تشنہ۔ انتخاب: حیدر علی)

غزل

برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

اجمل
آپ کے دکھ درد کا ساتھی
شربتِ صدر اجملی
جب چلیں سرد ہوائیں
کھانسی، نزلہ، زکام ستائیں
تو لے آئیں۔۔۔اجمل کا شربت صدر
100%
ابریشم، ملٹھی اور عناب کا حسین امتزاج
UNANI MEDICINE 120ml
AJMALI
SHARBAT-e-
SADAR
For Cough & Cold
www.ajmal.pk
شربت صدر
www.ajmal.pk
دواخانہ حکیم اجمل خان (پرائیویٹ) لمیٹڈ
فون: 042-35113378, 0307-3333238
ای میل: info@ajmal.pk
ویب: www.ajmal.pk

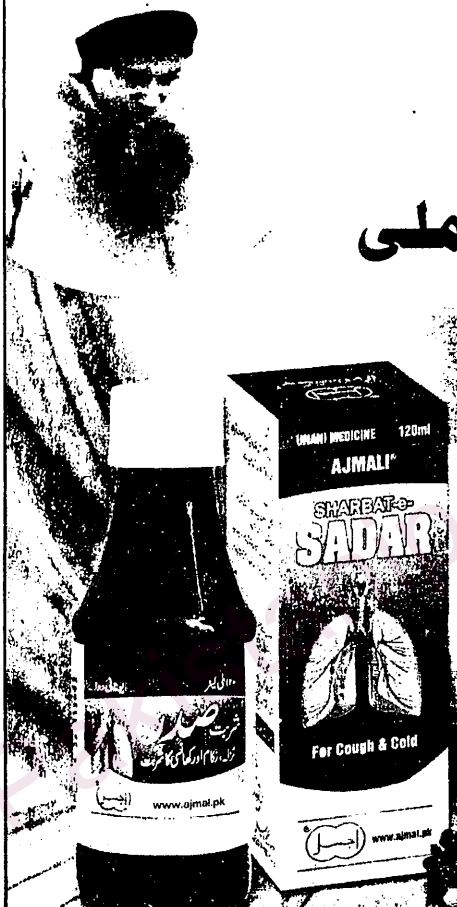

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
(علامہ اقبالؒ۔ انتخاب: سلیم ناز)

غزل

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
تھے بہت بے درد لمحے ختم درد عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے
بعد دل تو چاہا پر شکست دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کئے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد
(فیض احمد فیض۔ انتخاب: سنبل علیم)

غزل

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے
وہ اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک
شریک گریہ شبنم نہ ہوں گے
دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے
زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم
یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے
ہمارے دل میں سیل گریہ ہو گا
اگر بادیدۂ پُرنم نہ ہوں گے
اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدقے کم نہ ہوں گے
حفیظ ان سے میں جتنا بدگماں ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے
(حفیظ ہوشیارپوری۔ انتخاب: ندیم شاہد)

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم، پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پُر کر کے سیارہ ڈائجسٹ: 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی تصویر منسلک کریں

نام:........................ تعلیمی قابلیت:........................
عمر:........................ پسندیدہ شاعر:........................
پسندیدہ غزل/نظم........................
مشاغل:........................ تاریخ پیدائش/برج:........................
شادی شدہ/غیر شادی شدہ........................ پتہ:........................
ای میل:........................

نوٹ: اپنی پسند ناپسند، شاعری کی ابتدا، مزاج، اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کر کے بھیجئے۔

pakistanipoint.com

لیاری کی لڑکیاں اور سائیکل کی سواری

لیاری کراچی میں لڑکیوں کے ایک گروپ نے سائیکل چلانے کا ایک کلب قائم کیا ہے اور وہ اتوار کے روز مل کر ایک پارکنگ لاٹ میں سائیکل چلاتی ہیں۔ اتوار کا دن اس لیے چنا گیا ہے کیونکہ چھٹی ہونے کے باعث پارکنگ لاٹ خالی ہوتی ہے اور وہ وہاں سائیکل چلانے کی پریکٹس کرکے اپنے شوق کی تکمیل کرسکتی ہیں۔

ایک غیر سرکاری تنظیم، 'لیاری گرلز کیفے' نے جرمنی کے تعاون سے لڑکیوں کو بائیسکل چلانے کی تربیت کا اہتمام کیا۔ ابتدا میں لیاری والوں نے لڑکیوں اور خواتین کے سائیکل چلانے پر سخت نکتہ چینی کی لیکن، انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور ہر طرح کی مداخلت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ زلیخا داؤد لڑکیوں کو سائیکل چلانا سکھاتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ بعض دفعہ لوگوں کی تنقید اتنی شدید اور تلخ ہوتی تھی کہ دل پر چوٹ لگتی تھی۔ لیکن، ہم نے ان کی پروا نہیں کی اور اپنی مہم جاری رکھی۔ اگرچہ سائیکل چلانا ایک عام سی بات ہے۔ لیکن، لیاری کی لڑکیوں کے لیے یہ ایک بہت بڑی سرگرمی ہے۔ سائیکل چلانا سیکھنے والی ایک خاتون حبیبہ کہتی ہیں کہ میرا تعلق ایک ایسے علاقے سے ہے جہاں عورتوں کو دبا کر رکھا جاتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹیوں کو بھی انہی حالات کا سامنا کرنا پڑے جس سے مجھے اپنے بچپن اور لڑکپن میں گزرنا پڑا۔ میں سائیکل چلانا سیکھ رہی ہوں اور میں اپنی بیٹیوں کو بھی یہ سکھاؤں گی۔

سائیکل چلانے والے اس گروپ میں کسی کے پاس بھی اپنا ذاتی سائیکل نہیں ہے۔ البتہ، تنظیم کے 30 سائیکلوں کا بندوبست کیا ہے جسے لیاری کی لڑکیاں باری باری چلاتی ہیں۔ یہ سائیکلیں انہیں مقامی انتظامیہ اور کراچی میں قائم جرمنی کے قونصل خانے نے عطیے کے طور پر دی ہیں۔ لڑکیاں چاہتی ہیں کہ انہیں سکول اور کام کاج کے لیے سائیکل پر آنے جانے کی اجازت مل جائے۔ انہیں توقع ہے کہ سائیکل سے شروع ہونے والا یہ سفر مستقبل کے راستوں پر کامیابی سے لے جائے گا۔

پاکستان میں بچوں کو ماں کا دودھ نہ پلانے کا بڑھتا رجحان

پاکستان میں صرف 48 فیصد مائیں بچوں کو اپنا دودھ پلاتی ہیں، شہر ہوں یا دیہات یہ شرح تقریباً یکساں ہیں۔ صوبہ

سندھ میں سب سے زیادہ جبکہ پنجاب میں سب سے کم شرح میں مائیں بچوں کو اپنا دودھ پلاتی ہیں۔ یہ بات پاکستان کے قومی نیوٹریشن سروے میں سامنے آئی ہے۔ حکومتِ پاکستان کی جانب سے صحت کے عالمی ادارے کی معاونت سے آغا خان یونیورسٹی نے یہ سروے کیا ہے۔ سروے کے نتائج کے مطابق 15 فیصد زبردستی، 17 فیصد جزوی طور پر جبکہ 20 فیصد مائیں اپنا دودھ سرے سے پلاتی ہی نہیں۔ سروے میں بتایا گیا ہے کہ 45 فیصد خواتین بچے کی پیدائش کے ایک گھنٹے کے اندر جبکہ 25 فیصد مائیں 24 گھنٹے میں اپنا دودھ پلاتی ہیں۔ یہ رجحان صرف شہری علاقوں میں ہی نہیں بلکہ دیہی علاقوں میں بھی دیکھا گیا ہے۔ اس حوالے سے کمیونٹی کو شعور دینے کی ضرورت ہے۔ اس قومی سروے میں ماں کا دودھ پلانے کی مناسب عمر میں بچوں کو ٹھوس، نیم ٹھوس اور نرم غذا فراہم کرنے کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ دیہات میں ضروری نہیں کہ مائیں بچے کو ڈبے کا دودھ دیتی ہوں لیکن وہ بھینس کا دودھ دے رہی ہیں۔ چائے اور پانی بھی دیا جا رہا ہے۔ 6 ماہ سے قبل ہی خوراک شروع کر رہے ہیں جس کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے چھ ماہ ماں کا دودھ دینے سے بچہ ہزاروں بیماریوں سے بچ جاتا ہے اس کی نشوونما ٹھیک ہوتی ہے آگے جا کر ماں کو بھی فائدہ ہے بچے کو بھی۔ لیکن اس بارے میں لوگوں کو شعور دینے کی اشد ضرورت ہے۔

فگر سکیٹنگ کی ننھی چیمپئن

چند روز پہلے پاکستان کے شمالی علاقے ہنزہ میں نہایت مہارت سے برف پر فگر آئس سکیٹنگ کا مظاہرہ کرتی جس ننھی لڑکی کی ویڈیو وائرل ہوئی وہ ملاک فیصل ہیں۔ ملاک فیصل نے دو ماہ پہلے آسٹریا میں فگر سکیٹنگ کے بین الاقوامی مقابلے میں 23 کھلاڑیوں کو شکست دے کر پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔

ان کے والد کا تعلق پاکستان سے جبکہ والدہ کا لیبیا سے ہے مگر یہ خاندان کام کے سلسلے میں دبئی میں مقیم ہے۔ ملاک جنھیں ونٹر سپورٹ ایسوسی ایشن آف گلگت بلتستان اور ایڈونچر ٹورازم گروپ آف پی ٹی ڈی سی نے پاکستان میں آنے کی دعوت دی، کہتی ہیں کہ میں تیسری مرتبہ پاکستان آئی ہوں۔ پہلی بار پاکستان آنے سے پہلے میں نے گوگل پر پاکستان کا نام لکھا اور شمالی علاقوں کی برف سے ڈھکی تصاویر دیکھیں تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ پاکستان ہے۔ ملاک کا دعویٰ ہے کہ وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے پاکستان میں فگر آئس سکیٹنگ کو متعارف کروایا ہے۔ 12 سالہ ملاک نے اپنی زندگی کے آٹھ سال فگر سکیٹنگ کرتے گزارے ہیں۔ بھلے دن کا آغاز ہو یا اختتام، سکیٹنگ ساتھ ساتھ چلتی ہے لیکن یہ نہیں کہ وہ پڑھائی میں کسی سے پیچھے ہیں۔ ہر سبجیکٹ میں اے لے کر وہ اپنی کلاس کے ذہین بچوں میں سے ایک ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ والد والدہ دونوں سکیٹنگ کرتے تھے میں نے بھی کی مجھے یہ کرنا بہت اچھا لگا۔ شروع میں یہ بطور مشغلہ تھا پھر میں نے اسے ذرا پروفیشنل انداز میں لیا اور پانچ سال کی عمر میں، میں نے پہلا گولڈ میڈل ابوظہبی میں ایک مقابلے میں جیتا۔ میرے والدین اس کے لیے مجھے ہر سہولت دیتے ہیں اور میری مدد کرتے ہیں۔

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران

خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کرکے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کرسکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کرسکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کرسکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنہیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!

email:sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

چکن نوڈلز

یخنی بنانے کے اجزا: چکن ہڈیوں کے ساتھ آدھا کلو' لونگ 3 عدد' ثابت کالی مرچ 5-6' نمک حسب ذائقہ' ادرک 1 چھوٹا پیس'

نوڈلز بنانے کے اجزاء: نوڈلز 2 پیکٹ' کالی مرچ آدھا چائے کا چمچ' سفید مرچ آدھا چائے کا چمچ' سویا سوس آدھا چائے کا چمچ' چلی سوس 2 چائے کے چمچ' سرکہ آدھا چائے کا چمچ' نمک حسب ذائقہ' باریک کٹا ہوا چکن آدھا کپ' لہسن 1 چائے کا چمچ' گاجریں 1 چوتھائی کپ' سبز شملا مرچ 1 چوتھائی کپ' پیلی شملا مرچ 1 چوتھائی کپ' چکن یخنی 1 کپ

ترکیب: ایک پین میں پانی، چکن، کالی مرچ، ادرک اور لہسن ڈالکر پندرہ بیس منٹ پکائیں، یخنی تیار ہے۔ اب یخنی کو نکال کر سائیڈ پر رکھ دیں اور چکن باریک باریک کاٹ لیں۔ پھر ایک پین میں پانی گرم کر کے نوڈلز ابال لیں جب تک اسی فیصد پک جائیں۔ اب ایک پین میں کھانے کا تیل گرم کر کے ایک منٹ بھون لیں۔ پھر سویا سوس، چلی سوس، سرکہ، کالی مرچ، سفید مرچ، نمک، چکن، گاجریں، شملا مرچ، یخنی اور ستر فیصد پکے ہوئے نوڈلز ڈال کر پانچ سے چھ منٹ دم پر رکھ دیں۔ مزیدار چکن نوڈلز تیار ہیں۔

ویفل سلائیڈرز ود فش نگٹس

سلائیڈر بنانے کے اجزاء: نگٹس 250 گرام، گارلک مایو چوتھائی کپ، کیچپ چوتھائی کپ، چیز سلائس 6 عدد، ٹماٹر سلائس حسب ضرورت، سلاد پتہ حسب ضرورت، ویفل بنانے کے اجزاء: میدہ 1 کپ، چینی آدھا کھانے کا چمچ، بیکنگ پاؤڈر آدھا کھانے کا چمچ، نمک 1 چوتھائی چائے کا چمچ، دودھ 1 چوتھائی کپ، انڈہ 1 عدد، ونیلا ایسنز 1 چوتھائی چائے کا چمچ، پگھلا ہوا مکھن 1 چوتھائی کپ۔

گارلک مایو بنانے کے اجزاء: مایونیز 1 کپ، پیاز پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، لہسن پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، کٹی لال مرچ 1 چائے کا چمچ، کالی مرچ 1 چٹکی، کریم 2 کھانے کے چمچ۔

گارلک مایو بنانے کی ترکیب: ایک باؤل میں مایونیز، پیاز پاؤڈر، لہسن پاؤڈر، نمک، کٹی لال مرچیں، کالی مرچ اور کریم ڈالکر تمام اجزا مکس کریں، سوس تیار ہے۔

ویفل بنانے کی ترکیب: ویفل بنانے کی مشین کو پہلے سے گرم کر لیں۔ اب ایک بڑے باؤل میں میدہ، چینی، بیکنگ پاؤڈر اور نمک ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ پھر دودھ میں انڈے، ونیلا ایسنز اور پگھلا ہوا مکھن ڈالکر مکس کرلیں۔ پہلے سے گرم ویفل بنانے کی مشین میں ایک چوتھائی بیٹر ڈال کر پکالیں یا جب تک گولڈن براؤن ہوجائے، مزیدار ویفل تیار ہے۔

اسمبلنگ: پیکٹ پر دی ہدایات کے مطابق نگٹس تیار کر لیں۔ اب ایک ویفل لیں اس پر گارلک مایو پھیلا کر سلاد پتا رکھیں اور پھر تیار کئے نگٹس رکھیں۔ پھر ٹماٹر سلائس رکھ کر کیچپ ڈالیں اور چیز سلائس رکھ کر دوسرے ویفل سے ڈھک دیں۔ ویفل سلائیڈرز تیار ہیں۔

پیزا پیپرونی پف

اجزا: پیپرونی سلائس 200 گرام، چکن تکہ چنکس: 200 گرام، میدہ 1 اور آدھا کپ، بیکنگ پاؤڈر 1 کھانے کا چمچ، خشک اوریگانو آدھا کھانے کا چمچ، انڈہ 1 عدد، چیڈر چیز 1 کپ، سبز شملا مرچ 1 چوتھائی کپ، سرخ شملا مرچ 1 چوتھائی کپ، لہسن پاؤڈر 1 چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، کالی مرچ 1 چائے کا چمچ، پیزا سوس 1 کپ

ترکیب: پیکٹ پر دی ہدایات کے مطابق چکن تکہ چنکس اور پیپرونی سلائس تیار کرلیں۔ اب ایک باؤل میں میدہ، اوریگانو، دودھ، انڈہ، چیڈر چیز، نمک، کالی مرچ، سبز شملا مرچ، سرخ شملا مرچ، لہسن پاؤڈر اور بیکنگ ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ پھر مفن ٹرے لیکر اس پر ایک چمچ بیٹر ڈالکر چکن تکہ چنکس رکھیں۔ اب دوبارہ ایک چمچ بیٹر ڈالیں اور اس پر پیپرونی سلائس رکھیں۔ پھر چیڈر چیز اور شملا مرچ ڈال کر اوریگانو چھڑک دیں۔ اب پہلے سے گرم اوون میں ایک سو اسی درجہ حرارت پر بیس منٹ بیک کرلیں۔ پیزا پیپرونی پف کو پیزا سوس کے ساتھ سرو کریں۔

Pakistanipoint.com

ذلت والی نوکری

محمد بلال رضوی

دنیا میں کئی طرح کی ملازمتیں پائی جاتی ہیں لیکن ایک ملازمت ایسی ہے جسے دنیا کی مشکل ترین ملازمت کہا جاتا ہے!

پوری دنیا میں عمومی طور پر لوگوں کا ذریعہ معاش دو طرح کا ہوتا ہے، بعض لوگ اپنا ذاتی کام یا کوئی کاروبار وغیرہ کرتے ہیں جسے عرف عام میں بزنس کہا جاتا ہے۔ اور بعض لوگ کسی فرد کے پاس یا کسی کمپنی، ادارے وغیرہ میں ملازمت یا نوکری کرتے ہیں جسے جاب کہا جاتا ہے۔

ذاتی کاروبار کو ترجیح دینے کی وجوہات

بعض لوگ اپنے ذاتی کام یا کاروبار کو ترجیح دیتے ہیں جس کی چند وجوہات ہیں۔

1۔ کاروبار میں برکت ہے' اس میں آمدنی محدود نہیں رہتی بلکہ روز بروز بڑھتی ہی رہتی ہے۔

2۔ کاروبار میں آپ کسی کے ماتحت نہیں ہوتے آپ اپنی سوچ سے کام کرتے ہیں' کسی کے حکم کے پابند نہیں ہوتے بلکہ خودمختار اور اپنے کام میں آزاد ہوتے ہیں۔

3۔ کاروبار میں آپ کو وہ خوف وخطرات لاحق نہیں ہوتے جو نوکری کرنے والوں کو ہوتے ہیں کہ نوکری سے نکال دیا جاؤں گا وغیرہ وغیرہ۔

4۔ کاروباری شخص کی سوچ بہت وسیع ہوتی ہے جبکہ ملازمت یا نوکری کرنے والے محدود سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں ملازمت یا نوکری کے مقابلے میں ذاتی کاروبار کرنے والے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

ملازمت یا نوکری کو ترجیح دینے کی وجوہات:

بعض لوگ ملازمت یا نوکری کو ترجیح دیتے ہیں اس کی بھی چند وجوہات ہیں۔

1۔ ذاتی کاروبار کے لئے خاطر خواہ سرمائے کی ضرورت ہے لیکن ملازمت یا نوکری کے لئے کسی سرمائے کی ضرورت نہیں ہے۔

2۔ ذاتی کاروبار میں نفع ونقصان دونوں پہلو ہوتے ہیں جبکہ ملازمت یا نوکری میں فقط ایک ہی پہلو یعنی نفع ہی نفع ہے نقصان کا اندیشہ نہیں۔

3۔ ذاتی کاروبار کیلئے بسا اوقات بہت زیادہ وقت دینا پڑتا ہے جس کی وجہ سے گھر والوں کی ذمہ داری' والدین کی خدمت' اولاد کی تعلیم وتربیت میں حرج پیدا ہوتا ہے۔

4۔ ملازمت یا نوکری میں لگی بندھی تنخواہ ہوتی ہے جو بہرصورت ملتی ہے جبکہ کاروبار میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ عمومی سروے کی رپورٹ ہے:

کاروبار یا ملازمت ونوکری کو ترجیح دینے کی جو وجوہات اوپر بیان کی گئی ہیں یقیناً ان تمام وجوہات سے آپ کا اور میرا متفق ہونا ضروری نہیں لیکن یہ وجوہات ایک عام سروے میں سامنے آئی ہیں اور متوسط طبقے کے اعتبار سے ذکر کی گئی ہیں یعنی تقریباً یہی کچھ وجوہات ہوتی ہیں جن کی وجہ سے کاروبار' ملازمت یا نوکری کو ترجیح دی جاتی ہے۔

کاروبار اور ملازمت لازم وملزوم ہیں:

واضح رہے کہ ذاتی کاروبار اور ملازمت ایک طرح سے لازم وملزوم بھی ہیں' کاروبار چھوٹا ہو تو بعض دفعہ اس کے لئے بھی ملازم یا نوکر رکھنا پڑتا ہے اور جو لوگ وسیع پیمانے پر ذاتی کاروبار کرتے ہیں انہیں تو بعض اوقات سینکڑوں ملازمین کی ضرورت پیش آتی ہے اسی طرح بڑی بڑی کمپنیاں اگرچہ کسی کا ذاتی کاروبار ہوتی ہیں مگر ان میں ہزاروں ملازمین ہوتے ہیں۔ اگر دنیا سے ملازمت یا نوکری کا کلچر ختم کردیا جائے یا ہر شخص اپنا ذاتی کاروبار کرنے کا ذہن بنالے تو دنیا جہان کے تمام کاروبار خود بخود ختم ہوجائیں گے۔

دنیا کی سب سے بڑی تلاش

یقیناً دنیا بھر میں مالداروں کی کمی ہے اس لئے ذاتی کاروبار بھی بہت کم ہیں جبکہ اس کے مقابلے

میں نوکری یا ملازمت کی تلاش کہیں زیادہ ہے۔ سکول، کالج، یونیورسٹی وغیرہ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد طلبہ کی ایک اکثریت ہے جو نوکری کی تلاش میں سرگرداں پھرتی ہے۔ جو نوکری کر رہا ہے وہ اس سے اچھی نوکری کی تلاش میں ہے۔

نوکری کی دو کیفیات:

نوکری یا ملازمت میں عموماً دو میں سے ایک کیفیت ضرور پائی جاتی ہے۔ جس نوکری یا ملازمت میں اچھی سہولیات ہوں وقت بھی مناسب ہو، معاوضہ بھی اچھا ہو عموماً لوگ اس نوکری کے بارے میں کہتے ہیں فلاں کی بڑی عزت والی نوکری ہے اور جس نوکری میں وقت بہت زیادہ ہو اور تنخواہ اس کے مطابق نہ ہو تو اس کے بارے میں بھی لوگ کہتے ہیں کہ فلاں کی بڑی ذلت والی نوکری ہے یا فلاں شخص مجبوری میں نوکری کر رہا ہے ورنہ اس نوکری میں عزت کہاں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

دنیا کی سب سے ذلت والی نوکری:

آیئے! اب میں آپ کو ایک ایسی نوکری کا تعارف کرواتا ہوں جس کی شرائط پڑھ کر ہر شخص یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ تو بڑی ذلت والی نوکری ہے۔

ذلت والی نوکری کی شرائط:

اس نوکری کی کم از کم شرائط ہیں تمام شرائط کو اس ذہن سے پڑھئے گویا آپ کو ایک نوکری کی تلاش ہے۔ آپ نے ایک ادارے یا کمپنی میں اپنی سی وی جمع کروائی اور بالآخر اس ادارے نے آپ کو نوکری کیلئے بلوایا۔ آپ سے ایک انٹرویو لیا اور آپ ادارہ کے معیار پر پورے اُترے ہیں اور وہ اس بات پر راضی ہے کہ آپکو نوکری دیدے۔ پہلے اس نے نوکری کی شرائط آپ کے سامنے رکھی ہیں جنہیں آپ پڑھ رہے ہیں اور پھر سب سے آخر میں معاوضہ کی بات کی جائے گی۔

کام کے حوالے سے شرائط:

1۔ آپ کی نوکری میں کوئی بھی ایک کام مخصوص نہیں ہے۔

2۔ آپ کو ہر کام کیلئے تیار رہنا ہوگا۔

3۔ کام ایک شخص نہیں دے گا بلکہ مختلف افراد کام دے سکتے ہیں۔

4۔ کام دینے والے ایک ہی وقت میں ایک کام دینے کے پابند نہیں بلکہ وہ آپ کو ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ کام دے سکتے ہیں بلکہ اسے سو فیصد یقینی بات سمجھئے کہ آپ کو واقعی ایک وقت میں ایک سے زیادہ کام ہی دیئے جائیں گے۔

5۔ کام کے سلسلے میں آپ کسی کو منع بھی نہیں کر سکتے کہ میں آپ کا کام نہیں کروں گا، یا میں پہلے فلاں کا کام کرلوں وغیرہ وغیرہ۔

6۔ آپ کو کام دینے والے کی حیثیت باس یا منیجر کی سی ہے اور آپ کی حیثیت اس کے سامنے ایک ملازم کی سی ہے جسے اپنے باس یا منیجر کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

7۔ کام دینے والوں میں سے اگر کسی کا کام پورا نہ ہوا تو وہ آپ کو مکمل طور پر ذلیل و رسوا کرنے کا حق رکھتا ہے۔

8۔ بلکہ بسا اوقات تو کام پورا ہونے کی صورت میں یا دوران کام یا کام کے شروع میں بھی ذلت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

9۔ کام دینے والوں میں ایسے افراد بھی ہوسکتے ہیں جو کام دینے کے ماہر ہوں اور ایسے افراد بھی ہوسکتے ہیں جنہیں سرے سے کام کی سمجھ بوجھ ہی نہیں۔

10۔ جس کمپنی میں آپ کی ملازمت لگ رہی ہے اس میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر شخص آپ پر حکم چلا سکتا ہے اور آپ کو منع کرنے کی اجازت بھی نہیں۔

11۔ کام دینے والے اس بات کے پابند نہیں کہ وہ آپ کو اسی وقت کام دیں گے جب آپ جاگ رہے ہوں بلکہ وہ آپ کو گہری نیند سے جگا کر بھی کام دے سکتے ہیں۔

12۔ کام دینے والے آپ کو فقط کمپنی میں کام دینے کے پابند نہیں ہیں بلکہ اگر وہ باہر کہیں آؤٹنگ پر جاتے ہیں تو وہاں بھی کام دے سکتے ہیں اور وہاں بھی آپ ان کے کام کرنے کے پابند ہوں گے منع نہیں کرسکتے۔

ڈیوٹی کے وقت کے حوالے سے شرائط

1۔ آپ کا ڈیوٹی کا وقت 24 گھنٹے ہے۔

2۔ اس کمپنی کے قوانین کے مطابق آپ کو ایک منٹ کی بھی چھٹی نہیں۔

3۔ کمپنی کی طرف سے کوئی سرکاری چھٹی بھی نہیں ہے۔

4۔ بلکہ سرکاری چھٹی میں ہوسکتا آپ کو زیادہ کام کرنا پڑے۔

5۔ کمپنی میں کام کرنے والوں کی ہفتے میں کم از کم ایک چھٹی ہوگی اس چھٹی میں آپ کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ اس چھٹی میں آپ کو ڈبل کام کرنا ہوگا۔

6۔ کمپنی سے آپ چھٹی کا مطالبہ نہیں کرسکتے بلکہ ہوسکتا ہے کہ چھٹی کا مطالبہ کرنے پر آپ کو ذلت کا سامنا کرنا پڑے۔

7۔ ہوسکتا ہے آپ سوچ رہے ہوں کہ ہفتہ وار یا ماہانہ تو کوئی چھٹی نہیں ہے لیکن شاید سالانہ چھٹیاں ہوں مگر یہ آپ کی خوش فہمی ہے سالانہ چھٹی بھی کوئی نہیں۔

کام کرنے والوں کے حوالے سے شرائط:

1۔ آفس میں کام کرنے والوں کے ساتھ ساتھ آپ کو آفس کا بھی کام کرنا ہوگا اس کے اندرونی و بیرونی تمام کام کرنے کی ذمہ داری بھی آپ ہی کی ہے۔

2۔ آفس کو صاف ستھرا رکھنا بھی آپ ہی کی ذمہ داری ہے۔

3۔ آفس میں کام کرنے والے آفس کو خراب اور گندا کرنے کے پابند ہیں لیکن آپ آفس کو صاف ستھرا رکھنے کے ہی پابند ہیں۔

4۔ آفس کے مختلف حصوں کی صفائی ستھرائی بھی آپ ہی کی ذمہ داری ہے حتیٰ کہ آفس کا واش روم بھی آپ ہی صاف کریں گے۔

5۔ آفس کی مینجمنٹ بھی آپ ہی کی ذمہ داری ہے۔

6۔ آفس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر ہونی چاہئے نہیں تو آفس میں کام کرنے والے حضرات آپ کو ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔

7۔ آفس میں کام کرنے والے کسی بھی فرد کو ناراض ہونے کا پورا حق ہے اور ناراضگی کی صورت

میں آپ کو انہیں منانا بھی ہوگا۔

8۔ آفس کے بعض افراد آپ پر ہاتھ بھی اٹھا سکتے ہیں بلکہ آپ کو آفس سے باہر بھی نکال سکتے ہیں یہ تمام تکالیف آپ کو بخوشی برداشت کرنا ہوں گی۔

9۔ آفس کے تمام کاموں کو کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بہتری کیلئے مشورے دینا بھی آپ کی ذمہ داری ہے البتہ آفس میں کام کرنے والے لوگ اس بات کے پابند نہیں کہ وہ آپ کے مشوروں کو تسلیم کریں۔

10۔ آفس کے کسی بھی معاملے کا آپ باہر کے کسی فرد کے ساتھ ذکر نہیں کر سکتے بلکہ آفس میں آپ کے ساتھ جو بھی معاملات ہوں باہر آپ کو بہرصورت تعریف ہی کرنا ہوگی۔

سب برداشت کرلیں گے

کسی بھی کمپنی کی تمام شرائط کو پڑھنے کے بعد بھی ایک خیال ذہن میں آتا ہے کہ چلو کوئی بات نہیں سب تکلیفیں برداشت کرلیں گے اگر معاوضہ یا تنخواہ بہت اچھی ہوئی تو یہ تمام تکلیفیں کیا چیز ہیں؟ چلو زیادہ عرصے تک نہ سہی کچھ عرصے کے لئے ہی یہ ڈیوٹی کرلیں گے لیکن ٹھہریئے! فیصلہ کرنے سے پہلے تنخواہ کا ایگریمنٹ ضرور پڑھ لیں۔

سیلری یا تنخواہ کا ایگریمنٹ

1۔ آپ کو سالانہ تنخواہ نہیں دی جائے گی۔

2۔ عام ملازمین کی طرح آپ کی ماہانہ بھی کوئی تنخواہ مقرر نہیں ہے۔

3۔ یورپین ممالک کی طرح ہفتہ وار تنخواہ بھی نہیں دی جائے گی۔

4۔ مزدوروں کی طرح روز کی دیہاڑی بھی نہیں دی جائے گی۔

5۔ کسی قسم کا کوئی سالانہ انکریمنٹ بھی نہیں دیا جائے گا۔

6۔ جب تنخواہ ہی نہیں دی جائے گی تو اضافے کا لفظ ہی ذہن سے نکال دیں۔

کمپنی کی طرف سے دی جانے والی سہولیات

1۔ آفس والوں کے ساتھ کھانا کھانے کی آپ کو اجازت ہے مگر آپ کو آفس والوں کا بچا ہوا کھانا بھی کھانا پڑ سکتا ہے بلکہ ان کا بچا ہوا کھانا تو آپ ہی کو کھانا ہوگا۔

2۔ آپ کے کپڑوں کی ذمہ داری آفس والوں پر ہے مگر مطالبہ کرنے پر آپ کو ذلت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

3۔ اپنی ڈیوٹی کے حوالے سے کسی بھی قسم کی تکالیف کو سہنے کی آپ کو ہر طرح سے اجازت ہے البتہ کبھی کبھی آپ کی حوصلہ افزائی بھی ہوجائے تو خوش ہو سکتے ہیں۔

ایک حیرت انگیز انکشاف

مذکورہ بالا تمام شرائط خصوصاً تنخواہ کا ایگریمنٹ پڑھ کر آپ کے دل و دماغ میں جو طوفان اٹھ رہے ہیں مجھے ان کا بخوبی اندازہ ہے۔ کیونکہ جب پہلی بار میں نے یہ شرائط پڑھی تھیں تو میری بھی یہی کیفیت تھی۔

فی الفور تو یہی ذہن میں آرہا ہے کہ جو اس کمپنی میں نوکری کرنا چاہے جی جان سے کرے مگر میں تو ایک منٹ کیلئے بھی اس کمپنی میں نوکری نہیں کر سکتا لیکن اب میں آپ کے سامنے ایک ایسا انکشاف کرتا

ہوں جسے سن کر آپ کے ہوش اُڑ جائیں گے آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے۔ وہ انکشاف یہ ہے اس کمپنی میں دنیا کے ہزاروں' لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں لوگ مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ عرصہ دراز سے نوکری کررہے ہیں۔ جی ہاں کروڑوں لوگ یہ ذلت والی نوکری کررہے ہیں مگر جو لوگ یہ ذلت والی نوکری کررہے ہیں وہ بہت عزت والے نوکر ہیں۔

یہ عزت والے نوکر کون ہیں.....؟

میں جس کمپنی اور اس کی شرائط کا ذکر کررہا ہوں وہ آپ کا اور میرا گھر ہے اور اس گھر کے عزت والے نوکر ماں' بیوی' بیٹی اور بہن ہیں جو یقیناً نوکر نہیں لیکن ہم نے انہیں گھر کا نوکر بنا دیا ہے اور کمپنی میں رہنے والے جن لوگوں کے یہ ناز نخرے اٹھاتے ہیں وہ میں آپ اور ہم ہیں۔ پہلی بار آپ نے مذکورہ بالا شرائط اس لئے پڑھی تھیں کہ آپ انہیں اپنی ذات کے لئے سمجھ رہے تھے لیکن اب میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ جن معزز ہستیوں کا میں نے ذکر کیا' ان کو ذہن میں رکھئے اور دوبارہ شرائط کو پڑھئے اور غور کیجئے کہ میری بتائی ہوئی شرائط میں سے کوئی ایسی شرط ہے جو ان میں سے کسی میں نہ پائی جاتی ہو؟

O گھر میں کام کرنے کیلئے ان کا کوئی مخصوص وقت نہیں۔ 24 گھنٹے ہر کام کیلئے ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔

O کھانے میں ہر ایک فرمائش انہیں پوری کرنی پڑتی ہے۔

O ہمارے گھر کا ہر فرد ان پر حکم چلاتا ہے۔

O دیگر کاموں کے ساتھ ہر ایک کو راضی رکھنا بھی ان ہی کی ذمہ داری ہے۔

O کبھی کوئی کام کسی وجہ سے نہیں ہوسکا تو ہم اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کے پورے وجود کو بے عزتی کی دلدل میں دھنسا دیتے ہیں۔

O دن میں اگر بڑوں نے ان کا جینا حرام کیا ہوا ہے تو رات کے وقت اپنے چھوٹے بچوں کیلئے ان کی نیند قربان ہورہی ہے۔

O گھر کو صاف ستھرا رکھنا بھی ان ہی کی ذمہ داری ہے اور اگر کوئی کام رہ گیا تو کیا یہ ہماری اعلیٰ ظرف مہمان نوازی سے محروم رہیں گے۔

O ہمارے گھروں میں رہنے والے بعض بے شرم و بے حیا افراد تو بلاوجہ ان کو گالی گلوچ حتیٰ کہ مار پیٹ کے تحائف سے بھی نواز دیتے ہیں۔

کیا یہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ نہیں ہے یقیناً ہے اور ضرور ہے لیکن ہم نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی ہمیں بس اپنی ذات عزیز ہے۔ بس ہماری خواہشیں پوری ہوجائیں ہم صبح اٹھیں تو ہر چیز ہمارے لئے تیار ہو' ناشتہ وقت پر ملنا چاہئے' کپڑے استری شدہ ہوں' آفس لے جانے والی تمام اشیاء موجود ہوں واپسی پر بھی ہر چیز ہماری خواہش کے مطابق ہو' گھر کے سارے کام وقت پر ہوجائیں گھر ہر وقت صاف ستھرا ہونا چاہئے الغرض ہمارے منہ مبارک سے جو بات نکلے وہ پوری ہونی چاہئے۔ آج تک ہم نے اپنی خواہشات کو سامنے رکھا.....

کبھی اپنی ماں کے جذبات کا سوچا جس کے قدموں تلے جنت ہے.....

کبھی بیوی کے جذبات کا سوچا جو ہماری عزت کی محافظ ہے.....

کبھی اس بہن کے جذبات کا سوچا جو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتی؟

.....❁.....❁.....

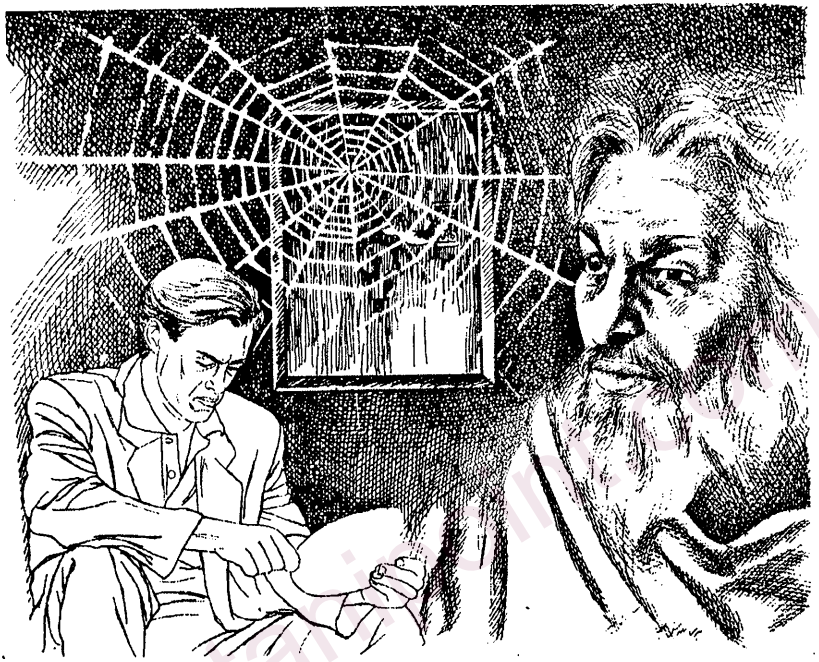

ایس امتیاز احمد

مندر کا حصار.....!!

کالی مائی کے ایک مندر کی پراسرار داستان' جو انسانوں سے صدیوں کے فاصلے پر چلا گیا تھا۔ جس تک پہنچنا سائنس کے اس دور میں بھی ناممکنات میں سے تھا.....!!

کس قدر عجیب بات تھی' وہ مندر گاؤں سے صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا لیکن ایک میل کا یہ فاصلہ میں اور شاہد علی صبح سے اب تک طے نہیں کر سکے تھے۔ دوپہر کے بارہ بج چکے تھے' دھوپ میں بلا کی شدت آ چکی تھی۔ ہمارے جسم پسینے میں تر تھے۔ دم لبوں پر آ گیا تھا۔ اس پر بھی میں مندر تک جانے کے لئے بضد تھا اور ایک میل کا فاصلہ بدستور قائم تھا۔

میں شاید اس گاؤں میں کبھی نہ آتا' اگر شاہد علی اس شدومد سے اصرار نہ کرتا۔ وہ میرا کالج کے زمانے کا دوست تھا۔ سلہٹ سے تیس چالیس میل کے فاصلے پر اس کا گاؤں تھا۔ گاؤں کی پُرسکون اور

سرسبز و شاداب زندگی پر اکثر باتیں کیا کرتا۔ شہروں کے ہنگامے اسے ناپسند تھے۔ شور شرابا اس کے حواس پر گراں گزرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ مجھے گاؤں میں چند دن گزارنے کی دعوت دیا کرتا۔ میں اس کی خواہش تعلیم کے زمانے میں تو پوری نہ کرسکا البتہ والد کی وفات کے بعد جب ان کا کاروبا سنبھالا اور زندگی یکسانیت کا شکار ہوگئی تو ایسے میں ایک بار پھر اس کا خط ملا۔ اب وہ بھی اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔

اس کا خط ماحول کی یکسانیت سے فرار کا ایک راستہ نظر آیا اور میں گاؤں جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ میں نے اسے بذریعہ تار اطلاع بھی دیدی کہ میں فلاں تاریخ کو آرہا ہوں۔ شاہ آباد ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور اس کی مناسبت سے سٹیشن بھی چھوٹا ہی تھا۔ اس پر اُترنے والے صرف تین چار آدمی تھے جن میں سے ایک میں تھا۔ گرمیوں کے دن تھے چلچلاتی دھوپ میرا مزاج پوچھ رہی تھی۔ لیکن شاہد علی کو پلیٹ فارم پر موجود دیکھ کر میری ساری کوفت دُور ہوگئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف لپکے اور بغل گیر ہوگئے۔ بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی اس لئے کافی دیر تک ایک دوسرے کے گلے لگے رہے۔

گاؤں میں ٹیکسیاں اور رکشے نہیں تھے اس لئے ہم ایک ٹانگے پر بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ ہر طرف کھیت ہی کھیت لہلہا رہے تھے کہیں کہیں کنویں اور ہٹ بھی دکھائی دیئے۔ آخر ہم ایک بڑے سے پختہ مکان کے سامنے ٹانگے سے اُترے۔ گھر کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو صحن میں ایک عورت اور ایک نوجوان لڑکی بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ لڑکی فوراً اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ شاہد علی نے اپنی والدہ اور بہن کا ذکر اکثر کیا تھا۔ اچٹتی سی اس ایک نظر میں' میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی بہن کا رنگ سانولا تھا اور اس کے چہرے میں کوئی کشش بھی نہیں تھی۔ ہمیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر شاہد علی کی والدہ کے سبزی کاٹتے ہاتھ رُک گئے۔ ان کے چہرے پر ایک پُرشفقت مسکراہٹ رقص کرنے لگی ایسی مسکراہٹ میں نے صرف اپنی والدہ کے چہرے پر دیکھی تھی۔

''یہ میری ماں ہے اور تمہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر جو اندر بھاگی ہے میری بہن شمائلہ ہے۔'' شاہد علی نے تعارف کرایا۔ ''اور ماں یہ ہے میرا گہرا دوست۔ بس میں نے زندگی میں انور کو ہی دوست بنایا ہے۔''

میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور شاہد علی مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ گھر کا ماحول حد درجہ پُرسکون تھا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی کہیں کوئی بے ترتیبی نظر نہ آئی۔ جس کمرے میں شاہد علی نے مجھے ٹھہرایا اس میں ایک پلنگ بچھا تھا جس پر سفید دودھ سی چادر موجود تھی۔ اس چادر میں ایک سلوٹ بھی نہیں تھی۔ پلنگ کے ساتھ ایک چھوٹی سی میز تھی اور میز کے دوسری طرف ایک کرسی۔ شاہد علی مجھے پلنگ پر دھکیلنے کے بعد خود کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا ''میری بہن بہت شرمیلی ہے۔ میں نے اس سے کہہ بھی دیا تھا کہ تم سے پردہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ تمہارے گھر میں بھی مجھ سے کبھی پردہ نہیں کیا گیا لیکن اس کے باوجود وہ تمہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر اندر چلی گئی۔ تم کوئی خیال نہ کرنا وہ بہت سیدھی ہے۔ شہری آب و ہوا اور ماحول سے اسے ذرا بھی واقفیت نہیں۔'' جواب میں' میں مسکرا اُٹھا اور بولا ''کوئی بات نہیں پردہ کرنا تو بہت اچھی عادت ہے۔''

دوسری صبح میں شاہد علی کے ساتھ غسل خانے کی طرف جانے کے لئے باہر نکلا تو پھر شمائلہ پر نظر پڑی اور یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ کل اس کے جو نقوش پھیکے نظر آئے تھے ان میں اس وقت ایک

عجیب سی جاذبیت تھی۔ میں اس جاذبیت کی کوئی وجہ نہ جان سکا اسے کوئی معنی نہ پہنا سکا۔ لڑکی تو وہی تھی نقوش بھی وہی تھے پھر ایک ہی رات میں اس قدر فرق کیسے رونما ہوگیا تھا۔ تو کیا کل میری نظر اس پر غلط رُخ سے پڑی تھی۔ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں یہ خیالات میرے ذہن میں گھوم گئے۔ اتنے میں شائلہ پھر اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا اور خود کو لعنت ملامت کی کہ دوست کی بہن کے بارے میں سوچنا بھی گناہ ہے' لیکن ذہن پھر کراس کی طرف منتقل ہوتا رہا۔

نہا دھو کر ناشتے سے فارغ ہوئے تو گاؤں کی سیر کی ٹھہری۔ ہم گھر سے باہر نکلے اس وقت میری نظر اس مندر پر پڑی۔ مندر صبح کو دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس کی آب و تاب اور چمک دمک نے مجھے حیرت زدہ کردیا۔ میں نے شاہد علی سے پوچھا ''کیا یہاں ہندو بھی آباد ہیں؟'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا اور کہنے لگا ''کبھی تھے اب یہاں صرف مسلمان آباد ہیں۔'' مجھے یہ سُن کر اور بھی حیرت ہوئی کیونکہ مندر تو بالکل نیا نظر آتا تھا۔ مجھے حیران دیکھ کر شاہد علی بولا۔ ''یہ حقیقت ہے کہ مندر بالکل نیا نظر آتا ہے لیکن یہ بہت پرانا ہے۔''

ہم پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے مندر کی طرف بڑھنے لگے۔ میں مندر کے بارے میں متجسس ہوگیا تھا اور چاہتا تھا اسے اندر سے دیکھوں۔ میری اس خواہش کے جواب میں شاہد علی نے بتایا کہ ہم قیامت تک بھی چلتے رہیں تو مندر تک نہیں جاسکیں گے۔

''کیا مطلب؟'' میں بُری طرح چونکا۔

''نہ جانے کتنے لوگ مندر تک جانے کی کوشش کر کرکے ہار چکے ہیں لیکن آج تک کوئی بھی پہنچ نہیں سکا۔''

''لیکن مندر تو بہت نزدیک ہے۔''

شاہد علی نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرے تجسس میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم نالے تک پہنچ گئے۔ اس نالے میں بارش کا پانی بہہ رہا تھا۔ شاہد علی نے بتایا کہ اس نالے سے مندر کا فاصلہ صرف ایک میل ہے۔

''تو پھر آؤ ہم یہ ایک میل کا فاصلہ چند منٹ میں طے کرلیں گے۔ آخر ایسی کیا بات ہے کہ لوگ ایک میل کا یہ مختصر سا راستہ طے نہیں کرسکتے ضرور تمہیں وہم ہوگیا ہے۔''

میرا اصرار حد سے بڑھ گیا تو شاہد میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو ہی گیا۔ ہم نے ایک چھلانگ میں نالہ پار کیا اور پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ یہ پگڈنڈی سیدھی مندر کی طرف جاتی تھی۔ میں دل ہی دل میں شاہد علی پر ہنس رہا تھا جس کے خیال میں ایک میل کا یہ مختصر سا راستہ ہم قیامت تک بھی طے نہیں کرسکتے جبکہ میرا خیال تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد ہم مندر کے پاس موجود ہوں گے۔

اچانک مجھے ایک ٹھوکر لگی میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی مگر منہ کے بل دائیں ہاتھ کی طرف کھائی میں جا گرا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ میرے ساتھ ہی شاہد علی کو بھی ٹھوکر لگی تھی اور وہ بھی گرا تھا۔ کپڑے جھاڑتے ہوئے ہم اُٹھے اور دوسرے ہی لمحے حیرت کا ایک پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ ہم دونوں اس جگہ کھڑے تھے جہاں سے ہم نے نالہ پار کیا تھا۔

چند لمحے تک میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ ہم دونوں واپس اس جگہ کیسے پہنچ گئے؟ ٹھوکر تو ہم نے نالے کے پار تقریباً ایک فرلانگ دُور کھائی تھی۔ شاہد علی کا چہرہ ستا ہوا تھا اگرچہ اسے پہلے ہی معلوم تھا کہ کیا ہوگا۔ اس کے باوجود بھی سکتے کے عالم میں تھا۔ میں نے اس کے شانے پر ایک تھپکی دی اور بولا ''فکر نہ کرو دوست ضرور ہم سے غلطی ہوئی ہے' ہم ایک بار پھر کوشش

کریں گے اور انشاء اللہ اس دفعہ مندر تک پہنچ کر ہی دم لیں گے۔'' شاہد علی تھکے تھکے انداز میں مسکرایا اور کہنے لگا ''یہی تمہاری بھول ہے میرے دوست۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ہم مندر تک نہیں پہنچ سکتے۔'' میں نے سر جھٹک دیا اور ''آؤ'' کہتا ہوا نالہ پار کر گیا۔ شاہد علی کو مجبوراً میرا ساتھ دینا پڑا۔ میں نے اس سے کہا ''دھیان رکھنا ٹھوکر ہرگز نہ کھانا۔ اگر ہم نے ٹھوکر نہ کھائی تو کامیابی ضرور ہمارے قدم چومے گی۔'' شاہد علی نے کوئی جواب نہ دیا اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

ایک بار پھر ہم اسی راستے پر چلے جا رہے تھے لیکن تھوڑی دیر بعد وہی ہوا جو پہلے ہو چکا تھا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے باوجود ہم نے ٹھوکر کھائی اور نالے کے دوسری طرف آ رہے۔

سورج اب سر پر آ گیا تھا۔ دھوپ نے شدت اختیار کر لی تھی حبس اور گھٹن میں بھی اضافہ ہو چلا تھا۔ ہمارے کپڑے گرد اور کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے۔ سانس پھولنے لگا تھا جیسے میلوں کا فاصلہ دوڑ کر طے کر چکے ہوں اور کھیتوں سے اٹھنے والی بساند گھبراہٹ میں اضافہ کر رہی تھی۔ شاہد علی نے مضمحل لہجے میں کہا۔

''اب کیا ارادہ ہے دوست؟''

میں نے جھلا کر کہا ''ایک بار پھر کوشش کریں گے۔''

شاہد علی نے مجھے باز رکھنے کی بہت کوشش کی اس نے میرا بازو پکڑا اور گھر کی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔ ''مان جاؤ دوست ہم عمر بھر بھی چلتے رہیں گے تو بھی ایک میل کا فاصلہ کم نہ ہوگا۔ جوں کا توں رہے گا کیا تمہارے خیال میں اس سے پہلے کسی نے مندر تک جانے کی کوشش نہ کی ہوگی۔ یہ گاؤں آخری آبادی ہے یہاں دوسری جگہوں سے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں لہٰذا کسی زمانے میں تو لوگوں کو جنون سا ہو گیا تھا۔ انہوں نے بار بار کوشش کی اور ہر بار منہ کی کھائی۔ یہاں تک کہ سب تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ لہٰذا آؤ گھر چلتے ہیں۔ کھانے کے ساتھ جب ٹھنڈی چھاچھ پئیں گے تو ساری کوفت اور تھکن دُور ہو جائے گی۔''

اس کی لمبی چوڑی تقریر کا مجھ پر ذرہ برابر بھی اثر نہ ہوا اور ایک بار پھر میں نے نالے کے پار چھلانگ لگا دی۔ وہ آخر میرا دوست تھا اسے میرا ساتھ دینا ہی پڑا۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ اس وقت میں نے خوفزدہ انداز میں پوچھا ''کیا یہ جادو کا مندر ہے؟'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ ہماری تیسری کوشش تھی لیکن میں ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر یہ راز کیا ہے۔ میں نے شاہد علی سے کہا ''بس ایک مرتبہ اور کوشش کریں گے اگر پھر بھی نہ پہنچ سکے تو میں ہار مان لوں گا۔'' ہم دونوں نے چھلانگ لگائی اور نالے کے پار پہنچ گئے۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور نالے کے کنارے کھڑے ایک درخت کی شاخ سے باندھنے لگا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' شاہد علی کے لہجے سے اس مرتبہ طنز کی جھلک عیاں تھی۔

''میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ وہی نالہ ہے جسے ہم بار بار پار کر چکے ہیں یا کوئی دوسرا نالہ ہمارے سامنے آتا ہے۔''

شاہد علی کو میری بات سن کر ہنسی آ گئی۔ تاہم وہ رُکا نہیں۔ پگڈنڈی بادی النظر میں بالکل سیدھی تھی اور مندر تک چلی گئی تھی۔ اس مرتبہ میں نے ہر ممکن احتیاط سے کام لینے کی ٹھان رکھی تھی۔ اور اس سلسلے میں پہلی ترکیب یہ کی کہ شاہد علی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اب اگر ہم میں سے کسی کو ٹھوکر لگتی تو گرنے کا احتمال نہیں تھا۔ ہم چلتے گئے لیکن فاصلہ کسی صورت کم ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاہد علی کا گھر بھی نالے سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا اور عجیب ترین

بات یہ تھی کہ یہ فاصلہ بھی زیادہ ہوتا معلوم نہیں ہوتا تھا۔اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ فاصلہ نہ کم ہو رہا تھا نہ زیادہ بہرحال ہم وہیں کے وہیں تھے۔ اس پر بھی میں قدم اٹھانے سے باز نہیں آیا۔ شاہد علی کے ہاتھ پر میری گرفت مضبوط تھی۔

''خوب ہوشیاری سے قدم اُٹھاؤ خبردار اس مرتبہ ہم ٹھوکر ہرگز نہیں کھائیں گے۔''میں نے شاہد علی کو تنبیہ کی۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا البتہ سر ضرور ہلا دیا لیکن جو کچھ ہونا تھا وہ تو پلک جھپکنے میں ہی ہوگیا ''سس......سانپ!''

بدحواسی کے عالم میں شاہد علی کے منہ سے نکلا۔ بس اسی لمحے میری توجہ پگڈنڈی سے ہٹ گئی اور میں اچھل کر ویران کھیت میں جا پڑا۔ مجھے ہوش آیا تو ہم اسی مقام پر کھڑے تھے اور نالے کے دوسرے کنارے پر ناریل کے درخت سے اڑسا ہوا رومال ہوا میں لہرا رہا تھا۔ شاہد علی کے چہرے پر طنز آمیز مسکراہٹ میں تھکن کی آمیزش تھی جیسے کہہ رہا ہو اب کیا خیال ہے بیٹے۔ میں جھلا اُٹھا اور اس سے بولا۔

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا تم نے بلاوجہ مجھے ڈرایا حالانکہ وہاں سانپ کا نام ونشان نہیں تھا۔''

شاہد علی نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''سانپ یقیناً تھا میں نے اسے تمہارے پیروں کے عین نیچے دیکھا تھا۔''

اور میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اگر شاہد علی سچ کہہ رہا تھا تو پھر سانپ مجھے کیوں نظر نہ آیا؟ اور پھر یہ بھی کچھ کم حیران کن حقیقت نہیں تھی کہ ہر بار ہم نالے کے اس پار پگڈنڈی سے لڑھکتے تھے اور خود کو نالے کے اس پار یعنی شاہد علی کے گھر کی سمت میں پاتے تھے خدا جانے کیا چکر تھا۔ آخر میں نے کہا۔

''آؤ ایک بار پھر کوشش کریں۔''

''ٹھہرو! پہلے ایک کہانی سن لو اس کے بعد کوشش کرتے رہنا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ شروع میں، میں نے تمہیں یہ کہانی اس لئے نہیں سنائی تھی کہ تم اسے کسی مجذوب کی بڑ نہ سمجھو۔ پہلی مرتبہ جب تم نے مندر کے بارے میں پوچھا تھا تو اس وقت میں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ کوئی شخص بھی اپنے پیروں سے چل کر مندر تک نہیں جاسکتا بس تم پر بھوت سوار ہوگیا۔ اب تم جان چکے ہو کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔''

''تو اب تم مجھے کوئی کہانی بھی سناؤ گے۔ خیر یار سناؤ اس طرح دم لینے کا موقع بھی مل جائے گا۔''

''شاہد نے کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے ہی تھے کہ پھر رُک گیا۔ پھر کہنے لگا ''نہیں اس طرح تمہیں اس کہانی پر یقین نہیں آئیگا آؤ گھر چلیں وہاں ہمارے ایک بزرگ کی ڈائری موجود ہے اس ڈائری میں اس مندر کے متعلق پوری تفصیل موجود ہے بہتر ہوگا کہ تم اس ڈائری کا مطالعہ کرلو۔ لیکن اس سے پہلے ہم کھانا کھائیں گے کیونکہ بھوک خوب چمک اُٹھی ہے۔''

میں نے اس کی تجویز کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور کپڑے جھاڑے اور کیچڑ چھڑاتے ہوئے اس کے ساتھ قدم اٹھانے لگا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی شمائلہ اور اس کی والدہ کی نظر ہم پر پڑی اور میں نے شاہد کی والدہ کی آنکھوں میں حیرت دیکھی جبکہ شمائلہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی، میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شاہد علی شاید اپنی ماں کو ... مسلط تھی۔ ردپا بھ گیا تھا کہ ہمارے حلئے کیوں بگڑ چل رہی تھی۔ مجھے

کھانے سے فارغ ہوئے تیز چلنا پڑ رہا تھا کتابوں کی الماری سے ایک چیز نظر آ رہی ڈائری نکال کر میرے آگے رکھ دی اور کہا کہ اب لیٹ جاؤ اور لیٹ کر اس ڈائری کی ورق گردانی کرو

اس کے بعد تمہیں مجھ سے کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ ڈائری پڑھنے کے بعد بھی اگر تم مندر تک جانے کا ارادہ ترک نہیں کرو گے تو میں اس وقت تک تمہارا ساتھ دُوں گا جب تک کہ تم تھک نہیں جاؤ گے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا اور میں نے پلنگ پر لیٹ کر ڈائری کی جلد اُلٹ دی۔ شاہد علی سے یہ تک پوچھنے کا خیال نہ رہا تھا کہ جس شخص کی یہ ڈائری ہے اس کا خود شاہد علی سے کیا رشتہ تھا۔ پہلے ہی صفحے پر لکھا تھا یہ ڈائری سید بشیر احمد کی ملکیت ہے۔ شاہد علی نے ورق اُلٹ کر دیکھا یہ کوئی باقاعدہ تاریخ وار ڈائری نہیں تھی صرف ایک نوٹ بک تھی اور اس پر فوراً ہی وہ کہانی شروع ہوگئی تھی جو شاہد علی مجھے سنانے والا تھا۔ کہانی کچھ یوں تھی۔

یہ گاؤں میرے والد حضرت شاہ خیر اللہ نے بسایا تھا۔ وہ اپنے وقت کے عالم باعمل اور بہت بڑے بزرگ تھے۔ وہ حضرت شاہ جلال سلہٹی کے مقرب خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ جلال نے تبلیغ کی غرض سے سلہٹ کو اپنا مرکز بنایا تو اپنے مقرب شاگردوں کو بنگال کے مختلف علاقوں میں جا کر تبلیغ کا حکم دیا۔ میرے والد کو شمال مغرب کی طرف کوچ کا حکم ملا۔ وہ سلہٹ سے روانہ ہوئے تو اس جگہ آ پہنچے اور یہ جگہ انہیں کچھ ایسی بھائی کہ اپنے پیرومرشد کی اجازت سے یہیں سکونت اختیار کرلی۔ ان کے ساتھ ان کے اہل خانہ کے علاوہ نومسلموں کی بھی اچھی بھلی تعداد تھی [illegible] لوگ بھی یہیں آباد ہوگئے پھر آبادی بڑھنے لگی۔ میرے والد کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی خانماں لوگ بھی یہاں آ کر بسنے جانے کو سلم ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو گئے عرصہ بعد کچھ ہندو بھی ادھر آ نکلے۔ انہوں نے قبلہ والد سے اس گاؤں میں بسنے کی اجازت چاہی۔ والد صاحب نے انہیں بخوشی اجازت دیدی۔ شاید انہوں نے سوچا ہوگا کہ ہوسکتا ہے ان میں سے بھی بہت سے ہندو مسلمان ہوجائیں۔ چنانچہ ہندوؤں نے بھی کچے پکے مکان تعمیر کرلئے اور رہنے لگے۔ ان کے مکانات اس مندر کے آس پاس تھے۔ اس وقت یہ مندر نہیں تھا مسلمان اور ہندو ایک دوسرے سے دُور دُور نہیں رہتے تھے آپس میں بات چیت بھی کرتے تھے اور دُکھ درد میں بھی شریک ہوتے تھے۔

ان ہندوؤں میں سے ایک کا نام رام داس تھا۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام روپا تھا۔ میں نے اسے اکثر پانی بھرنے کے لئے گھڑا لئے گاؤں کے کنویں کی طرف جاتے دیکھا تھا اور نہ جانے کیوں وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ جب بھی وہ مجھے نظر آتی میں بے سدھ ہوکر اسے تکنے لگ جاتا۔ اس نے کئی بار میری محویت کو محسوس کیا مگر بُرا نہیں مانا۔ مجھے اس کی پیشانی پر بل نظر نہیں آئے اس کی آنکھیں بالکل کالی تھیں رنگ قدرے سانولا تھا لیکن نقوش بہت تیکھے تھے اور ان تیکھے نقوش پر اس کا سانولا رنگ سونے پر سہاگہ تھا۔ اس کی ناک پتلی تھی اور ہونٹ بھرے بھرے تھے جن کا رنگ جامنی سا تھا۔ چہرہ کتابی اور پیشانی کشادہ تھی۔ گردن بہت لمبی تھی شاید ایسی ہی گردنوں کو صراحی دار کہا جاتا ہے۔ میں نے کبھی اس سے بات کرنے کی کوشش نہ کی، نہ اس کی طرف قدم بڑھائے بس صرف دیکھتے رہنے پر اکتفا کیا کیونکہ اس کی طرف نہ دیکھنا میرے بس سے باہر تھا۔ اس نے بھی مجھ سے بات کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ ایک ننگ دھڑنگ سادھو گھومتا گھومتا اس گاؤں میں آ نکلا۔ ہندوؤں نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور پھر وہ بھی ان کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ مسلمانوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اس وقت کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ سادھو کے عزائم

کیا ہیں' اگر معلوم ہوتا تو شاید اسے گاؤں میں گھسنے ہی نہ دیا جاتا۔ شروع شروع میں سادھو نے کوئی غلط حرکت نہ کی۔ وہ نہایت شریفانہ انداز سے رہتا رہا۔ ہندو اسے بہت پہنچا ہوا بزرگ خیال کرتے تھے۔ وہ اس کے آگے بچھے جاتے لیکن مجھے وہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ میں نے کئی بار یہ بات محسوس کی کہ وہ روپا کو بُری طرح گھورتا ہے لیکن میں مسلمان تھا اسے روپا کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

پھر سادھو نے پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے سب سے پہلے اس نے ہندوؤں کو کالی مائی کا مندر تعمیر کرنے کی ترغیب دی۔ ہندو تو پہلے ہی اس کی باتوں پر عمل کرنا اپنا دھرم جانتے تھے انہوں نے فوراً مندر کی تعمیر شروع کر دی۔ میرے والد بزرگوار بھلا اس پر کیوں معترض ہوتے وہ کسی کے مذہبی معاملات میں ٹانگ اڑانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مندر تعمیر ہوگیا۔ ہندو اس میں باقاعدہ پوجا پاٹ کرنے لگے۔ اب تو میرے والد بھی سوچنے پر مجبور ہوگئے۔ مندر میں پوجا کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اب ہندو طاقت پکڑ جائیں گے اور تبلیغ کا سلسلہ منقطع ہوجائے گا لیکن اب تو مندر بن چکا تھا ہو بھی کیا سکتا تھا وہ خاموش ہو رہے۔

انہی دنوں تبلیغ کیلئے انہیں چند مہینوں کے لئے گاؤں سے باہر جانا پڑا۔ یہ واقعہ ان کے جانے کے دو تین دن بعد کا ہے۔ ایک صبح لوگ بیدار ہوئے تو ایک نوعمر لڑکا غائب تھا۔ لڑکے کے ماں باپ نے اسے اِدھر اُدھر تلاش کیا' جب نہ ملا تو ایک ایک سے پوچھتے پھرے لیکن لڑکا تو اس طرح غائب ہوا جیسے کبھی اس کا وجود ہی دنیا میں نہ تھا۔ لواحقین ابھی تک ہندو گھروں تک نہیں گئے تھے اب انہیں وہاں بھی جانا پڑا۔ ان سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن لڑکے کا کوئی پتہ نہ چلا۔ لڑکے کے ماں باپ رو دھو کر چپ ہوگئے خیال یہی کیا گیا کہ ضرور اسے کوئی درندہ اٹھا کر لے گیا ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ ان اطراف میں درندے نہیں تھے۔ اس لئے لڑکے کے بارے میں چہ میگوئیاں جاری رہیں یہاں تک کہ ایک سال گزر گیا اور ایک صبح ایک نوجوان لڑکی غائب ہوگئی۔ گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ ہر طرف لڑکی کو ڈھونڈا گیا مگر اسے ملنا تھا نہ ملی۔ اب تو سب کے رنگ اُڑ گئے۔ لڑکے کی گمشدگی کا واقعہ پھر سے تازہ ہوگیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ والد صاحب ان دنوں بھی گاؤں سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وہ واپس آئے تو انہیں اس بارے میں بتایا گیا۔ وہ سوچ میں ڈوب گئے لوگوں کو محتاط رہنے کی ہدایت کی اور خود بھی رات کو گاؤں کا چکر لگانے لگے۔ ایک سال اور گزر گیا۔ آدھی رات کا وقت تھا اور میں گہری نیند سو رہا تھا اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کوئی دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دے رہا تھا مجھے حیرت ہوئی کہ اس وقت کون آ گیا اٹھ کر دروازہ کھولا اور دھک سے رہ گیا۔ زندگی میں اس سے زیادہ حیرت مجھے کبھی نہ ہوئی ہوگی۔

دروازے پر روپا کھڑی تھی۔

''وہ..... وہ ..... اس کی قربانی دینے والے ہیں۔'' وہ چکلائی زندگی میں پہلی بار وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔

''کیا مطلب.....؟'' میں بُری طرح چونکا۔

''وقت نہیں ہے..... میرے ساتھ آؤ۔''

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تاہم مقناطیسی انداز میں اس کے ساتھ ہولیا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں ہر طرف گھنگھور تاریکی مسلط تھی۔ روپا مجھ سے دو قدم آگے تھی اور تیز تیز چل رہی تھی۔ مجھے بھی اس کا ساتھ دینے کے لئے تیز چلنا پڑ رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ مجھے ایک سایہ سا نظر آ رہی تھی۔ گرتا پڑتا میں اس کے پیچھے چلتا ہندوؤں کی آبادی میں داخل ہوگیا۔

آبادی میں داخل ہوتے ہی وہ مڑی اور اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا' اب اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میرے بدن میں کرنٹ سا دوڑنے لگا مگر شاید وہ میرے احساسات سے بالکل بے خبر تھی۔ یا پھر وہ وقت ہی ایسا تھا' اسے یہ احساس بھی نہیں رہ گیا تھا کہ اس نے ایک غیر مذہب جوان آدمی کا ہاتھ تھام لیا ہے۔ میں یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ اس کا رُخ اب کالی مائی کے مندر کی طرف تھا اب اس کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ قدم اٹھاتے وقت ہلکی سی چاپ بھی پیدا نہیں ہونے دے رہی تھی۔

مندر کا دروازہ کھلا تھا اور اندر سے عجیب و غریب سی آوازیں اُبھر رہی تھیں جیسے بہت سے لوگ مل کر کوئی گیت گا رہے ہوں۔ یہ گیت خالص ہندی زبان میں تھا اور میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ تاہم میں اتنا ضرور سمجھ گیا کہ گیت کالی مائی کی تعریف میں تھا۔ روپا یہاں تک پہنچ کر رُک گئی اور اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولی ''آج اسے کالی مائی پر قربان کر دیا جائے گا بچا سکتے ہو تو بچا لو۔''

میں سناٹے میں آ گیا نہ جانے روپا کس کے بارے میں کہہ رہی تھی' وہ کون بدنصیب تھا جسے قربان کیا جانے والا تھا اور پھر انسانوں کی قربانی..... میں تھرا کر رہ گیا۔ ایسا تو میں نے کیا کسی بھی مسلمان نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ جن ہندوؤں کو ہم نے گاؤں میں رہنے کی اجازت دی پھر ان کے بادھو مہاراج کو بھی آنے سے نہ روکا اب وہی لوگ اپنی کالی ماتا پر انسانوں کو قربان کر رہے تھے اور مجھے یقین ہو گیا کہ ضرور کوئی مسلمان ہو گا۔

بس اس لمحے میرا خون کچھ اس طرح کھولا کہ میں خود پر قابو نہ پا سکا۔ پوری قوت سے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز گیت کی لے پر حاوی ہو گئی۔ گیت کے سُر دب سے گئے جیسے نیکی بدی پر غالب آنے لگی ہو۔ اس آواز نے بم کا کام کیا۔ مندر میں موجود تمام لوگ اس طرح چونکے جیسے کسی گہرے خواب میں محو تھے۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ میرے سامنے کالی مائی کا ہیبت ناک بُت تھا اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا کتنے ہی بازو مختلف سمتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ کئی انچ لمبی زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی البتہ اس کالے رنگ کے بُت میں صرف آنکھیں سرخ رنگ کی تھیں اور یہ سُرخ رنگ کی آنکھیں اس کی خوفناکی میں اور بھی اضافہ کر رہی تھی۔

بُت کے آگے ایک قبر نما چبوترا بنا تھا۔ اس چبوترے پر ایک نوجوان بندھا پڑا تھا۔ اس کی گردن چبوترے کے ابھار پر رکھی تھی نوجوان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میں نے اسے پہچان لیا۔

وہ ہمارے گاؤں کی مائی جگن کا نوجوان بیٹا سلیم تھا۔ مائی جگن کا اس کے سوا اس دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ پالتا تھا اور ابھی پچھلے ہی سال اس نے اپنی والدہ کو حج بھی کرایا تھا۔ سب لوگ سلیم سے بہت خوش تھے۔ وہ سبھی کے کام آتا تھا لیکن آج وہی سلیم میری آنکھوں کے سامنے کالی مائی کی قربان گاہ کے چبوترے پر رسیوں سے جکڑا پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کا ایک سمندر موجزن تھا۔ آنکھوں کے سوا وہ جسم کے کسی بھی حصے کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھا کیونکہ اسے بہت سختی سے باندھا گیا تھا۔ چبوترے کے پاس ہی دیوار میں ایک چوڑے پھل والی تلوار لٹک رہی تھی۔ اس کا پھل دستے کی طرف سے اوپر کی طرف چوڑا ہوتا چلا گیا تھا یہاں تک کہ آخری سرے پر اس کی چوڑائی کم از کم چھ انچ کے برابر تھی۔ یہ تلوار خون میں لتھڑی ہوئی تھی لیکن اس خون کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس سے پہلے جس بدقسمت انسان کی قربانی دی گئی تھی یہ اس کا خون تھا۔ گویا قربانی کے بعد تلوار کو بُتوں کا تُوں لٹکا

کیا آپ چاہتے ہیں کہ

آپ، آپ کی اولاد، آپ کے بہن، بھائی، عزیز و اقارب

☆ جھوٹ بولنے سے باز آ جائیں

☆ تجارت اور ملازمت میں بدعنوانی اور بددیانتی سے باز آ جائیں

☆ اپنے گھر والوں سے حسن سلوک سے پیش آئیں

☆ زندگی کا ہر لمحہ نیکی اور پارسائی میں گزرے

☆ تعلیم و تعلم کے شاندار درس ذہن نشین ہو جائیں

☆ والدین سے وہ سلوک کریں جو خدا پسند کرتا ہے

تو

سیارہ ڈائجسٹ کی شاندار روایات کے پیش منظر میں پیش کیا جانے والا دلکش، دلکشا اور زریں

اخلاق رسولؐ نمبر

مطالعہ کیجئے

احادیثِ رسولؐ کی روشنی میں

دیا گیا تھا اسے صاف کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

میں سلیم اور کالی مائی کے بُت کو دیکھنے میں محو تھا اور ہندو مجھے دیکھ رہے تھے یہاں نہ صرف مرد موجود تھے بلکہ عورتیں بھی موجود تھیں۔ البتہ نوجوان لڑکیاں نہیں تھیں بچے بھی نہیں تھے شاید اس لئے کہ کہیں وہ خوفزدہ نہ ہوجائیں یا ان کے منہ سے بات نہ نکل جائے اور مسلمانوں تک نہ پہنچ جائے لیکن بات تو مسلمانوں تک پہنچ چکی تھی اور میں ان کے سامنے موجود تھا مگر بالکل نہتا جبکہ مقابلے میں سوڈیڑھ سو کے قریب مرد تھے عورتیں الگ رہیں۔

چند لمحوں تک نگاہوں کا تبادلہ ہوتا رہا اور پھر وہ سب مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے خوب ہاتھ پیر چلائے ان کے نرغے میں نہ آنے کی لاکھ کوشش کی اور اس کوشش میں ان میں سے کئی کو زخمی بھی کر ڈالا مگر ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ رفتہ رفتہ میرے ہاتھ سست پڑتے چلے گئے آخر میرے پیروں میں کھڑے رہنے کی سکت نہ رہی۔ میں دھڑام سے گرا اور پھر وہ چاروں طرف سے مجھ پر لاتیں اور مکے برسانے لگے تھوڑی دیر بعد مجھے ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ میرے سر منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے میں نے پورے ہال پر ایک نظر ڈالی' رویا وہاں نہیں تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اندر نہیں آئی تھی۔ وہ کم عمر تھی اور اسے مندر کی تقریب میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس نے چھپ کر اندر ہونے والی کارروائی کا معائنہ ضرور کیا تھا ورنہ وہ مجھے کیوں بلا کر لاتی۔ وہ کم عمر بھی تھی اور ناسمجھ بھی۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ میں تنہا اتنے بہت سے لوگوں کا مقابلہ کس طرح کرسکوں گا گاؤں سے چلتے وقت تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا اگر پہلے یہ معلوم ہوجاتا تو میں پوری مسلمان آبادی کو ساتھ لے کر مندر پر حملہ آور ہوسکتا تھا اور قبلہ والد محترم بھی ساتھ ہوتے پھر ان کی مجال نہیں تھی کہ مجھے باندھ سکتے لیکن اب میں ایک بے بس پرندے کی مانند تھا۔

گیت ایک بار پھر شروع ہوگیا تھا۔ گیت کی لے پر تمام مرد اور عورتیں تھرک رہے تھے۔ ان کے انگ انگ پھڑک رہے تھے آنکھوں میں وحشیانہ چمک لہرا رہی تھی۔ اچانک ہال کی دیوار میں ایک دروازہ کھلا اور سادھو اندر داخل ہوا۔ سادھو کا خیال تو میرے ذہن سے نکل ہی گیا تھا اسے بغلی دروازے سے نکلتے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ تو یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا تھا اس کی ترغیب پر ہی انسانی جانوں کی قربانی شروع کی گئی تھی۔ ورنہ اس کے گاؤں میں آنے سے پہلے تو یہاں مندر تک نہیں تھا اور نہ کوئی مسلمان غائب ہوا تھا۔ اب مجھے یاد آیا کہ اس سے پہلے دو مرتبہ ایک نوجوان لڑکا اور ایک لڑکی بھی غائب ہوچکے تھے ضرور انہیں کالی مائی کی بھینٹ ہی چڑھایا گیا تھا۔ میں خوف اور دہشت کے مارے کپکپا اٹھا گویا تیسرے نوجوان کی قربانی میری آنکھوں کے سامنے دی جائے گی اور میں کچھ بھی نہ کرسکوں گا۔ دفعتاً ہال میں موت کا سا سناٹا طاری ہوگیا۔ سادھو کو دیکھ کر وہ سب خاموش ہوگئے تھے۔ سادھو چبوترے کے عین سرے پر آ کھڑا ہوگیا تھا اس نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی اور پھر بولا۔

''یہ کہاں سے آ ٹپکا؟''

''پتہ نہیں مہاراج یہ یہاں کیسے پہنچ گیا۔'' ایک پجاری نے جواب دیا۔ ''خیر کوئی بات نہیں آج ایک کے بجائے دو مسلوں کی قربانی دی جائے گی کالی مائی اس مرتبہ ہم سے بہت زیادہ خوش ہوگی۔ سارا سال ہم نعمتوں سے مالا مال رہیں گے۔ اسے بھی چبوترے پر ڈال دو اور اس کے بعد پروگرام شروع کردو۔'' اس کے الفاظ ہال میں گونج کر رہ گئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مجھے ستون سے کھول کر دوبارہ رسیوں

سے جکڑا گیا اور سلیم کے برابر چبوترے پر لٹا دیا گیا۔ اب میری گردن بھی چبوترے کے ابھار پر رکھی تھی۔ سر مندر کی چھت کی طرف تھا مندر کی چھت بھی کالے رنگ کی تھی دیواریں بھی کالی تھیں اور ان سب مردوں اور عورتوں نے بھی سیاہ لباس پہنے ہوئے تھے۔ بس سلیم اور میرے کپڑے سفید تھے۔ مجھے چبوترے پر لٹانے کے بعد سادھو نے ایک عجیب قسم کا اشارہ کیا اس اشارے کے ساتھ ہی سب لوگ چبوترے کے گرد جمع ہوگئے اور زور زور سے اچھلنے کودنے لگے۔ ایک وحشیانہ اور بے ہنگم رقص تھا۔ رفتہ رفتہ رقص میں تیزی آتی گئی۔ اب ان کے جسموں کا ایک ایک انگ تھرک رہا تھا۔ وہ دائرے کی شکل میں چکر بھی کاٹ رہے تھے اور بے معنی اچھل کود بھی جاری تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کیا مرد کیا عورتیں سب بُری طرح ہانپنے لگے۔ ایک کونے میں بیٹھے ہوئے سازندے یہ دیکھ کر اور بھی جوش میں آ گئے۔ سازوں میں بلا کی تیزی آ گئی مرد اور عورتیں بھی ان سازوں کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن چونکہ سازوں میں بھی کوئی ترتیب نہیں تھی اس لئے رقص بھی سوائے اچھل کود کے اور کچھ نہیں تھا۔

پھر وہ بے دم ہو کر گرنے لگے۔ یہ رقص اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ آخری مرد بھی بے دم ہو کر نہیں گر گیا۔ آخری مرد کے گرتے ہی ساز یک لخت تھم گیا مندر میں یوں خاموشی مسلط ہوگئی جیسے کبھی کوئی آواز گونجی ہی نہیں مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''اپنے اپنے پیالے تھام لو۔'' سادھو نے بلند آواز میں کہا۔ ''آج تمہیں دو چند خوراک ملے گی۔''

سب نے خوش ہو کر ایک نعرہ لگایا کالی ماتا کی جے اور ہال کے ایک کونے کی طرف بڑھ گئے۔ میں اس کونے کا جائزہ نہیں لے سکا تھا شاید اس لئے کہ تاریکی میں تھا میں نے گردن گھما کر انہیں دیکھنا چاہا لیکن ممکن نہ ہوا۔ پیالوں کا مطلب البتہ میں سمجھ گیا تھا یہ سب انسانی خون پینے کی تیاریاں تھیں۔ چبوترے کے ایک طرف بنے ٹب نما گڑھے کا مقصد بھی اب میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ شہ رگ سے نکلنے کے بعد خون سیدھا اس ٹب کا رُخ کرتا اور اس ٹب میں سے یہ پیالے بھر بھر کر پیتے۔ میں لرز کر رہ گیا۔ اُف خدا ان لوگوں کو گاؤں میں بسنے کی اجازت دے کر بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی تھی۔ یہ سب تو اس قابل تھے کہ انہیں فوراً تہ تیغ کر دیا جاتا۔ ان کے گھروں کو آگ لگا دی جاتی۔ سادھو نے دیوار کے ساتھ ٹنگی ہوئی تلوار اُتار کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی۔ موت کا لمحہ آ پہنچا تھا سادھو تلوار کے ایک ہی وار سے ہم دونوں کی گردنیں اُڑانے والا تھا اس وقت میرے دل سے دعا نکلی یا خدا ہماری مدد کر۔

دعا میں تاثیر تھی یا کیا بات تھی، بجلی کا ایک کڑاکا ہوا، پورے کا پورا مندر اس طرح ہلا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ وہ سب کے سب لڑکھڑائے سادھو نے بڑی مشکل سے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا اور پھر ان پر گویا سکتے کا عالم طاری ہوگیا۔ مندر کا دروازہ ایک زور دار دھماکے سے کھلا تھا اور میں نے دیکھا قبلہ والد چلے آ رہے تھے۔ کوئی ان کے راستے میں نہ آ سکا ان پر وار نہ کر سکا۔ وہ سب بُتوں کی طرح کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ والد منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے نہایت اطمینان سے ہماری رسیاں کھولیں حالانکہ ان سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر سادھو ہاتھ میں وہ خوفناک تلوار لئے کھڑا تھا مگر شاید اس کے ہاتھوں میں سکت نہیں رہ گئی تھی رسیاں آناً فاناً کھل گئیں ہم اُٹھ کھڑے ہوگئے۔ والد مندر کے دروازے کی طرف چل پڑے اور ہم دونوں ان کے پیچھے چلتے ہوئے مندر سے باہر آ گئے۔ مندر سے باہر آ کر ہم نے دیکھا والد وہاں نہیں بھی نہیں

تھے۔ ہم سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ اپنے پیچھے ہم نے چیخوں کی آواز سنی شاید وہ لوگ ہمارا تعاقب کررہے تھے لیکن اب ہم ان کی پہنچ سے باہر تھے۔ آخر گرتے پڑتے ہم اپنی حدود میں داخل ہوگئے۔ یہاں ہر طرف سناٹا تھا سب لوگ سوئے پڑے تھے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کالی مائی کے مندر میں کیا واقعہ پیش آچکا ہے۔ میں سلیم کو ساتھ لئے اپنے گھر میں چلا آیا ہمیں حیرت اس پر تھی کہ والد یکا یک کہاں غائب ہوگئے تھے۔

ہم گھر میں داخل ہوئے تو والد بے چینی کے عالم میں ٹہل رہے تھے ہمیں دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکلا ''خدا کا شکر ہے تم آگئے۔ مجھے روپا نے آکر اطلاع دی تھی کہ تم مندر میں پھنس گئے ہو۔'' ہم دونوں یہ سن کر بہت حیران ہوئے۔ ہمارے چہروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا ''حیران ہونے کی ضرورت نہیں میں گھر سے نہیں نکلا البتہ میں نے اپنی روحانی طاقت سے کام ضرور لیا تھا۔''

ہم دھک سے رہ گئے۔ دوسرے دن صبح سویرے والد محترم نے سادھو کو پیغام بھجوا دیا کہ وہ اور اس کے ساتھی گاؤں خالی کردیں۔ مگر سادھو نے نہایت ڈھٹائی سے کہلوا بھیجا کہ وہ گاؤں خالی نہیں کریں گے اور یہ کہ رات وہ مقابلے کے لئے تیار نہیں تھا ورنہ انہیں کامیاب نہ ہونے دیتا اب وہ ہر طرح تیار ہے۔ یہ سُن کر والد بڑبڑائے گویا مقابلہ ہوگا۔

سادھو کے پاس کالی قوتیں تھیں اور میرے والد کے قبضے میں نوری قوتیں۔ کالی قوتیں بُرائی کی اور نوری قوتیں نیکی کی مظہر ہیں لہٰذا یہ جنگ نیکی اور بدی کی جنگ تھی۔ کالی قوتوں کو عام طور پر حصول شہرت اور دولت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس راستے میں بہت کشش ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے پیروکاروں میں دولت مندوں کی بڑی تعداد ہوتی ہے۔ یہ لوگ مزید دولت حاصل کرنے کی خاطر کالی قوتوں کو اپنے قبضے میں کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔

سادھو ان قوتوں کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس نے ان سے سب سے پہلا کام یہ لیا کہ دریائے میگھنا کا کنارہ توڑ دیا۔ دریائے میگھنا گاؤں سے صرف چار پانچ میل دُور ہی تو بہتا تھا' بس پھر کیا تھا پورا گاؤں سیلاب کی لپیٹ میں آگیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ہندوؤں کے مکانات اور کالی مائی کا مندر سیلاب سے بالکل محفوظ تھے۔ چند گھنٹوں میں ہی ساری مسلم آبادی اور والد کی اپنے ہاتھوں تعمیر کی ہوئی مسجد بھی خطرے میں تھی۔ میرے والد بھی جلال میں آگئے' فوراً گھر سے باہر نکلے اور سیلابی پانی کی طرف بڑھنے لگے' ایک ڈھیلے پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور اسے سیلاب کے ریلے میں پھینک دیا۔ ردعمل حیران کن تھا۔ پانی فوراً سمٹنے لگا' یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بہت بڑی غیر مرئی قوت پانی کو واپس دریا میں دھکیلے دے رہی ہے۔ گاؤں کے سب لوگوں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صرف چند گھنٹوں میں سارا پانی سمٹ کر دریا میں سما گیا۔ دریا کا پانی معمول کے مطابق بہنے لگا اور کنارہ آپ ہی آپ اپنی اصلی حالت میں آگیا۔ سادھو کا یہ حملہ پوری طرح ناکام ہوگیا تھا۔

اس پر وہ اور بھی چراغ پا ہوگیا۔ ایک ہی دن میں اسے دو ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جب لوگوں نے دریا کو دیکھا تو اس کا سارے کا سارا پانی زمین میں جذب ہوگیا تھا اور اب پانی کے دریا کی جگہ ایک ریت کا دریا نظروں کے سامنے تھا' گویا سادھو دوبارہ سیلاب لانے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ اگر میرے والد پانی کو دریا میں رہنے دیتے تو سادھو دوبارہ دریائے میگھنا کے کنارے کو توڑنے کی

کوشش کرسکتا تھا۔ یہ اس کی شکست فاش تھی۔ طبقات الارض کے ماہرین اس موقع پر یہ توضیح پیش کرسکتے ہیں کہ بعض زمینیں ایسی ہوتی ہیں جن میں پانی جذب کرلینے کی استعداد ہوتی ہے۔ یہ درست سہی لیکن اس معاملے میں حقیقت یہ نہیں تھی کیونکہ حالات معمول پر آنے کے بعد انہوں نے پھر سے دریائے میگھنا کو جاری کردیا تھا۔

سادھو اب باقاعدہ مقابلے پر اُتر آیا۔ اس نے اپنی تمام تر کالی قوتوں کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کرلیا۔ ابھی مسلمان سیلاب سے بال بال بچے تھے کہ ایک ہولناک قسم کا زلزلہ شروع ہوگیا۔ زمین ہچکولے کھانے لگی' مکان ڈولنے لگے۔ کتنے ہی لوگ کھڑے کھڑے زمین پر گر گئے' کئی مکانوں میں دراڑیں پڑ گئیں' مٹی نیچے گرنے لگی اور یوں محسوس ہونے لگا کہ چشم زدن میں تمام مکانات منہدم ہوجائیں گے اور لوگ ان کے نیچے دب جائیں گے۔ ایک کہرام سا مچ گیا کوئی ادھر بھاگا جارہا تھا تو کوئی اُدھر' ہر کوئی خوفزدہ تھا۔ میرے والد باہر نکلے انہوں نے ایک مکان کی دیوار تھام کر قرآن شریف کی کوئی آیت پڑھی اور زلزلہ ایک دم رُک گیا۔ یہاں تک کہ جن مکانات میں دراڑیں پڑ گئی تھیں وہ دراڑیں بھی غائب ہوگئیں۔

سادھو دُور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا' جان گیا کہ اس کا یہ حربہ بھی ناکام رہا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے بدشکل اور ٹیڑھے میڑھے عصا کو ہوا میں لہرایا فوراً ہی اس میں سے ہزاروں سانپ جھڑے' اس نے عصا کا رُخ مسلمانوں کے گھروں کی طرف کردیا۔ تمام سانپ پھن اُٹھائے تیزی سے اس طرف بڑھے۔ والد صاحب زلزلہ رُکنے کے بعد اپنے حجرے میں چلے گئے تھے۔ لوگوں نے فوراً انہیں اطلاع دی کہ ہزاروں سانپ ہمارے گھروں کا رُخ کررہے ہیں۔ انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک رسی کا ٹکڑا لوگوں کو دیا اور اسے سانپوں کی طرف اُچھالنے کا حکم دیا۔ لوگ فوراً باہر آئے اور رسی کا ٹکڑا ہوا میں اُچھال دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیرت زدہ رہ گئے' رسی فضا میں ایک مہیب اژدھے کی شکل اختیار کرگئی تھی۔ اژدھا ہوا میں تیرتا ہوا ان سانپوں پر گرا اور پھر ان میں ایک زبردست جنگ شروع ہوگئی۔ تمام سانپوں نے اژدھے کو گھیر لیا تھا اور اپنے پھنوں سے اس پر وار کررہے تھے لیکن اژدھے پر ان کے زہر کا اثر نہیں ہورہا تھا۔ اژدھا انہیں اس تیزی سے نگل رہا تھا جیسے کوئی وہیل مچھلی چھوٹی بڑی مچھلیوں کو سانس کے زور سے کھینچ لیتی ہے۔ لوگوں کے دیکھتے ہی دیکھتے تمام سانپ اژدھے کے پیٹ میں اُتر گئے۔ اژدھا واپس ہوا اور سیدھا والد محترم کے حجرے میں گھس گیا۔ لوگ اس کے پیچھے اندر داخل ہوئے تو انہیں نے دیکھا وہاں رسی کا وہی ٹکڑا پڑا تھا۔

اس پر بھی سادھو باز نہ آیا' آخر میرے والد تنگ آگئے انہوں نے اس جھگڑے کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ چالیس دن تک چلہ کھینچتے رہے اور چلے کے زور سے کالی مائی کے مندر کے گرد ایک حصار کھینچ دیا' اس سلسلے میں انہوں نے اپنے پیرومرشد سے بھی مدد لی۔ وہ نفس نفیس تشریف لائے انہوں نے بھی مندر کے گرد سات چکر لگائے۔ لوگوں نے رات کے وقت انہیں چکر لگاتے ہوئے دیکھا' وہ سلہٹ میں موجود تھے۔ بہرحال انہوں نے حصار کی مضبوطی کے لئے اپنے شاگرد کی مدد ضرور فرمائی تھی۔ چکر لگانے کے بعد وہ غائب ہوگئے تھے۔ دوسرے دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا گاؤں اور مندر کا فاصلہ غیر محسوس طور پر بڑھنے لگا۔ مندر پہلے گاؤں کے آخری سرے پر تھا اب یہ ایک میل دُور چلا گیا۔ نالہ پہلے بالکل سیدھا تھا اب یہ مندر کے چاروں طرف گھوم گیا۔ یہیں سے اس کی ابتداء ہوتی ہے۔ حصار کھینچ جانے کے بعد کوئی ہندو مندر

تک نہ پہنچ سکا' ہندو اپنے سادھو کو لے کر سارا سارا دن مندر کی طرف چلتے رہتے لیکن کہیں نہ کہیں انہیں ٹھوکر ضرور لگتی وہ گر پڑتے اور واپس نالے کے دوسری طرف پہنچ جاتے۔

سادھو نے اس حصار کو توڑنے کے لئے اپنی تمام کالی قوتیں آزما ڈالیں لیکن اس حصار کو توڑ کر مندر تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ پھر ایک روز ایسا ہوا کہ انہوں نے مل کر نالے کو پار کیا اور حصار میں پھنس کر رہ گئے۔ اب ان کے لئے باہر نکلنے کا راستہ بھی نہ رہا تھا۔ یہ کام بھی والد صاحب نے کیا تھا کیونکہ وہ سب خونی تھے انہوں نے بے گناہ انسانوں کو بھینٹ چڑھایا تھا اس لئے انہیں سزا ملنا ضروری تھا۔ وہ کئی دن تک حصار کے گرد چلتے رہے بھوکے پیاسے گرتے پڑتے مندر تک پہنچنے یا نالے سے اس طرف آنے کی کوشش کرتے رہے پھر بھوک اور پیاس کی حالت میں تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ والد صاحب نے مٹی کی ایک مٹھی بھر کر حصار کے دوسری طرف پھینک دی۔ دوسری طرف بگولے سے اُٹھنے لگے بالکل ایسے جیسے صحرا میں چلتے ہیں اور پھر آناً فاناً ان بگولوں نے سادھو اور اس کے پیروکاروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دوسرے لفظوں میں وہ فنا ہوگئے۔

صرف چند گھر ہندوؤں کے باقی بچ گئے تھے جن میں ہندو موجود تھے وہ سادھو کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ ان میں روپا اور اس کے ماں باپ بھی تھے۔ دوسرے دن روپا اپنے ماں باپ اور چند دوسرے لوگوں کے ساتھ والد کے پاس آئی اور اسلام قبول کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مجھے یہ جان کر بے پناہ مسرت ہوئی کہ روپا اور اس کا خاندان مشرف بہ اسلام ہوگئے ہیں۔ میرے دل میں روپا کی محبت چٹکیاں لینے لگی۔ اب اس کا اور میرا ملاپ ممکن ہوگیا تھا۔ روپا کا اسلامی نام صائمہ رکھا گیا تھا ایک دن والد نے مجھے اپنے حجرے میں بلایا اور کہنے لگے ''مجھے معلوم ہے تم صائمہ سے شادی کرنا چاہتے ہو جاؤ یہ شادی ضرور ہوگی۔'' کرنا خدا کا کیا ہوا کہ خود روپا کے والدین نے دو ایک آدمیوں کے ذریعے اس خواہش کا اظہار کیا اور پھر ہماری شادی ہوگئی۔

آج اس واقعہ کو چالیس سال گزر چکے ہیں مندر کا حصار بُوں کا ٹوں موجود ہے حالانکہ والد آج اس دنیائے رنگ و بو میں موجود نہیں۔ وہ عالم بالا میں پہنچ چکے ہیں۔ لیکن مندر تک پہنچنا اب بھی ممکن نہیں نہ جانے اس وقت تک کتنے لوگ اس واقعہ کو سُن سُن کر مندر تک پہنچنے کی کوشش کر چکے ہیں اور تھک ہار چکے ہیں یہاں تک کہ ایک انگریز ڈپٹی کلکٹر بھی اس گاؤں میں آیا۔ اس نے مندر کو اندر سے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو لوگوں نے اسے بتایا کہ وہ مندر تک نہیں جاسکتا۔ وہ نہ مانا اور اپنی سی کرکے دیکھ لی۔ اس نے اپنی ناکامی کی داستان نہایت دلچسپ پیرائے میں کلکتہ گزٹ میں چھپوائی تھی۔ کلکتہ گزٹ کا وہ شمارہ میں نے بھی خریدا تھا وہ آج تک ہماری لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے کوشش کی آج تک سب حیرت زدہ ہیں اور کوئی اس راز کو حل نہیں کرسکا کہ وہ کونسی طاقت ہے جو لوگوں کو مندر تک نہیں پہنچنے دیتی اور انہیں اٹھا کر واپس پٹخ دیتی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف تاویلیں ضرور پیش کی گئیں لیکن کوئی بھی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا شاید آئندہ آنے والی نسلوں میں سے کوئی اس راز کو جان سکے۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی یہ کہانی ختم ہوگئی تھی ڈائری کے باقی صفحات خالی تھے۔ کہانی ختم ہوئی تو میں جیسے ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آیا۔ ڈائری پڑھتے وقت مجھ پر یہی احساس چھایا رہا تھا جیسے کہانی خود مجھ پر گزر رہی ہے جیسے میں خود ہی قربان گاہ کے چبوترے پر لیٹا تھا اب ہوش میں آیا تو شاہد علی کا خیال آیا وہ مجھے چھوڑ کر نہ جانے کہاں

چلا گیا تھا۔ لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی' آنکھ کھلی تو شاہد علی کرسی پر بیٹھا نظر آیا اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

''کیوں دوست..... کہانی پڑھ لی اب کیا خیال ہے کیا اب بھی تم مندر تک جانے پر بضد ہو؟'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''نہیں اس وقت تو نہیں البتہ میں چند روز بعد پھر گاؤں آؤں گا اور یہ کوشش کم از کم ایک بار اور کرونگا۔''

''کیا مطلب؟'' شاہد علی بُری طرح چونکا۔ شاید اسے ایسے الفاظ سننے کی خواب میں بھی توقع نہیں تھی۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اب میں اپنے ارادے سے باز آجاؤں گا۔ حقیقت بھی یہی تھی میں ارادے سے باز ضرور آ گیا تھا لیکن اس کے باوجود ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا ''سنو دوست شہر میں میرا ایک دوست ہے اس کے والد ملک کے سب سے بڑے سائنس دان ہیں انہیں جا کر یہ ساری کہانی سناؤں گا اگر انہوں نے زحمت گوارا کی اور یہاں تک آنا منظور کیا تو میں ان کے ساتھ ایک بار پھر نالے کو پار کروں گا۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔''

شاہد علی ہنس پڑا اور اس نے مجھے ایسا کرنے کی بڑی خوشی سے اجازت دیدی۔ پھر بولا ''تم یہ بھی کر کے دیکھ لو اس کہانی کے سلسلے میں صرف ایک بات اور رہ گئی ہے مگر میں وہ بات تمہیں اس کوشش کے بعد ہی بتاؤں گا۔''

گاؤں کی سیر کو ملتوی کر کے میں شہر پہنچا پہلے اپنے دوست سے ملا اور پھر اسے ساتھ لے کر اس کے والد کے سامنے پیش ہوا۔ وہ بہت بوڑھے تھے ان کا نام پروفیسر جمال تھا۔ میں نے انہیں ساری کہانی تفصیل سے سنائی وہ سوچ میں ڈوب گئے پھر بولے۔

''یہ سب ناممکن نہیں ہپناٹزم ہمارے سامنے کی چیز ہے اس قسم کی کچھ اور پراسرار قوتیں بھی ہیں جو انسان مسلسل کوشش کے بعد خود میں پیدا کر لیتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بھی جادوگر تھے وہ بھی غالباً ہپناٹزم سے کام لیتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں بھی جادوگروں نے رسیوں کو سانپوں میں تبدیل کر دیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے اژدھے کی شکل اختیار کی تھی یہ بھی یقیناً ہپناٹزم کی کسی ترقی یافتہ شکل کا ہی مظاہرہ تھا۔ جہاں تک اس حصار کا تعلق ہے میں حتمی طور پر کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ اولیاء کرام کی کرامات سے کتابیں بھری پڑی ہیں ان کا منکر نہیں۔ اگر تم ضرور ہی چاہتے ہو تو میں تمہارے ساتھ گاؤں تک چلوں گا اور اپنے ساتھ چند آلات بھی لے چلوں گا تاکہ ہم یہ اندازہ لگا سکیں کہ وہ کیا چیز ہے جو لوگوں کو اُٹھا کر نالے کے دوسری طرف پھینک دیتی ہے۔'' میں بہت خوش ہوا کہ وہ تیار ہو گئے۔

دوسرے دن ہم گاؤں پہنچ گئے' شاہد علی کو اطلاع نہیں دے سکا تھا اس لئے وہ سٹیشن پر موجود نہیں تھا۔ ہم ٹانگے پر بیٹھ کر اس کے گھر پہنچ گئے' کچھ دیر ستانے کے بعد آخر تینوں نالے کے پاس پہنچے چھلانگ لگا کر ہم نے نالہ پار کیا۔ پروفیسر جمال نے اپنے آلات کندھے پر لٹکا رکھے تھے اور دو ایک چیزیں ان کے ہاتھوں میں بھی تھیں۔ ہم نہایت احتیاط سے قدم اٹھانے لگے۔ دل دھک دھک کر رہے تھے پروفیسر کی نظریں بدستور آلات پر تھیں ان کے چہرے پر اچانک حیرت کی لکیریں اُبھریں' ساتھ ہی تینوں نے ٹھوکر کھائی اور ہم نالے کے دوسری طرف پڑے تھے۔

''اُف خدا..... اس مندر کے چاروں طرف مقناطیسی قسم کی لہریں موجود ہیں۔ یہ لہریں ہی ہمیں اُٹھا کر پھینکتی ہیں۔'' ان کے منہ سے نکلا۔

''لیکن اس سے پہلے ہم گرتے کیوں ہیں؟''

''ہم یہی محسوس کرتے ہیں جیسے ٹھوکر لگی ہے لیکن دراصل ہوتا یہ ہے کہ مقناطیس ہمیں ایک زبردست جھٹکے سے اُٹھا کر پھینک دیتا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ میں نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا اور شاہد علی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ دوسرے ہی لمحے ہم نے ایک ایسا حیران کن منظر دیکھا کہ ہمارے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔ میرا اور پروفیسر جمال کا وہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

مندر کی طرف سے ایک عورت چلی آ رہی تھی اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ نالے تک پہنچ گئی پھر ایک چھلانگ اسے نالے کے اس طرف لے آئی۔ ہم نے دیکھا وہ گاؤں کی طرف چلی جا رہی تھی۔

''یہ ...... یہ کون ہے؟'' میرے منہ سے بوکھلاہٹ کے عالم میں نکلا۔

''یہ واحد ہستی ہے جو اس حصار کے دوسری طرف مندر تک جا سکتی ہے۔ آؤ' اس کے پیچھے چلتے ہیں۔'' شاہد علی نے مسکرا کر کہا۔

ہم اس کے پیچھے چل پڑے اور پھر میں دھک سے رہ گیا وہ شاہد علی کے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ اسی وقت میں نے اپنے دوست کو کہتے سُنا ''یہ میری بہن شائل ہے' جب آپ لوگ ستا رہے تھے تو میں نے اسے مندر کی طرف بھیج دیا تھا۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ یہ ابھی چھوٹی ہی تھی اور اسے حصار کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا ایک دن کھیلتے کھیلتے نالے تک پہنچ گئی۔ مجھے آج بھی حیرت ہے کہ تین چار فٹ چوڑے نالے کو اس نے کیسے پار کر لیا تھا۔ میں اسے تلاش کرتا ہوا نالے کے پاس پہنچا تو یہ مندر کی طرف سے واپس آ رہی تھی اور اس دن مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ دنیا میں ایک ہستی ایسی بھی موجود ہے جو مندر تک جا سکتی ہے۔''

''تو...... تو کیا وہ مندر کے اندر بھی جا سکتی ہے؟''

''نہیں...... اس کا کہنا ہے کہ مندر کا دروازہ بالکل بند ہے اور اس کے کھولنے پر بھی نہیں کھلا۔'' میں نے پروفیسر جمال کی طرف دیکھا' ان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ مقناطیسی لہروں والا خیال بھی غلط ہے ورنہ لہروں نے آپ کی بہن کو کیسے گزر جانے دیا۔ میری عقل اس بات کا کوئی جواب دینے سے عاجز ہے۔ ویسے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس لڑکی کا مندر سے کیا تعلق ہے؟''

''جی ہاں' ہم اس ماں کی اولاد میں سے ہیں جس نے قربانی کی رات دو بے گناہ انسانوں کو بھینٹ چڑھنے سے بچا لیا تھا۔''

اور میں سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس اسرار سے قیامت تک کوئی پردہ نہیں اُٹھا سکتا تھا کہ وہ کونسی طاقت ہے جو لوگوں کو مندر تک نہیں پہنچنے دیتی اور جو شائلہ کا راستہ نہیں روکتی۔ دوسرے دن ہم نے واپسی کی ٹھانی۔ دروازے میں سے نکلتے وقت میں نے شاہد علی سے کہا' ''میں نے اس مندر کو فتح کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ بُری طرح چونکا۔

''مطلب تم بہت جلد سمجھ جاؤ گے۔ چند دنوں تک میں اپنی والدہ کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔'' یہ کہہ کر میں پروفیسر صاحب کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا...... شاہد علی شاید میری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا اس کے چہرے پر میں نے ایک خوشگوار تاثر ابھرتے دیکھا' اسی وقت تانگہ چل پڑا۔

pakistanipoint.com

شہر پناہ

دھوم کیتو

عثمان سیٹھ نے پرزہ ہاتھ میں لے کے پڑھا۔ ''پیارے نظیر..... بہو تجھے طعن کرے گی کہ تیری ماں نے کوئی خراب کام کیا ہوگا اس لئے کسی عزیز نے ناک کاٹ لی مگر یہ بات نہیں ہے بیٹا' اپنی جوانی اور تیرے بچپن دونوں کی ایک ساتھ حفاظت کے لئے میں نے اپنے ہاتھوں یہ کام کیا تھا۔''

ایک حسین عورت کی کہانی جو کبھی شکایت نہیں کرتی تھی

شمیم کام کرنے آتی تو سارے وقت کچھ نہ کچھ گنگناتی رہتی۔ وہ برتن مانجھتے وقت گاتی' پوتڑے دھوتے وقت گاتی' مکان میں صفائی کرتے وقت گاتی' حتیٰ کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کرسی رکھتے وقت بھی گاتی۔ اسے آپ کتنا ہی زیادہ کام سپرد کردیں' کیا مجال کہ وہ چہرے سے ناگواری ظاہر ہونے دے لیکن اگر آپ اسے گانے سے باز رکھیں گے تو وہ کام ضرور کرتی رہے گی مگر اس طرح بے جان سی نظر آئے گی گویا اس کے جسم سے روح علیحدہ کرلی گئی ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اسے کسی کام

کو کہا گیا ہو اور اس نے انکار کردیا ہو۔ چوہا مر جائے اور اس سے اسے پھینکنے کو کہا جائے تو وہ بخوشی پھینک دے گی۔ کیسے ہی سوال کا جواب دینا ہو اس کی شیری زبان سے پہلا لفظ جی نکلتا لیکن جب اس کا دو سالہ لڑکا نظیر اس کے ہمراہ ہوتا اور نظیر کی دل جوئی نہ کی جاتی تو شمیم منہ سے کچھ نہ کہتی مگر غمگین اور دلبرداشتہ ہوجاتی۔ گانا خود بخود بند ہوجاتا بعض آدمی اپنا کام دلچسپ بنانے کے لئے اکثر گاتے ہیں اسی طرح شمیم بھی بہت آہستہ مگر دلکش آواز میں گاتی تھی۔

سیٹھ عثمان کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ شمیم ان کی ملازمہ تھی گھر کا تمام کام کاج شمیم کو کرنا پڑتا تھا وہ جوان اور خوبصورت تھی۔ سیٹھ عثمان نے اس کے ساتھ دل لگی اور خوش فعلیوں کا آغاز کیا مگر ابھی بات زیادہ بڑھنے نہ پائی تھی کہ نئی سیٹھانی آگئیں۔

نئی سیٹھانی بھی دو سالہ لڑکا چھوڑ کر مرگئیں۔ شمیم بدستور ملازمت کرتی رہی۔ وہ چوبیس گھنٹے کام کرتی' چھٹی کے روز زیادہ کام کرتی۔ اسے کام میں دلچسپی لینے کی عادت ہوگئی تھی۔ انہی دنوں اس کا شوہر چل بسا اور دو سالہ لڑکا نظیر یتیم ہوگیا مگر شمیم کی وضع داری میں فرق نہ آیا۔

نظیر ایک نوکرانی کا لڑکا تھا سیٹھ عثمان کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ وہ ان کے لڑکے کے ساتھ کھیلے اگرچہ اب شمیم بھی تنہا تھی اور وہ خود بھی تنہا تھے اور انہیں خود بڑے لڑکوں کی طرح کھیلنے میں اعتراض نہیں' حکام' قانون صرف رعایا کیلئے بناتے ہیں اور اپنے لئے راستہ کھلا رکھتے ہیں' اسی طرح بڑے آدمی چھوٹے آدمیوں کے لئے قانون بناتے ہیں اور خود کو مستثنیٰ خیال کرتے ہیں۔ عورت کو مرد کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ محبت آمیز عشوؤں اور دل فریب اداؤں سے مرد کو لبھا سکتی ہے' مرد کو عورت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ اپنی فیاضی کا ثبوت دے سکتا ہے۔ لہٰذا سیٹھ کے اس اعتراض میں رفتہ رفتہ کمی آنے لگی کہ ان کا لڑکا نظیر کے ساتھ نہ کھیلے۔ کمی آتے آتے اعتراض ہی جاتا رہا۔ عنایات کی بارش ہونے لگی۔ شمیم لے یہ نظیر کو دے دے' ہوتے ہوتے سیٹھ صاحب بالکل ریشہ خطمی ہوگئے۔ طرح طرح محبت کی پینگ بڑھانے لگے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ شمیم ہمیشہ گاتی ہے مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ آج کل زیادہ گانے لگی ہے۔ انہوں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ شمیم کا گانا یا تو نظیر کے لئے ہے یا وہ اپنی خاطر گاتی ہے۔ یہ کیفیت سمجھنے کے باوجود انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ ایک دن شمیم سے بولے ''شمیم اب میں کیا کروں جس سے شادی کرتا ہوں وہ مر جاتی ہے۔'' شمیم کوئی جواب دیئے بغیر ہنستی رہی۔ سیٹھ صاحب نے کہا ''تو رانڈ اور میں رنڈوا ہوگیا ہوں اپنی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔''

شمیم نے ہنسنا بند کردیا' اس کی نظر سیٹھ کے چہرے سے گزرتی ہوئی نظیر پر جا کر ٹھہری۔ وہ سیٹھ کے انداز تاڑ گئی تھی اس چھیڑ چھاڑ کا مطلب اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔

سیٹھ چند لمحوں تک اسے تکتے رہے پھر کہنے لگے ''بولتی کیوں نہیں شمیم کیا تجھے پہلی سیٹھانی کا زمانہ یاد آرہا ہے۔'' پہلی سیٹھانی کے زمانے میں شمیم جوان تھی اسے سیٹھ کی اس وقت کی خوش فعلیاں یاد آگئیں۔ اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ سیٹھ نے بھی یہ بات محسوس کرلی انہوں نے فوراً برفی کا ایک ٹکڑا شمیم کی طرف بڑھایا ''لے شمیم یہ نظیر کو دے دے۔''

شمیم نے برفی کا ٹکڑا اس طرح لیا جیسے شکاری کی آہٹ پاکر ہرن چوکنے ہوجاتے ہیں۔ سیٹھ کی بدلی ہوئی نظر سے اسے احساس ہوا کہ جس جگہ ملازمت میں اتنا عرصہ گزرا ہے اب وہاں کی زمین پاؤں کے نیچے سے نکلی جارہی ہے۔ وہ مستقبل کے خیال سے کانپ اٹھی۔

شمیم جن حالات سے گزر رہی تھی ان سے گزرنے والا انسان بسا اوقات غیر فانی اخلاقی جرأت کا مالک بن جاتا ہے۔ گویا اتنی سی تعلیم اس میں قوت ارادی پیدا کردیتی ہے۔ جب وہ جوان تھی' سیٹھ عثمان اس کی قربت کے لئے کوشاں تھے کبھی نادانستگی میں رخسار بھی چوم لیا ہوگا۔ یا کبھی ٹھیس کے بہانے اس کے بدن سے دانستہ مس بھی کیا ہوگا۔ شمیم یہ تمام حرکتیں خندہ پیشانی سے برداشت کرلیتی تھی لیکن شاید اسی سبق سے اس میں اپنی حفاظت کا اور آنے والے واقعات کی نزاکت کا احساس پیدا ہوگیا تھا۔ وہ مردوں کے ساتھ کام کرنے والی مزدور پیشہ عورتوں کی طرح ہنس مکھ اور ملنسار بن گئی تھی۔ ایسی عورتوں کو مردوں کے ساتھ آزادی سے ہنسنے بولنے' خود کو محفوظ رکھنے' حد سے تجاوز نہ کرنے اور حسن تدبیر سے کام لے کر مردوں کو بنانے میں مہارت حاصل ہوجاتی ہے۔ شمیم کو بھی یہ مہارت حاصل ہوگئی تھی مگر سیٹھ نے اس کی یہ مہارت' رضامندی پر محمول کی اور جب شمیم کا بیاہ ہوا تو عثمان سیٹھ بے حد خوش ہوئے۔ یہ خوشی اس لئے نہیں تھی کہ شمیم کو اب چین کی زندگی نصیب ہوگئی ہے یا اسے اچھا بر مل گیا ہے' سیٹھ کی یہ خوشی فریب کارانہ اور خود غرضانہ تھی۔ مبادا سیاہ کاری کا کوئی خراب نتیجہ رونما ہو تو فکر نہیں' شمیم اب شادی شدہ ہے۔ سیٹھ کی نیک نامی پر حرف نہیں آئے گا۔ دنیا انگشت نمائی نہ کرسکے گی۔ سماج میں رہ کر وہ باعزت طریقے سے شمیم کے ساتھ خفیہ تعلقات قائم رکھ سکیں گے۔ یہ شادی ان کی سیاہ کاری کی پردہ پوش ہوگی لیکن ان کی یہ خوشی بے سود ثابت ہوئی شمیم نے کبھی انہیں حد سے تجاوز نہ کرنے دیا۔

شمیم کا منگیتر ایک غریب آدمی تھا۔ اس نے اپنے بڑے بھائی یعنی شمیم کے جیٹھ سے ساڑھے چار سو روپے قرض لے کر شادی کی تھی۔ قرض اس شرط پر ملا تھا کہ جب تک یہ رقم ادا نہ ہوجائے شمیم شوہر کے ساتھ نہیں رہے گی بلکہ جیٹھ کے ہاں رہے گی۔ گویا قرض کی ادائیگی تک شمیم کی رخصتی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کڑی شرط کے باعث دونوں میاں بیوی شادی کے باوجود محض خیالی لطف حاصل کررہے تھے۔ شمیم اور اس کا شوہر آپس میں ملتے تو شوہر کہتا ''میرا جی ہر وقت تجھ میں لگا رہتا ہے' تُو چاند کی طرح خوبصورت ہے اس کا تو مجھے گمان بھی نہ تھا۔ اگر پہلے معلوم ہوتا تو دو سال پیشتر ہی محنت مزدوری کرکے پیسہ پیسہ جوڑ کے اتنی رقم جمع کرلیتا مگر اب ہم دونوں مل کر محنت کریں گے اور قرض کے بوجھ سے نکل جائیں گے۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب ہم ایک ساتھ اُٹھیں گے' ایک ساتھ بیٹھیں گے' مزے اُڑائیں گے اور سکھ چین کی زندگی بسر کریں گے۔''

شمیم عثمان سیٹھ کے گھر ایسی لگن سے کام کرتی جیسے کسی عظیم مقصد کے لئے جدوجہد کررہی ہو۔ وہ گاتے ہوئے کام کرتی اور کام کرتے ہوئے گاتی۔ ہر ہر لمحہ وصال کے خوش آیند لمحے سے نزدیک تر ہوتا جاتا۔ وہ اُمنگ اور حوصلے سے کام

کرتی مگر سیٹھ کے سائے تک سے بچتی۔ وہ پائی پائی کا حساب رکھتی مگر نظر عنایت کا پیسہ واپس کردیتی۔ ہر کام میں وہ مستعدی ظاہر کرتی مگر اپنی حفاظت کے لئے اس نے گویا چاروں طرف پہرے بٹھا دیئے تھے۔ سیٹھ عثمان کی ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ شادی سے پہلے سیٹھ کے مذاق برداشت کرنے والی شمیم آج بھی ویسی ہی ہنس مکھ اور زندہ دل تھی مگر اب وہ اپنی اس قدر حفاظت کرتی تھی کہ انہیں جرأت ہی نہ ہوسکی۔

شمیم کے شوہر نے رات دن ایک کرکے پیسے جمع کئے' شمیم نے جیٹھ اور جیٹھانی کے دل موہنے کے ساتھ ساتھ جس قدر ہوسکا' کام کاج کیا۔ اس طرح دونوں نے دو برس میں ساڑھے چار سو روپے ادا کردیئے مگر اتنی مشقت کے بعد شمیم کا سہاگ مشکل سے تین سال قائم رہا پھر اس کا شوہر مرگیا۔ شمیم تنہا رہ گئی اور دو سالہ بچے کی حفاظت کا بار بھی اس کے سر پر آپڑا۔ شمیم کام کاج کے علاوہ ہوشیاری سے ملازمت قائم رکھنے کی کوشش کرتی تھی' اسے سیٹھ سے بچنا تھا اور اسی کے ہاں کام بھی کرنا تھا۔ اسی اثنا میں سیٹھ کی دوسری بیوی دو سال کا ایک بچہ چھوڑ کر انتقال کرگئی۔ رنڈوا سیٹھ' بیوہ شمیم اور دو چھوٹے چھوٹے بچے جملہ چار لوگ رہ گئے تھے۔

شمیم نے بھانپ لیا تھا کہ سیٹھ کی وہ ہوس پھر اُبھر آئی ہے جو بیویوں کی زندگی میں دبی ہوئی تھی۔ سیٹھ اب اپنی ہوس کے اظہار میں جرأت مند بھی ہوتا جارہا تھا۔ شمیم کو ملازمت' لڑکے کی پرورش اور اپنی حفاظت یہ تینوں کام انجام دینے تھے نیز سیٹھ کے لڑکے کے لئے بھی اس کے دل میں ماتا پیدا ہوگئی تھی لہٰذا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ سیٹھ کے ہاں مستقل کام کرتی رہے گی۔ یہ فیصلہ کرکے اس نے اطمینان تو حاصل کرلیا مگر وہ جہاں ایک قدیم ملازمہ کی حیثیت سے اپنی عصمت سلامت رہنے کی امید رکھتی تھی وہاں ہوس کی فراوانی دیکھ کر اس کا دل کانپ اُٹھتا تھا۔

یہ عصمت مآبی اس نے اپنے دل کے استحکام سے حاصل کی تھی جب وہ اور اس کا شوہر شرط کی رو سے الگ الگ رہنے پر مجبور تھے اس وقت اس کا شوہر ہفتے عشرے میں ایک بار اپنے بڑے بھائی کے گھر پہنچتا مگر شمیم سے ملنے میں آزادی سے کام نہ لیتا' گردن نیچی کئے بیٹھا رہتا اور روپے ادا کرکے چلا جاتا۔ دوسرا ہفتہ آتا تو دوسری قسط ادا کر جاتا اور تیسرے ہفتے تیسری قسط۔ شوہر کے شریفانہ خلوص اور محبت پرستی نے شمیم کو محنت مزدوری کرکے قرض جلد ادا کرنے کی طرف آمادہ کیا تھا۔ دونوں صدق دل سے کمانے میں منہمک رہے۔ رقم ادا کرنے سے پہلے دونوں نے اپنے جذبات پر قابو پانے میں تعریف کے لائق کامیابی حاصل کرلی تھی۔ محنت و مشقت میں وقتی جذبات سرد ہوگئے اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ایک سچا' ایک نیا جوبن رس نتھر رہا ہو۔ اس طرح وہ انتظار کی گھڑیاں لطف و کیف سے گزارتے رہے۔ شمیم اس کسوٹی پر کھری ثابت ہوئی' اس کی زندگی خالص سونے کے مانند ہوگئی۔ سیٹھ عثمان کا مسخرا پن اسے نہایت ناگوار معلوم ہونے لگا۔ اس کا سبب محض یہ تھا کہ اس کے خانہ دل میں شوہر کے سوا کسی دوسرے کی محبت کی گنجائش ہی نہ تھی۔ کبھی کبھی جھلا کے وہ سوچتی کہ ملازمت بدل دے مگر یہ خیال بے کار تھا مبادا دوسری جگہ بھی سیٹھ عثمان ہی جیسا سیٹھ ملے۔ وہ یہاں سے ہٹی تو نظیر کی پروری کا

آسرا بھی نہ رہے گا یہاں تو نظیر سیٹھ کے لڑکے کے ساتھ کھیلتا اور کھاتا پیتا تھا۔ نیز سیٹھ کا لڑکا بھی شمیم سے ہل گیا تھا۔ انہی وجوہ سے پرانی جگہ کو چھوڑنے کے خیال سے شمیم کا دل کانپ اُٹھتا تھا اسے کیا کرنا چاہئے؟ اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کرلیا۔

کچھ دنوں بعد ایک عجب حادثہ پیش آیا۔ ایک صبح شمیم کی ناک کٹی ہوئی پائی گئی۔ معلوم ہوا رات کو کسی رشتے دار نے اگلی دشمنی کی وجہ سے اس کی ناک کاٹ ڈالی۔ ناک کے ساتھ شمیم کی خوبصورتی بھی رخصت ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیٹھ کی گفتگو میں مزاح کی چاشنی نہ رہی۔ شمیم کے لئے یہ حادثہ مبارک ثابت ہوا وہ سیٹھ کے التفات سے بچ گئی۔ بعد میں وہ جب کبھی اس واقعہ کا ذکر کرتی تو مزے لے لے کے کہتی ''موئے نے منہ میں کپڑا ٹھونس کر کھیرے کی طرح ناک کاٹ لی۔'' عثمان سیٹھ سُن سُن کر ہنستے۔ وہ شمیم کو پرانی خادمہ سمجھ کر مہربانی سے نباہتے رہے مگر نظیر کو اب مٹھائی دینا انہوں نے موقوف کردیا۔ اپنے لڑکے کو اس کے ساتھ کھیلتا ہوا دیکھ لیتے تو آنکھیں بنا کر اسے منع کردیتے۔ شمیم یہ سب باتیں دیکھی ان دیکھی کردیتی اور گنگناتی ہوئی اپنے کام میں مستعدی سے محو رہتی۔ گانا اور کام کرنا کام کرنا اور گانا اس کے یہی دو مشغلے رہ گئے تھے۔ اگرچہ اب اس کا گانا اگلے گانے کا منہ چڑاتا تھا مگر دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا کہ اس عورت پر کبھی کوئی مصیبت نازل ہی نہیں ہوئی کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا۔ اس طرح شمیم نے برسوں گزار دیئے

موت کسی کو مہلت نہیں دیتی

ایک بادشاہ تھا جس کا ارادہ اپنی مملکت کی زمین کی سیر اور حال دیکھنے کا ہوا۔ اس نے شاہانہ جوڑا منگوایا۔ ایک جوڑا لایا گیا وہ پسند نہ آیا۔ دوسرا منگوایا وہ بھی پسند نہ آیا، غرض بار بار رد کرنے کے بعد نہایت پسندیدہ جوڑا پہن کر سواری منگوائی گئی۔ ایک عمدہ گھوڑا لایا گیا۔ پسند نہ آیا' اس کو واپس کردیا۔ دوسرا منگوایا وہ بھی پسند نہ آیا۔ غرض سارے گھوڑے منگوائے گئے۔ ان میں سے اپنی پسند کا گھوڑا لے کر سوار ہوا۔ شیطان مردود نے اور بھی نخوت اس کے ناک میں پھونک دی۔ وہ نہایت تکبر سے سوار ہوا' خدا م کی فوج پیادہ اس کے ساتھ چل رہی تھی' اور وہ بڑائی اور تکبر سے رعایا کی طرف التفات بھی نہ کرتا تھا۔ راستے میں چلتے چلتے ایک شخص نہایت سادہ خستہ حال ملا' سلام کیا۔ بادشاہ نے توجہ بھی نہ کی۔ خستہ حال نے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ بادشاہ نے کہا ''اچھا صبر کر جب میں سواری سے اُتروں گا تب بات کرلینا۔'' اُس شخص نے کہا ''نہیں ابھی کام ہے۔'' یہ کہہ کر زبردستی لگام چھین لی۔ پھر اُس نے بادشاہ کے قریب ہوکر کہا ''میں ملک الموت ہوں اور تیری جان لینے آیا ہوں۔'' یہ سُن کر بادشاہ کا رنگ فق ہوگیا' دماغ چکرانے لگا' زبان لڑکھڑا گئی۔ کہنے لگا۔ ''اچھا مجھے اتنی مہلت دے دے کہ میں گھر جا کر اپنے سامان کا نظم کرلوں اور گھر والوں سے مل لوں کچھ بات کرلوں۔'' اس نے کہا ''اب مہلت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اس کی روح قبض کرلی۔ وہ گھوڑے سے لکڑی کی طرح نیچے گر گیا۔

ایک دن ایسے ہی بغیر بتائے بغیر اطلاع دیئے موت ہمیں آدبوچے گی۔ کیا ہم نے اس وقت کے لئے کوئی تیاری کی ہے۔ اس کے بعد جہاں رہنا ہے وہاں کا کچھ سامان کیا ہے؟ اگر نہیں تو پھر ابھی سے تیاری شروع کر دیں کیونکہ موت کسی کو مہلت نہیں دیتی۔

جوانی بھی رخصت ہوگئی۔

نظیر کی شادی ہوگئی' بہو گھر میں آئی تو فساد کی بنیاد پڑی۔ نظیر کی بیوی میں کوئی عیب نہیں تھا مگر وہ بڑی چڑ چڑی تھی۔ نکٹی ساس کو دیکھ کر خوب ناک بھوں چڑھاتی۔ یہ امر اُسے اپنی توہین معلوم ہوتا تھا کہ جس نے ناک کٹوائی ہو وہ اس پر حکم چلائے۔ اس نے دوچار بار ساس سے دو بدو کہہ بھی دیا کہ بڑی بی میں تو جیسی کچھ ہوں سو ہوں مگر میں نے ناک نہیں کٹائی۔ شمیم کو یہ طعنہ نہایت ناگوار گزرتا مگر کیا کرتی نظیر سے کہتی تو ممکن تھا وہ غصے میں آکر بہو کو مار بیٹھتا اس لئے شمیم خاموشی سے سب کچھ برداشت کرلیتی جب زیادہ تنگ آتی تو گاتی ہوئی کام پر چلی جاتی۔ مصیبتیں سینکڑوں تھیں مگر لاعلاج تھیں لہٰذا ایک ہی پرانا اور تیر بہدف علاج تھا یعنی جب حد سے زیادہ دکھ پہنچتا تو وہ گاتی ہوئی کام میں مشغول ہوجاتی۔

ایک روز نظیر اچانک گھر آ گیا' اس کی بیوی نے گھر کو پانی پت کا میدان بنا رکھا تھا۔ شمیم خاموش کھڑی تھی اس کی نظریں ساکن تھیں اور آنکھوں سے سیل اشک رواں تھا۔ شمیم نے گھر چھوڑ دینے کے لئے اپنی گٹھڑی باندھ کر تیار رکھی تھی مگر نظیر کو دیکھ کر مامتا سے دل پگھل گیا۔ جسے بچپن سے جان کی طرح سنبھال کر جوان کیا ہے اسے آج خود رنج پہنا رہی ہے' یہ خیال آتے ہی شمیم بے بس ہوگئی۔ اس نے نظیر سے کہا ''بیٹا میری دعائے خیر تیرے ساتھ رہے گی تو خوش وخرم رہ اور مجھے جانے دو۔''

''دفعان بھی ہو کہیں تجھے روکتی کون نگوڑی ہے۔'' نظیر کی بیوی بول اُٹھی۔

نظیر نے بیوی کی پٹائی کے لئے چھڑی اُٹھالی لیکن شمیم نے بیچ بچاؤ کرادیا۔ نظیر کی بیوی رونے پیٹنے اور چلانے لگی ''ہاں مار ڈال مار ڈال میا کے غلام اور تجھ سے ہو ہی کیا سکتا ہے۔''

دوسرے روز صبح سویرے نظیر کانپتا ہوا عثمان سیٹھ کے پاس پہنچا ''میری اماں جان آئی ہیں؟''

''یہاں نہیں آئیں۔''

''تو گئیں کہاں؟ رات کو میری بیوی نے کچھ زبان درازی کی تھی صبح دیکھتا ہوں تو کھٹیا خالی تھی اور اماں جان غائب ہیں۔''

عثمان سیٹھ نے حیرت سے کہا ''کوئی نشان؟ کوئی سراغ؟''

''اور تو کچھ نہیں صرف یہ پرزہ کاغذ کا رکھتی گئی ہیں۔'' عثمان سیٹھ نے پرزہ ہاتھ میں لے کے پڑھا۔

''پیارے نظیر..... بہو تجھے طعن کرے گی کہ تیری ماں نے کوئی خراب کام کیا ہوگا اس لئے کسی عزیز نے ناک کاٹ لی مگر یہ بات نہیں ہے بیٹا' اپنی جوانی اور تیرے بچپن دونوں کی ایک ساتھ حفاظت کے لئے میں نے اپنے ہاتھوں یہ کام کیا تھا۔''

سیٹھ نے کوشش کی کہ کاغذ کا مضمون نظیر کو معلوم نہ ہو سکے ان کے ہاتھ سے کاغذ کا پرزہ زمین پر گر گیا۔ وہ تھوڑی دیر صرف سوچتے رہے کچھ بول نہ سکے مگر نظیر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ پھر بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا ''نظیر بیٹے تیری ماں کہاں گئی؟ شمیم کہاں ہے؟''

نظیر اشک بار آنکھوں سے بے زبان کاغذ کی طرف دیکھنے لگا۔

Pakistanipoint.com

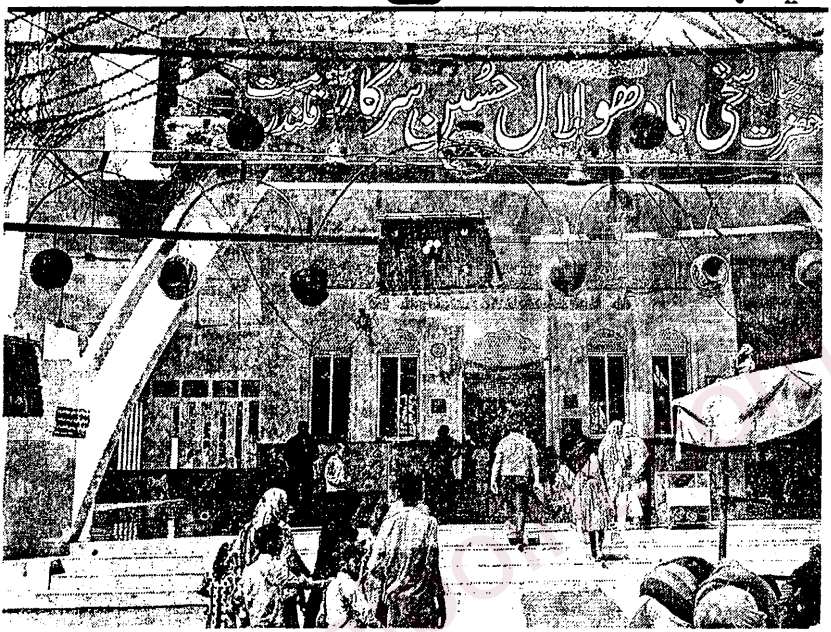

پروفیسر غلام رسول

حضرت مادھولال حسینؒ

فرمایا ''میں علی ہجویریؒ ہوں۔ تم نے بارہ سال تک میری خدمت میں رہ کر جو ریاضت کی ہے اس کا انعام دینے کے لئے مجھے پروردگار عالم نے بھیجا ہے۔'' اس کے بعد حضرت داتا صاحبؒ نے آپؒ کو اپنے سامنے کھڑا کر کے فرمایا ''لال حسین آج سے تم باطنی نعمت سے مالا مال ہو۔''

اللہ کے سچے ولی کی زندگی کے حالات و کرامات پر مبنی ایمان افروز تحریر!

مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر ایک مرتبہ لاہور آئے۔ انہوں نے یہاں فقیر لال حسین کے قلندرانہ رنگ کے عجیب و غریب قصے سنے۔ فوراً وزیراعظم کو حکم دیا کہ فقیر لال حسین کو پیش کیا جائے۔ حکم شہنشاہی کی اسی وقت تعمیل کی گئی مگر باوجود تلاش بسیار کے موصوف کا کہیں پتہ نہ چلا۔ وزیراعظم ناکام بادشاہ کے حضور پہنچے اور عرض کی۔

''ظل الٰہی بہت کوشش کے باوجود لال حسین کا کہیں پتہ نہیں چل سکا۔''

ابھی یہ الفاظ وزیر کے منہ میں ہی تھے کہ فقیر

لال حسین بادشاہ کے دربار میں تشریف لے آئے۔ آپ کا عجیب حلیہ بنا ہوا تھا' مونچھ ڈاڑھی غائب' ہاتھ میں ساغر و مینا اور مست و بے خود ہوکر بادشاہ کے روبرو کھڑے ہوکر پوچھا۔

''اے بادشاہ! تیرے بلانے پر میں آ گیا ہوں کہو مجھ فقیر سے تمہیں کیا کام ہے؟''

بادشاہ نے کہا ''اے درویش یہ تیرا حال کیا ہوا ہے' نہ شرعی شکل وصورت نہ جبہ و دستار اور پھر ہاتھوں میں سبو و جام یہ سب کچھ ایک درویش کے لئے تو روا نہیں۔'' فقیر لال حسین نے جلال میں آ کر بادشاہ کی طرف دیکھا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہا ''کس کا چہرہ غیر شرعی اور کس کے ہاتھ میں شراب و پیمانہ ہے۔'' یہ کہتے ہی بادشاہ نے بھی دیکھا اور درباریوں نے بھی کہ فقیر لال حسین کے چہرے پر شرع کے مطابق ریش بھی ہے اور ہاتھ میں شراب کے بجائے دودھ سے بھری ہوئی صراحی ہے۔

بادشاہ کو خدا نے ذہانت فطانت عطا کی تھی فوراً پہچان گیا کہ یہ خدا کے ولی نے اپنی کرامت دکھائی ہے فوراً ادب بجالایا اور عرض کی۔

''اے صاحب ولایت آپ واقعی خدا رسیدہ ہیں۔''

فقیر نے جواب دیا ''بے شک میں خدا رسیدہ ہوں۔''

''مگر آپ خدا تک کس طرح پہنچے؟'' بادشاہ نے سوال کیا۔

فرمایا ''میں خدا تک نہیں پہنچا بلکہ خدا خود میرے پاس پہنچا ہے۔''

بادشاہ کے ایک مقرب نے جس کو اپنی دین و دانش اور عقل و آگہی پر بڑا ناز تھا جھٹ سے سوال کیا ''اے درویش اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ خدا خود تم تک پہنچا۔''

فقیر لال حسین نے مصاحب شاہ کو نظرانداز کرکے بادشاہ سے کہا۔

''اے تاجدار ہندوستان! تُو ہند کی سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک ہے' موٹی سی بات ہے اگر تُو نہ چاہتا تو یہ گدا تجھ تک کیسے پہنچتا۔''

بادشاہ نے جب یہ جواب سنا تو عش عش کر اُٹھا۔ آپ کی تعظیم کیلئے تخت سے اُٹھ کر آپ کے پاس آ گیا اور دعا کی درخواست کی۔

فقیر لال حسین نے باشاہ کو اپنی دعاؤں سے نوازا اور رخصت ہوگئے۔

یہی فقیر لال حسین دنیائے عرفان میں حضرت مادھولال حسینؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ آپؒ کا شمار اہل طریقت و معرفت میں ہوتا ہے۔ آپؒ کے آباء ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ آپؒ کے دادا کا نام کلجس تھا اور وہ راجپوت قوم ڈھڈا سے تعلق رکھتے تھے۔ سلطان فیروز شاہ کے زمانے میں آپؒ کے والد کلسن رائے نے اسلام قبول کیا اور ان کا اسلامی نام شیخ عثمان رکھا گیا۔ آپؒ کے والد کپڑا بُننے کا کام کرتے تھے۔

فقیر لال حسین 945ء بمطابق 1538ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کا اصل نام شیخ حسین تھا' آپؒ عموماً سرخ لباس پہنا کرتے تھے جس کی مناسبت سے آپؒ لال حسین کے نام سے پکارے جانے لگے۔

آپؒ کی عمر جب سات سال کی ہوئی تو آپؒ کو مکتب بھیجا گیا۔ آپؒ نے اس وقت کے مشہور عالم حافظ ابوبکر سے قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا مگر

ابھی صرف چھ سپارے ہی پڑے تھے کہ یہ سلسلہ موقوف ہوگیا۔ وہ اس طرح ہوا کہ ایک روز آپؒ اپنے مکتب میں درس لے رہے تھے کہ وہاں قطب زماں حضرت بہلولؒ تشریف لے آئے۔ حضرت بہلولؒ حضرت امام موسیٰ کاظمؒ کے مزار پر حاضر تھے کہ آپؒ کو حکم ملا کہ آپؒ لاہور جائیں اور وہاں حافظ ابوبکر کے مکتب میں ایک کمسن طالب علم لال حسین ہے اس کی تربیت کریں۔ چنانچہ حضرت بہلولؒ لاہور پہنچ کر حافظ ابوبکر کے مکتب میں آئے اور ان سے لال حسینؒ کے بارے پوچھا۔ جب لال حسینؒ حضرت بہلولؒ کے سامنے حاضر کیے گئے تو آپؒ نے ان کے سر پر دست شفقت رکھا اور فرمایا۔

''لال حسین! دریا پر جاؤ اور وہاں سے میرے وضو کے لئے پانی لے آؤ۔''

لال حسینؒ نے حکم کی تعمیل کی' دریا سے پانی لائے جس سے حضرت بہلولؒ نے وضو کیا' نماز پڑھی اور اس کے بعد دو رکعت نفل پڑھے اور خدا سے عرض کی' اے مولا کریم اس معوضم لال حسین پر اپنا فضل و کرم کر اور اس کو عرفان کی دولت سے مالا مال کر کے اس کو اپنا سچا عاشق بنا۔

حضرت بہلولؒ کی دعا رنگ لائی اور خدا نے لال حسینؒ کے اندر جمال معرفت اور کمال حقیقت پیدا کر دیے۔ انہی دنوں ماہ رمضان المبارک کی آمد ہونے والی تھی۔ حضرت بہلولؒ نے فقیر لال حسینؒ کو حکم دیا کہ اس سال نماز تراویح میں قرآن پاک تم سناؤ گے۔ یہ حکم سنتے ہی حافظ ابوبکر نے عرض کی ''حضرت یہ بچہ تو ابھی صرف چھ سپارے حفظ کر سکا ہے یہ پورا قرآن پاک کس طرح سنائے گا۔''

حضرت بہلولؒ نے حافظ ابوبکر کی بات سنی ان سنی کر کے فقیر لال حسینؒ سے فرمایا ''تم فکر نہ کرو اس سال تم ہی نماز تراویح میں قرآن پاک سناؤ گے۔ بس تم اس طرح کرو دریا پر چلے جاؤ اور ہمارے لئے وہاں سے وضو کے لئے پانی لاؤ اور دریا پر تمہیں ایک بزرگ ملیں گے بس ان کی باتیں غور سے سن لینا اور ان کی ہدایت پر عمل کرنا تمہاری ساری مشکلات حل ہو جائیں گی۔''

فقیر لال حسینؒ حسب حکم دریا پر پانی لانے کے لئے گئے۔ وہاں ایک نورانی شکل وصورت کے بزرگ آپؒ کا انتظار کر رہے تھے۔ بزرگ نے آپؒ سے فرمایا ''لال حسین پانی کا لوٹا بھر کر تھوڑا تھوڑا پانی میرے ہاتھ پر ڈالو۔'' آپؒ نے ایسا ہی کیا۔ اس بزرگ نے اسی پانی سے آپؒ کے چہرے اور سر کو دھو ڈالا اس کے بعد آپؒ کو حکم دیا کہ جا کر حضرت بہلولؒ کو سارا کلام پاک سنا دو۔

فقیر لال حسینؒ واپس آئے ساری باتیں حضرت بہلولؒ کو بتائیں اور اس کے بعد آپؒ نے حضرت کو پورا قرآن پاک سنا دیا۔ حافظ ابوبکر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لال حسین نے تو صرف چھ سپارے پڑھے تھے ان کو پورا قرآن حکیم کس طرح حفظ ہوگیا۔

پھر حضرت بہلولؒ نے آپؒ کو نماز تراویح میں پیش امام بنایا اور آپؒ سے ماہ رمضان میں پورا قرآن پاک سنا۔ رمضان شریف کا مہینہ گزرا تو حضرت بہلولؒ نے فقیر لال حسین کو اپنا باقاعدہ مرید بنایا اور آپؒ کو خرقہ خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اس کے بعد انہوں نے آپؒ کو ہدایت فرمائی ''مجھے جتنا حکم تھا اس کی میں نے تعمیل کر دی ہے' اب میں تو رخصت ہونے لگا ہوں مگر تمہاری تربیت اور تعلیم

ابھی ختم نہیں ہوئی تمہاری مزید تربیت حضرت داتا گنج بخشؒ فرمائیں گے' لہٰذا تم بلاناغہ ان کے مزار پُرانوار پر حاضر ہوا کرو۔''

حضرت فقیر لال حسینؒ عرصہ بارہ سال تک نہایت پابندی سے حضرت داتا صاحبؒ کے مزار پر حاضری دیتے رہے۔ پوری پوری رات عبادت و تلاوت میں گزار دینا آپؒ کا معمول ہوگیا۔ ایک روز آپؒ معمول کے مطابق حضرت داتا صاحبؒ کے مزار پر حاضر تھے کہ اچانک آپؒ کے سامنے ایک نورانی شکل والے بزرگ آئے اور فرمایا۔

''لال حسین! جانتے ہو میں کون ہوں؟''

عرض کی ''حضرت آپ خود ہی فرما دیجئے کہ آپ کون ہیں' میں تو بہت کم علم ہوں آپ علم والے ہیں آپ ہی میری رہنمائی فرمائیے۔''

فرمایا ''میں علی ہجویریؒ ہوں۔ تم نے بارہ سال تک میری خدمت میں رہ کر جو ریاضت کی ہے اس کا انعام دینے کے لئے مجھے پروردگار عالم نے بھیجا ہے۔'' اس کے بعد حضرت داتا صاحبؒ نے آپؒ کو اپنے سامنے کھڑا کر کے فرمایا ''لال حسین آج سے تم باطنی نعمت سے مالامال ہو۔'' یوں فقیر لال حسینؒ ولایت سے سرفراز اور شراب وحدت سے سرشار ہوئے۔

حضرت فقیر لال حسینؒ نے چھبیس سال تک سخت عبادت و ریاضت کی' ہر روز ایک قرآن پاک ختم کرنا آپؒ کا معمول بن گیا تھا۔ مجاہدے اور چلہ کشی کر کے آپؒ نے ایسی نفس کشی کی کہ باکمال انسان بن گئے۔ آپؒ قائم اللیل اور شب زندہ دار بزرگ تھے۔ دریائے راوی کے کنارے پر رات بھر کھڑے ہو کر آپؒ پورا قرآن پاک پڑھا کرتے تھے۔

طریقت کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپؒ نے دوسری تعلیم کی طرف توجہ دی۔ آپؒ نے شیخ سعد اللہؒ سے تفسیر مدارک کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ایک روز آپؒ اپنا سبق پڑھ رہے تھے کہ قرآن پاک کی ایک آیت جس کا ترجمہ یہ تھا: اس جہاں کی زندگی لہو ولعب ہے..... پر پہنچے تو اس کی حقیقت آپ کو سمجھ نہ آئی۔ آپؒ نے شیخ سعد اللہ سے اس کی وضاحت اور تشریح پوچھی مگر موصوف نے فلسفیانہ اور عالمانہ طور پر آپؒ کو سمجھایا اور اس بات پر زور دیا کہ یہ تمام دنیا ہی لہو و لعب ہے۔ بس یہ سننا تھا کہ آپؒ پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی۔ آپؒ رقص کرتے ہوئے مکتب سے نکل پڑے۔ گلیوں بازاروں میں ناچتے جاتے اور کہتے جاتے ''جب خدا تعالیٰ نے ساری دنیا کو بازی فرمایا ہے تو بس اسی میں مصروف رہنا چاہئے۔''

آپؒ پر جذب نے ایسا رنگ چڑھایا کہ آپؒ نے اپنی اور اپنے ہم مکتبوں کی تمام کتابیں کنویں میں پھینک دیں۔ ڈاڑھی اور مونچھ کے بار سے سبکدوش ہوگئے۔ آپؒ کے ساتھی آپؒ سے اُلجھنے لگے کہ ہماری کتابیں کنویں سے نکال دو۔ یہ سننا تھا کہ آپؒ ان سب کو لے کر کنویں کے پاس آئے اور اپنا ہاتھ کنویں میں ڈالا۔ عام سا ہاتھ اتنا دراز ہوا کہ گہرے کنویں سے تیرتی ہوئی کتابیں باہر نکال کر لے آیا۔ آپؒ کے ہم مکتبوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ تمام کی تمام کتابیں بالکل خشک تھیں۔ پانی نے کتابوں کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا تھا۔ لڑکے اپنی اپنی کتابیں لے کر رخصت ہوئے تو آپؒ کی حالت پھر سے ویسی ہوگئی۔ آپؒ کا اب یہ معمول بن گیا کہ صراحی و جام ہاتھ میں تھامے گلی کوچوں میں پھرتے رہتے تھے

طوائفوں کے کوٹھوں پر جاتے اور ناچ گانے میں اپنے دن رات بسر کرتے تھے۔

آپؒ کے شب و روز محفل نشاط و مستی میں گزرنے لگے۔ آپ کی اس کیفیت کی خبر آپؒ کے مرشد حضرت بہلولؒ کو پہنچی تو انہوں نے فرمایا ''ہرگز نہیں میرا مرید کسی طرح بھی بھٹک نہیں سکتا۔''

لوگوں نے جب انہیں یقین دلایا اور عرض کیا ''حضرت آپ خود چل کر دیکھ لیں اور اپنی آنکھوں سے اپنے مرید کی حالت ملاحظہ کریں۔''

حضرت بہلولؒ لاہور تشریف لائے اور آخر فقیر لال حسینؒ کو دیکھا۔ آپؒ جذب و شکر میں مبتلا بے خود اور مست تھے۔ آپؒ کی حالت دیکھ کر حضرت بہلولؒ مسکرائے اور مطمئن ہو کر فرمایا ''یہ دیکھنے والی نظروں کا قصور ہے ورنہ لال حسین تو اپنی منزل کی طرف نہایت کامیابی سے رواں دواں ہے۔'' یہ کہہ کر حضرت بہلولؒ واپس تشریف لے گئے اور کچھ ہی عرصے کے بعد آپؒ وصال فرما گئے۔ فقیر لال حسینؒ نے مرشد کے وصال کی خبر سنی تو اور بھی زیادہ مستانہ و دیوانہ وار ناچنے لگے۔

ایک روز کی بات ہے کہ آپؒ ناچتے ہوئے شاہدرہ سے گزر رہے تھے کہ آپؒ کی نگاہ ایک خوب رو نوجوان پر پڑی۔ بس ایک نگاہ اپنا کام کر گئی اور آپؒ اس لڑکے پر فریفتہ ہو گئے۔ موصوف ایک سولہ سال کا برہمن نوجوان تھا جو شادی شدہ تھا اور اپنے والدین کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا۔ فقیر لال حسینؒ جس لڑکے پر عاشق ہوئے اس کا نام مادھو تھا۔ عشق نے حضرت کی وہ حالت کر دی کہ آپؒ دن رات مادھو کے گھر کا طواف کرنے لگے مگر عشق نے کبھی اتنی آسانی سے منزل حاصل نہیں کی۔ آبلہ پائی تو عشق کرنے والوں کا مقدر ہے۔ مادھو بھی ایک مدت تک حضرت سے بے اعتنائی کا سلوک کرتا رہا مگر کب تک آخر اس کو التفات برتنا پڑا۔

پھر اس قدر قربت ہوئی کہ دونوں کے نام بھی ایک دوسرے کی پہچان بن گئے۔ فقیر لال حسینؒ نے اپنا نام ہی مادھو لال حسین رکھ لیا۔ مادھو آپؒ کے سچے عشق میں جب گرفتار ہوئے تو انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت آپؒ کے پاس گزارنا شروع کر دیا اور آپؒ کے مئے ناب سے شغل فرمانے لگے۔ مادھو کے گھر والوں کو آپؒ دونوں کی دوستی سخت ناگوار لگتی تھی مگر اس بات کو حضرت نے اور مادھو دونوں نے خاطر میں لانے کی کوشش ہی نہ کی اور پھر مادھو پر رفتہ رفتہ حضرت کی صحبت نے ایسا اثر کیا کہ انہوں نے کلمہ طیبہ پڑھ کر وحدانیت کا اقرار کیا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ ان کا اسلامی نام محبوب الحق رکھا گیا لیکن انہیں شہرت دوام مادھو نام سے ہی ملی۔ آپ شیخ حسین کے دست حق پرست پر بیعت ہو کر سلسلہ قادریہ میں داخل ہوئے اور توجہ شیخ سے درجہ کمال پر پہنچے۔

شیخ لال حسینؒ کی مادھو کے ساتھ محبت اور دوستی ہمیشہ اس کے والدین کو کھٹکتی تھی چنانچہ وہ لوگ وقتاً فوقتاً اس کوشش میں رہتے کہ کسی طرح ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے مگر خدا کو ایسا کرنا منظور نہ تھا۔

اسی سلسلہ میں ایک دفعہ مادھو کے والدین انہیں گنگا اشنان کے لئے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر نہ مادھو کو جانا گوارہ تھا اور نہ شیخ حسینؒ میں اتنی تاب تھی کہ وہ اپنے محبوب کو اپنی نظروں سے دُور کریں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مادھو اپنے گھر والوں کے

ہمراہ گنگا اشنان کو نہیں جائیں گے۔ مادھو نے آپؒ کے فیصلے پر سر جھکا دیا اور اپنے گھر والوں کو کہہ دیا ''آپ سب جائیں میں نہیں جاؤں گا۔''

جب وہ سب لوگ چلے گئے تو شیخ حسینؒ کو محسوس ہوا کہ مادھو نے میری خاطر کتنی قربانیاں دی ہیں حتیٰ کہ اپنے والدین کی معمولی سی خواہش پوری کرنے سے انکار بھی کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک روز آپؒ نے مادھو سے پوچھا۔

''مادھو! اشنان کس دن ہوگا؟''

عرض کی ''حضرت! کل ہوگا۔''

فرمایا ''کل مجھے یاد دلا دینا کہ آج اشنان ہے۔''

حکم کی تعمیل کی گئی اور مادھو نے آپؒ کو اگلے روز یاد کروا دیا۔ آپؒ نے مادھو سے فرمایا کہ وہ آنکھیں بند کر کے آپؒ کے پاؤں پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو جائیں۔ مادھو نے آپؒ کے ارشاد کے مطابق عمل کیا اور جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو گنگا کے کنارے کھڑا پایا۔ پھر انہوں نے حسب دستور اپنے والدین اور دیگر اعزہ کے ہمراہ اشنان گنگا کیا اور پھر حضرتؒ کے حکم کے مطابق آنکھیں بند کیں اور ان کے پاؤں پر پاؤں رکھے اور پلک جھپکتے ہی واپس لاہور پہنچ گئے۔

حضرت مادھو کے والدین بڑے حیران ہوئے کہ آپ اچانک آئے اور اشنان کر کے واپس بھی چلے گئے اس طرح کا آنا اور واپس چلے جانا ان کی سمجھ سے بالا تھا۔ مگر جب وہ لاہور آئے تو بیٹے کی زبانی اس سفر کی روئیداد سن کر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ اب انہوں نے سوچا شیخ حسینؒ تو خدا کے ولی کامل ہیں اور یہ مادھو کے ساتھ ان کا تلطف محض دنیاوی نہیں بلکہ خدا کی رضا منشا کی تکمیل ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے حضرت اور مادھو کی دوستی اور پیری مریدی کو کج نظری سے دیکھنا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد مادھو اور حضرت کی رفاقت اور گہری ہوتی گئی حتیٰ کہ آپ دونوں ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہو گئے۔

ایک مرتبہ بسنت کے موقع پر مادھو ایک گلال لائے اور آپؒ پر ڈال دیا۔ آپؒ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور آپؒ اسی مستی میں اپنے حجرے سے ناچتے ہوئے بازاروں کی طرف نکل گئے۔ ہوش میں آنے کے بعد آپؒ نے اس تہوار کو باقاعدگی سے منانا شروع کر دیا۔

یہ تہوار اگرچہ ہندوؤں کی رسم تھی مگر جب سے آپؒ نے اسے منانا شروع کیا تو وہاں مسلمان بھی جمع ہونا شروع ہو گئے۔ حتیٰ کہ آپؒ کے وصال کے بعد تب سے اب تک یہ تہوار عرس کی شکل میں منایا جاتا ہے۔ آپؒ کے مزار پر بسنتی رنگ کا ایک غلاف چڑھایا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ لاہور کے قاضی مخدوم الملک نے آپؒ کو ڈھول پر رقص کرتے دیکھا تو انہیں یہ بات سخت ناگوار معلوم ہوئی' چنانچہ آپؒ کو عدالت قاضی میں طلب کیا گیا۔ آپؒ پیش ہوئے تو قاضی نے کہا۔

''اے شاہ حسین یہ تم نے کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے' تم شرعی کام چھوڑ کر ان لغویات میں مصروف ہو آخر تم دنیا کو کیا دکھانا چاہتے ہو؟''

آپؒ نے قاضی کی طرف غور سے دیکھا اور فرمایا۔ ''قاضی صاحب اسلام کے ارکان کتنے ہیں؟''

قاضی نے جواب دیا: ''پانچ ہیں۔''

فرمایا ''کون کون سے ہیں بتائیں ذرا؟''
قاضی نے کہا: ''1 کلمہ توحید اور رسالتؐ کا اقرار۔
2۔نماز
3۔روزہ۔
4۔زکوٰۃ
5۔حج''
آپؒ نے یہ باتیں سُنیں تو فرمایا ''دیکھیں قاضی صاحب پہلے رکن میں توحید و رسالت میں آپ بھی شریک ہیں اور میں بھی' دوسرے دو ارکان میں نے چھوڑ رکھے ہیں اور آخری دو آپ نے ترک کر دیئے ہیں۔ پھر کیا میں ہی سزا کا مستوجب ہوں آپ کے لئے کوئی سزا نہیں ہے؟''
قاضی صاحب نے جب آپؒ کی گفتگو سُنی تو بہت شرمندہ ہوئے' کیونکہ وہ صاحب نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ نہیں دیتے تھے اور باحیثیت ہونے پر بھی حج سے مشرب یاب نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بعد آپؒ پر قاضی وقت نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔
معروف بزرگ واسطیؒ فرماتے ہیں۔
''جو شخص اپنے نفس کو ملامت کرتا ہے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہے۔'' اس بات کی توضیح شاہ ہند دارا شکوہ نے یوں کی۔

از اصل حقیقت جو خبر دار شدی
در حضرت حق محرم اسرار شدی
چوں فائل خیروشر خدارا دیدی
دیدی زگنہ خویش گنہ گار شدی

حضرت واسطیؒ پھر فرماتے ہیں ''شیخ حسین پر خدا کی رحمت ہو جو ملامتیوں کے طریقے پر کڑک کر اور ڈھول دھڑاکے سے چلتا تھا گزشتہ زمانوں کے ملامتیوں میں بھی اس جیسا ملامتی کوئی نہیں دیکھا گیا تھا اور وہ اپنے زمانے کے ملامتیوں کا بھی استاد ہے۔''
لوگوں نے یہ باتیں سُنیں تو واسطیؒ سے پوچھا: ''آپ کون ہیں؟''
تو حضرت واسطیؒ نے جواب دیا۔
''میں نہ مقیم ہوں نہ مسافر' نہ مسلمان ہوں نہ کافر وہی کچھ ہوں جو میں تھا۔''
ایک مرتبہ ایک مجلس میں حضرت شاہ حسینؒ کے سامنے حافظ شیرازی کا ایک شعر پڑھا گیا جو حسب ذیل تھا۔

چشمہ چشم مرا اے بت خنداں دریاب
برامید تو بخوش آب روانے دارد

آپؒ نے شعر سُن کر غصے سے فرمایا ''حافظ شیرازی کی تو ساری عمر ہی بوڑھی عورتوں کی طرح روتے ہوئے گزر گئی۔'' پھر آپؒ نے اہل مجلس کو اپنا ایک شعر سناتے ہوئے فرمایا' اس حافظ کی غزل کا یہ شاندار مطلع سنئے۔

شاہد آں نیست کہ موئے دمیانے دارد
بندہ طلعت آں باش کہ آنے دارد

آپؒ کا شعر سُن کر سب لوگ واہ واہ کر اُٹھے۔
حضرت نے اپنے شوق اور طرب ورنگ کے لبادے میں اپنی ولایت کو زندہ رکھا۔ آپؒ عرفان الٰہی کے اتنے قریب تھے کہ ہر بات آپؒ اذن الٰہی سے کیا کرتے تھے اور خدا کے حضور پہنچ کر آپؒ کے شوق کی منزل آپؒ کے قریب تر ہو جاتی تھی مگر بندوں میں آ کر آپؒ وہی فقیر بن جاتے تھے جس کی ظاہری حالت شرع سے بعید ہو جاتی تھی۔ مشہور شہنشاہ نور الدین جہانگیر نے عالم شہزادگی میں آپؒ کی خدمت

میں ایک عرصہ گزارا۔ وہ آپؒ کا معتقد اور والا وشیدا تھا۔ اس نے آپؒ کی زندگی پر ایک روزنامچہ لکھوایا اور اس کام پر اپنے مصاحب بہادر خان کو معمور کیا۔ مغل شہنشاہ اکبر اور اس کے حرم کی شہزادیاں اور بیگمات بھی آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر فیوض و برکات حاصل کیا کرتی تھیں۔ آپؒ کے کشف و کرامات سے مغل سلطنت نے استحکام حاصل کیا۔ جہانگیر آپؒ کی فوق العادت طاقت اور تدس کا اس قدر قائل تھا کہ اس نے بہادر خان کے مرتب کردہ روزنامچہ کو ایک کتاب کی شکل میں شائع کروایا اور وہ کتاب بہاریہ کے نام سے موسوم کی گئی۔

ایک مرتبہ موضع منڈیا میں کافی عرصہ سے بارش نہیں ہوئی تھی' فصلیں خشک سالی سے بالکل تباہ ہوکر رہ گئی تھیں۔ اب دیہات کے نمبردار نے آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپؒ سے دعا کی درخواست کی مگر آپؒ اس پر مطلق متوجہ نہ ہوئے۔ نمبردار کو سخت افسوس ہوا۔ ایک روز آپؒ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ منڈیا کے قریب سے گزر رہے تھے کہ نمبردار کو پتہ چل گیا۔ اس نے اپنے آدمی بھیجے جو آپؒ کو ساتھیوں سمیت منڈیا لے آئے۔ نمبردار نے آپؒ کو اپنے گھر میں بٹھایا اور عرض کی۔

''حضرت اب میں آپ کو اس وقت تک جانے نہیں دوں گا جب تک آپؒ ہمارے لئے بارش کی دعا نہیں کریں گے۔''

آپؒ نے مسکرا کر فرمایا ''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے دعا کروانے کے لئے ہمیں قید کرلیا ہے۔ چلو اچھا مگر ہم ایک شرط پر دعا کریں گے..... تم پہلے مجھے اور میرے ساتھیوں کو مرغ اور نان کھلاؤ پھر دیکھنا تمہاری خواہش کس طرح پوری ہوتی ہے۔''

نمبردار نے آپؒ کے حکم کے مطابق مرغ اور نان پکوا کر آپؒ کی خدمت میں پیش کئے۔ آپؒ اور آپؒ کے ساتھیوں نے شکم سیر ہوکر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد آپؒ نے آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا ''اب کیا دیر ہے؟''

آپؒ کا یہ کہنا تھا کہ ابر گھر کر آیا اور خوب بارش ہوئی اور اس وقت تک نہ رُکی جب تک نمبردار نے آپؒ سے عرض نہ کی کہ حضرت بس اب میری دعا پوری ہوگئی۔

آپؒ کی خدمت میں بڑے بڑے علماء اور دانشور حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وقت کے مشہور عالم مولانا عبدالحکیم نے آپؒ کی خدمت میں عرض کی۔

''حضرت میں ایک مدت سے آپ کی خدمت میں حاضر رہتا ہوں' آپؒ کے عرفان سے میں نے ادراک حاصل کیا ہے۔ آپؒ مجھے اپنا مرید بنالیں تو یہ میرے لئے بہت بڑی سعادت ہوگی۔ آپؒ نے مسکرا کر جواب دیا ''چھوڑ یار تو ملاں ہے میں فقیر ہوں میرا تیرا کیا جوڑ ہے' کیوں مجھے شہر میں ذلیل و خوار کرائے گا۔ تُو علم پڑھ یہ فقیری تیرے لائق نہیں تو نکتے نکالنے والا مولوی ہے مگر ہم صرف اللہ اللہ کرنے والے ہیں۔''

شاہ حسینؒ پنجابی کے مشہور شاعر بھی تھے ان کی لاتعداد کافیاں آج بھی مقبول عام ہیں جن کو شوق سے گایا جاتا ہے۔ آپؒ کی زبان بڑی صاف میٹھی اور رس سے لبریز تھی۔ زبان کے لحاظ سے پنجابی شعراء میں آپؒ کا رُتبہ بہت بلند ہے۔ آپؒ کی زبان میں ادبی پٹھوہاری کی بھی جھلک ہے جو روزمرہ ہے۔ آپؒ عروضی ضرورتوں سے بے پروا

مرحبا سبوسِ اسپغول

قدرت کی صحت بخش غذا اور دوا

مرحبا کا سبوس اسپغول جو کہ پلانٹیگو اوویٹا (Plantago Ovata) سے حاصل کیا جاتا ہے بغیر اسٹارچ کے کاربوہائیڈریٹ پر مشتمل انتہائی حل پذیر فائبر ہے۔ یہ قطعی طور پر بے ضرر اور خاص طور پر دائمی قبض اور بیسلری پیچش کے لئے مفید ہے۔

خواص: قبض روز مرہ کی شکایات میں سب سے زیادہ عام ہے جبکہ بیسلری پیچش اور دائمی قبض تو عالمگیری حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ان بیماریوں میں سبوس اسپغول کا استعمال لیکوئیڈ پیرافین یا اس کی مصنوعات سے بالکل جدا، آرام دہ اور بہتر ہے کیونکہ لیکوئیڈ پیرافین آنتوں میں حیاتین اور غذا کے معدنی اجزاء کے انجذاب کو روک دیتا ہے جبکہ چھلکا اسپغول کے استعمال سے ایسی کوئی پیچیدہ صورتحال پیدا نہیں ہوتی مزید برآں یہ ابیائی پیچش، السٹریٹو کولائٹس (Ulcerative) اور بواسیر میں بھی انتہائی مؤثر علاج ہے جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ چھلکا اسپغول کا باقاعدہ استعمال موٹاپے اور خون میں چربی جمنے جیسی مہلک بیماریوں کا تدارک کرتا ہے۔

طریقہ عمل: مرحبا کا سبوس اسپغول معدہ اور آنتوں میں پانی کی کافی مقدار جذب کرتا ہے جس سے اس کی شکل جیلی کی طرح ہو جاتی ہے۔ جو نہ صرف آنتوں کی دیواروں کو خراشوں سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ چکناہٹ بھی پیدا کرتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ معدے اور آنتوں سے مضرِ صحت اجزاء جیسے چکنائی اور کولیسٹرول کے مالیکول، فالتو کاربوہائیڈریٹ وغیرہ کو دبوچ لیتی ہے جس کی بدولت جسم میں ان اجزاء کا توازن برقرار رہتا ہے جو کہ موٹاپے کو کم کرتا ہے اور خون کی نالیوں کو تنگ ہونے سے بچاتا ہے حال ہی میں نیشنل کولیسٹرول ایجوکیشن پروگرام برائے ایڈلٹ اور ٹریٹمنٹ گائیڈ لائنز یو۔ ایس۔ اے (U-S-A) نے سبوس اسپغول کے استعمال پر کافی زور دیا ہے جو کہ خون میں کولیسٹرول گھٹانے کا ایک آسان طریقہ ہے۔ اسپغول میں پیکٹن، میوکی لیجز، کئی ایک ہیمی سیلولوزیز اور پوٹاشیم جیسے اجزاء شامل ہیں جن میں کولیسٹرول گھٹانے کی صلاحیت موجود ہے۔

خوراک: بالغ افراد کے لئے دو چائے کے چمچ ایک گلاس پانی کے ساتھ دن میں دو یا تین بار بچوں کے لئے آدھا چمچ سے ایک چمچ تک دن میں دو سے تین بار

ہدایات: مرحبا کا سبوس اسپغول، دودھ، مشروبات اور دیگر اشیاء کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے، چھلکا اسپغول کو نگل لیں، چبا کر نہ کھائیں، شیر خوار بچوں کو نہ دیں، بدہضمی کی صورت میں استعمال نہ کریں، ضرورت کے مطابق خوراک کو کم یا زیادہ کیا جاسکتا ہے۔

مرحبا
SINCE 1975

تیار کردہ:
مرحبا لیبارٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

142 مین قائد اعظم انڈسٹریل اسٹیٹ لاہور۔ پاکستان
فون: 0423515606842-042-111152-152
E-mail info@marhaba.com.pk
Website:www.marhaba.com.pk

طبیب اور مریض

ایک مریض معدے کے درد کی وجہ سے تڑپ رہا تھا۔ طبیب نے اسے دیکھ کر کہا کہ ''مجھے تعجب ہوگا اگر اس نے آج کی رات گزار لی۔ اس نادان نے ایک زہریلی گھاس کھا لی ہے اب کا زندہ رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔'' صبح ہوئی تو لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مریض شفایاب ہو چکا تھا اور طبیب اسی رات سوئے عدم روانہ ہو گیا تھا۔

(مرسلہ: نادیہ سلیم۔ لاہور)

تھے۔ آپؒ کو لفظوں کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

کافی کو ہندی میں راگنی بھی کہتے ہیں ور اس کو راگ کے طو پر بھی گایا جاتا ہے۔ مگر عرف عام میں کافی صوفیا کا وہ کلام معرفت ہے جس کو ترنم سے ادا کیا جاتا ہے۔ شہر تعام اور بقائے دوام کے دربار میں حضرت شاہ حسینؒ کی نشست حضرت بلھے شاہؒ سے بھی بلند ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں۔

من انکیا بے پرواہ نال
اُس دین دنی دے شاہ نال
دنیا چھوڑ آخر مرجاناں
اوڑک کم اللہ نال

حضرت نے تصوف کی دنیا میں دیگر اولیائے کرام اور زعماء دین کی طرح ایک بڑا نام حاصل کیا۔ آپؒ صوفی شاعر بھی تھے۔ آپؒ کو صاحب کرامت بزرگ بھی مانا گیا ہے۔ آپؒ کے متعلق سیرت کی کتابوں میں مختلف مالف و موافق آراء بیان کی گئی ہیں مگر جمالی طور پر اگر آپؒ کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو آپؒ واقعی ایک نیک نہاد اور کامل انسان تھے۔ اس لئے ارباب سیر کی منطقی آراء پر دھیان دیئے بغیر حضرت شاہ حسینؒ کی اس عزت و توقیر پر غور کرنا لازم ہے جو خدا نے ان کو بعدازوفات عطا فرمائی ہے۔

شیخ مادھو کو حضرت شاہ حسینؒ کے ساتھ بہت محبت تھی۔ لحہ بھر کی جدائی بھی انہیں شاک گزرتی تھی۔ ایک دفعہ حضرت نے مادھو کو امتحان و آزمائش میں ڈال دیا۔ آپؒ نے مادھو کو حکم دیا کہ وہ راجہ مان سنگھ جو اکبری عہد کا امیر تھا کی ملازمت کریں اور اس کے ساتھ دکن کی مہم پر جائیں۔ شیخ مادھو کو اگرچہ اپنے مرشد کی مفارقت گوارہ نہ تھی لیکن وہ ارشاد مرشدی سے سرتابی بھی نہ کر سکتے تھے۔ ناچار دل پر پتھر رکھ کر وہ دکن روانہ ہوئے۔ مہم جوئی میں کامیابی کے بعد بھی راجہ کی ملازمت میں مادھو نے تقریباً تیرہ سال گزارے اور ایک طویل عرصہ کے بعد لاہور واپس آئے۔

اللہ والے ہر آنے والے معاملات سے باخبر ہوتے ہیں۔ شیخ حسینؒ جانتے تھے کہ وہ اور مادھو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں' محبت بھی ایسی جس میں جدائی برداشت کرنے کا تصور بھی سوہان روح ہے۔ اس کے ساتھ ہی شیخ حسین کو خدا نے یہ بھی بتا دیا کہ اب وہ جلد ہی وفات پانے والے ہیں اس لئے انہوں نے سوچا میری وفات کے بعد دائمی جدائی مادھو کے لئے ناقابل برداشت ہوگی۔ ان رموز کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے مادھو کو راجہ مانگ سنگھ کی ملازمت اختیار کرنے اور دکن کی مہم پر جانے کا حکم دیا۔ مادھو کی دکن روانگی کے بارہ سال بعد اور

لاہور واپسی سے ایک سال قبل حضرت شاہ حسینؒ وصال فرما گئے۔ یوں ایک لمبی جدائی اور طویل فراق کے عادی ہونے کے باوجود جب مادھو لاہور واپس پہنچے تو اپنے مرشد کی وفات کی خبر سُن کر اپنے حواس کھو بیٹھے۔

حضرت شاہ حسینؒ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے شاہدرہ کے قریب ایک کنواں کھدوایا اور باغ لگوایا اور وصیت کی کہ مجھے اسی باغ میں دفن کیا جائے لیکن یہ میری عارضی تدفین ہوگی کیونکہ میری وفات کے سال بعد مادھو آئے گا اور وہ میرے جسد خاکی کو شاہدرہ سے نکال کر بابو پورے میں دفن کروائے اور وہی میرا سجادہ نشین ہوگا۔

حضرت کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ آپؒ کی تدفین کے کچھ عرصہ بعد شاہدرہ کا وہ علاقہ جہاں آپؒ مدفون تھے سیلاب کی وجہ سے زیرآب آ گیا اور اسی زمانے میں شیخ مادھو بھی دکن سے واپس لاہور آئے۔ تب حضرت کا مزار سیلاب کی وجہ سے بالکل گر چکا تھا۔ شیخ مادھو نے آپؒ کی قبر کھدوائی، آپؒ کا جسد خاکی بالکل محفوظ تھا۔ آپ نے میت کو دوبارہ غسل دیا، کفن پہنایا اور نماز جنازہ پڑھوائی اور شیخ حسین کو محلہ بابو پورہ باغبانپورہ میں دفن کیا۔ وہیں آپؒ کا مقبرہ ہے۔ اس طرح حضرت کا فرمانا خدا تعالیٰ نے برحق ثابت کیا۔

آپؒ کی وصیت کے مطابق شیخ مادھو آپؒ کے سجادہ نشین بنے اور تقریباً پینتیس سال تک وہ مسند پر متمکن رہے۔ شیخ مادھو بھی اپنے مرشد کی طرح بڑے بلند پایہ شاعر تھے۔ آپؒ کے دل پر مرشد کی وفات نے ایسا اثر کیا کہ اکثر آپؒ حضرت شاہ حسین کی قبر سے لپٹ کر روتے رہتے اور یہ اشعار پڑھتے تھے۔

تو شدی با وصال حق ہمدم
مادھو را گزاشتی در غم
تو شدی از جہا نباز و نعم
مادھو تو شدہ بدرود و نیم

حضرت مادھو نے تہتر سال کی عمر میں 22 ذوالحج 1056ھ میں وفات پائی۔ ان کے علاوہ شیخ حسینؒ کے سولہ خلفاء ہو کر گزرے ہیں جن میں چار کو شاہ غریب، چار کو دیوان، چار کو اکی اور چار کو بلاول کہا جاتا ہے۔

جس طرح زندگی میں حضرت شاہ حسینؒ اور مادھو ایک دوسرے کے جان و قالب تھے بعد وفات بھی قدرت نے انہیں اسی طرح پہلو بہ پہلو رکھا۔ حضرت کا مزار باغبانپورہ کے شمال میں واقع ہے۔ مزار کے اندر ایک چبوترے پر حضرت شاہ حسین اور شیخ مادھو کی قبریں ساتھ ساتھ ہیں۔ درمیان میں صرف زائرین کے چلنے کے لئے تھوڑی سی جگہ چھوڑی گئی ہے۔ بس اتنا سا ظاہری فاصلہ طالب و مطلوب میں ہے۔ مزار کے احاطے میں ایک مسجد اور ایک برج بھی ہے۔ اس برج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نقش قدم یعنی قدم رسولؐ نہایت تحریم کے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ ایسا ہی ایک نقش قدم دہلی کی جامع مسجد میں بھی ہے۔

حضرت شاہ حسینؒ ایک باکمال اور صاحب طریقت وحقیقت اولیاء اللہ تھے۔ آپؒ نے 1008ھ میں تریسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ہر سال بسنت کے موقع پر میلہ چراغاں کے نام سے ایک میلہ آپؒ کے مزار پر لگتا ہے جو درحقیقت آپؒ کا عرس ہوتا ہے جس میں لوگ کثرت سے شرکت کرتے ہیں اور رات کو چراغاں بھی کیا جاتا ہے۔

پگڈنڈی

نوشابہ اختر

(قسط:3)

رشتوں کی ڈور انسان کو جینے کی قوت عطا کرتی ہے اور اس سے بندھ کر ہم خود کو زندگی کے جھمیلوں میں مصروف کر لیتے ہیں گویا ہمیں قدرت نے زندگی کے تمام مسائل کا حل تلاش کرنے کا سہارا فراہم کر دیا ہو۔ لیکن بعض اوقات یہی ڈور اُلجھ جاتی ہے اور سفر زیست انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر انسان اپنے رشتوں کی تلاش میں سرپٹخارہ جاتا ہے۔ نوشابہ اختر کا نام اب سیارہ ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے جانا پہچانا نام ہے' اُن کی کہانیوں میں رشتوں کے بندھن اور اُن سے بندھے انسانوں کا احوال اس قدر پُراثر انداز میں سامنے آتا ہے کہ قاری خود کو کہانی کا کردار تصور کرنے لگتا ہے اور اسی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے جس میں کردار کو دکھایا گیا ہوتا ہے۔ زیرِ نظر ناول بھی ایسے ہی کرداروں پر مبنی ہے جو ہمیں اپنے آس پاس اور دیکھے بھالے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا بنیادی خیال بھی ایسا ہے کہ لگتا ہے یہ ہماری ہی کہانی ہے۔

''پگڈنڈی'' میں جذبات و احساسات کی اس خوبصورتی سے ترجمانی کی گئی ہے کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کہانی کو پڑھتے ہی جائیں اور جب تک ناول مکمل نہ ہو جائے وقفہ نہ آنے پائے۔ یہی ایک اچھے ناول کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ قاری کو اپنے سحر میں مبتلا کر دے اور پڑھنے والا اُس کی اگلی قسط کے انتظار میں رہے۔ نوشابہ اختر کا یہ یادگار ناول آپ کو یقیناً پسند آئے گا' اپنی رائے سے ہمیں ضرور آگاہ کریں!

(ایڈیٹر)

مونا کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ سنبھالے سنبھل ہی نہ رہی تھی۔ ابا کے ساتھ اسے بہت زیادہ پیار تھا۔ ابا اسے اپنے پاس بٹھائے چھوٹی چھوٹی نصیحتیں کرتے رہتے اور وہ بھی ان کی باتوں کا بہت احترام کرتی۔ آج وہ ہستی بھی اس سے چھن گئی اس کا تڑپنا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے بلک بلک کر اللہ میاں سے شکوہ کیا۔ ہمارے لئے نہیں تو اس دکھیا کے لئے ہی انہیں زندہ رہنے کی کچھ اور مہلت مل جاتی لیکن جانے والی عزیز ہستی ہر دُکھ' ہر پریشانی اور ہر غم سے بے نیاز آنکھیں بند کئے مسکرا رہی تھی۔ ہر لمحہ دعائیں کرنے والے دو اور ہاتھ منوں مٹی تلے دب جائیں گے اور ہم چپ چاپ آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے۔

روتے تڑپتے دوپہر سے شام ہوگئی' جانے والے کی آخری رسوم ادا کی جا رہی تھیں۔ بھیا سب کچھ خود کروا رہے تھے لیکن بالکل بے جان مجسمے کی

طرح مونا اس وقت سے ابا کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔

''ابا نہ جائیے' ابا جان.....'' اس کی آواز روتے روتے بند ہوچکی تھی ''مجھے بھی لے جائیے ابا جان میں یہاں رہ کے کیا کروں گی۔''

وہ بار بار اپنا سر ان کی پٹی سے پٹک رہی تھی ''مجھے کیا پتہ تھا ابا آپ ہم سے روٹھ جائیں گے۔ ہم اور کچھ دیر آپ سے باتیں کرلیتے' میرے ابا بات کیجئے ایک بار صرف ایک بار جواب دے دیجئے۔''

وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی بس اتنا یاد ہے کہ جب ابا کو غسل دینے کے لیے لے جانا تھا تو وہ پٹی کو چھوڑ نہیں رہی تھی اور جب ان کو آخری منزل تک پہنچانے کے لئے اٹھایا گیا تو وہ پائے سے لپٹ گئی۔

''ابو..... مجھے بھی ابا کے ساتھ لے جائیے۔''

میں نے اسے سنبھالنا چاہا تو وہ تڑپ کر بولی۔

''جانے دیجئے پھوپھو..... مجھے جانے دیجئے ..... ہائے میرے ابا.....''

وہ جنازے کے پیچھے کتنی ہی دُور تک چلی گئی پھر کوئی اسے تھام کر واپس لایا تو وہ بے سدھ سی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

ابا کے چلے جانے سے زندگی میں ایک خلاء پیدا ہوگیا تھا' ہر شے کھوکھلی اور اُداس اُداس سی تھی۔ آنکھوں سے تو آنسوؤں تک کا ذخیرہ ختم ہوچکا تھا۔ مونا ہر وقت اُداس سی دیوار کے ساتھ لگی بیٹھی رہتی۔ یا پھر اپنے کمرے میں چلی جاتی اور دروازہ اندر سے بند کرلیتی۔

ابا کی وفات کا دُکھ بھی کوئی معمولی بات نہ تھی اس پر تعزیت کے لئے آئے ہوئے مہمانوں کی سینہ چھلنی کردینے والی باتیں' مرنے والے کی ذات سے ہمیشہ کی جدائی کا غم تو صرف ہم تین ہستیوں کو ہی تھا باقی تو سب تماشا دیکھنے والے تھے اور ان تماشا دیکھنے والوں میں زیادہ تعداد میرے سوتیلے بھائیوں اور ان کی بیویوں کی تھی۔ ان کی باتیں اتنی بے معنی اور دل دکھا دینے والی تھیں' موضوع سخن بھابی کی ذات تھی جن کے کردار پر کیچڑ اچھالی جارہی تھی جنہیں آوارہ اور بدمعاش کہا جارہا تھا اور طرح طرح کے بے بنیاد الزام دیئے جارہے تھے۔ مونا بھی سُن رہی تھی اور پیچ وتاب کھا رہی تھی۔ اتنی بے بنیاد باتیں سُن سُن کر مجھے بھی انتہائی غصہ آرہا تھا۔ لیکن بولنے والوں کی زبان تو پکڑی نہیں جاسکتی اور جب لوگ حقیقت حال سے بے خبر ہوں تو قیاس آرائیاں کیا ہی کرتے ہیں۔ دل جل جل کر کوئلہ ہورہا تھا۔ اس دکھ درد میں ساتھ نہیں دے سکتے تھے تو کم از کم دل کو جلا دینے والی باتیں ہی نہ کرتے۔

مونا تنگ آکر اپنے کمرے میں بند ہوچکی تھی' اس کے سامنے ایزل رکھا رہتا اور وہ تصویریں بناتی رہتی۔ ایک بے جان انسان کی تصویریں ایک ایسی ہستی کی تصویریں جس کے چہرے پر خلوص تھا' شفقت تھی' نرمی اور ملائمت تھی لیکن ..... آنکھوں میں جان نہ تھی اور جب اس کی پہلی تصویر مکمل ہوگئی تو اس نے ایزل پر سر رکھ دیا۔

''ابا' آپ سے کس نے کہا تھا یوں چپکے سے چلے جائیے..... بتائیے اس سر پر دست شفقت کون پھیرے گا..... میں تو پہلے ہی زندگی کی راہوں پر بھٹک رہی تھی ابا اب میری راہبری کون کرے گا..... ابا ..... امی کا غم کیا کم تھا..... کہ آپ بھی روٹھ گئے..... میں ..... میں کتنی بدقسمت ہوں..... میرے اللہ..... میں مرکیوں نہیں جاتی.....''

میں اس کے کمرے میں اس کے پاس ہی جارہی تھی' آواز سُن کر دروازے پر ہی رُک گئی۔ وہ ایزل پر سر رکھے تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ میری اپنی حالت ایسی تھی کہ دل سنبھلتا ہی نہ تھا' کوئی تسلی دینے والا نہ تھا۔ کوئی غمگسار نہ تھا۔ بھائی اور بھابیاں بالکل مہمانوں کی طرح تھے۔ انہیں صرف اچھا کھانا چاہئے تھا اور تنقید کے لئے موضوع۔ کس سے دردِ دل کہتی۔

ان حالات میں ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھیں یا بوڑھی سوسن' اس وقت بھی میں نے آگے بڑھ کے اسے سنبھال لیا۔ ایزل پر ابا جان کی تصویر تھی۔ مسکراتے ہوئے لب' کشادہ پیشانی اور بند آنکھیں' دل سے اک ہوک سی اُٹھی۔ جانے والے کو مونا کی انگلیوں نے کاغذ پر منتقل کرلیا تھا۔ ہم کتنی ہی دیر سامنے رکھی تصویر کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہاتی رہیں۔

سات روز سات سال بن کر گزرے۔ اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ہر لحہ تنقید کرنے والے لوگ چلے گئے۔ سب کے جانے سے کم از کم ذہنی سکون تو ملا تھا لیکن اُداسیاں طویل تر ہوچکی تھیں۔ یاس و غم کے سائے چاروں طرف پھیل چکے تھے اور دن اور راتیں آنسوؤں اور آہوں کی نمی میں ڈوب چکی تھیں پر..... زندگی کی گاڑی بھی کبھی رُکی ہے..... قدرت کے اصول بھی کتنے تلخ لیکن اٹل ہیں..... وہ دُکھ دیتا ہے..... تو مرہم بھی لگاتا ہے۔

اور یوں ہی ہماری زندگی کی گاڑی بھی یاس و غم کے بوجھ تلے دبی آگے بڑھنے لگی۔

کالج کھلے تو مونا نے ایف اے میں داخلہ لے لیا اور میں نے ایم ایس سی جوائن کرلیا۔ وقت گزارنے کے لئے کوئی بہانہ بھی تو چاہئے۔

بھیا تو اب میرے فرض سے سبکدوش ہونے کا سوچ رہے تھے لیکن میری سوچیں ان سے مختلف تھیں۔ مونا کو کسی سہارے کسی دوست و غمگسار کی ضرورت تھی اور ان حالات میں جب ابا بھی دنیا میں نہیں تھے میں اسے اپنی رفاقت میں رکھ کر اسے زندگی کی صحیح اقدار سکھانا چاہتی تھی۔ وقت کا چکر دھیرے دھیرے چلتا گیا اور دو سال بیت گئے۔ ان دو سالوں نے مونا کو ایک نمایاں مقام بخش دیا۔ وہ بہترین طالبہ' بہترین مقررہ' بہترین کھلاڑی اور بہترین آرٹسٹ بن گئی اور اس نمایاں کردار کی وجہ سے وہ بہت سے حلقوں میں سراہی جانے لگی۔ اس کا حلقہ احباب وسیع ہوگیا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں سبھی اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے اور وہ ان دنوں زندگی سے خاصی مطمئن نظر آتی تھی..... میں خوش تھی کہ اس کا ذہن تعمیری کاموں میں مصروف ہوگیا ہے..... اور بھیا خوش تھے کہ میں نے انہیں یہ کہنا چھوڑ دیا ہے کہ مونا کو ان کے پیار کی ضرورت ہے..... وہ تو اکثر گھر سے باہر رہنے لگے تھے ان کی مصروفیات کیا تھیں میں لاعلم تھی۔

نومبر کا مہینہ تھا اور سردیوں کی آمد آمد تھی۔ الحمرا میں نئے فنکاروں کی پینٹنگز کی نمائش تھی۔ مونا نے اپنی پینٹنگز ''ماں اور شفیق مُردہ'' نمائش میں رکھی تھیں۔ ماں میں اس نے بھابی کی شبیہ کو پیش کیا تھا خلوص' محبت' شفقت اور ممتا کا مجسمہ اور ان کے قدموں میں جھکی ہوئی وہ خود تھی۔ ماں کا ہاتھ بیٹی کے بالوں کو سلجھا رہا تھا اور لب مسکرا رہے تھے۔ تصویر دیکھتے ہی دل میں ایک عجیب سا تاثر پیدا ہونے لگتا۔ شفیق مُردے میں ابا جان کی تصویر تھی وہی جو

اس نے ابا جان کی وفات کے بعد بنائی تھی۔ بند آنکھیں اور مسکراتے ہوئے لب اور سامنے بیٹھی ہوئی بکھرے بالوں اور بہتے ہوئے آنسوؤں سے تر چہرہ لئے ایک انتہائی اُداس لڑکی۔ دونوں تصویریں بڑی مکمل اور اچھی تھیں اور ان میں ایک ایسا تاثر تھا جو اس عمر کے کسی دوسرے فنکار کے یہاں نہیں تھا۔ میں کتنی ہی دیر کھڑی تصویروں کو دیکھتی رہی۔ الحمرا میں خاصا رش تھا بہت سی اور بھی تصویریں تھیں۔ ڈوبتے سورج کی' اُبھرتے چاند کی' بہتے پانی کی' گاؤں کی الہڑ دوشیزہ کی' غرض زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نئے فنکاروں نے پیش کیا تھا اور ہر تصویر اپنی جگہ بڑی اچھی تھی لیکن چنتا جھمکلا مونا کی تصویروں کے گرد تھا اور کہیں نہیں تھا۔

الحمرا کے در و دیوار روشنیوں میں جگمگا رہے تھے ریشمی لباسوں کی سرسراہٹ تھی اور قیمتی عطروں کی خوشبو' انگریزی' اردو' پنجابی' بنگالی' پشتو ہر قسم کی بولی بولنے والے موجود تھے۔ میں ساری نمائش دیکھ کر باہر نکل رہی تھی کہ سامنے دروازے کے ساتھ مونا کھڑی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ کچھ دیر پہلے روئی ہے۔

''کیا ہوا مونا؟'' میں نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں پھوپھو.....'' وہ گھبرا سی گئی۔ ''تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟''..... وہ..... یوں ہی..... یونہی پھوپھو.....'' وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی تھی اور اس وقت میں نے بھی کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ساری بات مجھ پر ظاہر ہو گئی۔

میں اپنی ایک دوست کے ساتھ راہ سے ذرا ہٹ کر کھڑی تھی رات کی تاریکی پھیل چکی تھی اور روشنیاں' سفید روشنیاں مسکرا رہی تھیں۔ کچھ لوگ اندر جا رہے تھے کچھ آ رہے تھے انہیں آنے جانے والوں میں میرے سامنے سے گزرنے والی ایک دُبلی پتلی عورت نے مجھے چونکا دیا۔ ہلکے آسمانی سوٹ میں ملبوس وہ عورت بڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ چہرے پر اُداسی کی دبیز تہہ تھی اور سر کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ چند لمحے میں اس قریب آتے سراپا کا جائزہ لیتی رہی اور پھر..... پھر میں بھاگتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

''بھابی..... بھابی جان.....'' میں ان سے لپٹ گئی۔ میری زبان پر صرف ایک ہی لفظ تھا..... وہ کتنی کمزور لگ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور بے اختیار میری پیشانی' میری آنکھوں اور رخساروں کو چومنے لگیں۔

''راجی..... راضیہ.....''

اور جب ہمارے حواس بجا ہوئے تو ہم سب سے ہٹ کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ میرا دل ان سے بہت کچھ پوچھ لینے کو چاہ رہا تھا۔

''آپ تو کہیں کھو ہی گئیں بھابی..... میرا کتنا کتنا دل چاہا ہے آپ سے ملنے کو.....'' میں نے کہا ''کہاں کہاں آپ کو تلاش نہیں کیا..... لیکن آپ کہیں بھی نہ ملیں.....'' ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کسی کو منہ دکھانے کے قابل کہاں رہ گئی تھی راجی..... یہ شہر ہی چھوڑ دیا..... اِدھر اُدھر سکون کی تلاش میں بھٹکتی رہی لیکن سکون کوئی خریدی جانے والی چیز تو نہیں۔'' انہوں نے آنسو پونچھے۔

''ابا جان کی وفات کی خبر سنی تو دل اتنا تڑپا.....

اس مشفق ہستی کو ایک بار آخری بار دیکھ لینے کو اتنا جی چاہا تھا راجی لیکن اس گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے تھے راجی کیسے چلی جاتی..... مونا کو ملنے کے لئے دل نے تڑپ تڑپ کر خواہش کی..... راتوں کو بستر انگارے بن جاتا تھا لیکن کیسے ملتی؟ پھر یہ بھی خطرہ تھا اگر چوری چھپے اسے کہیں مل بھی لوں تو وہ خدا جانے کیا اثر لے اس لئے اکیلے ہی آنسو بہاتی رہی اس کے سوا کیا کر سکتی تھی۔''

''آپ نے کبھی خط بھی تو نہ لکھا بھابی۔''

''خط..... ہاں..... کئی بار خط لکھے ہیں..... لیکن انہیں پوسٹ کبھی نہ کر سکی..... صبح شام خط لکھا کرتی تھی راجی..... لیکن تمہیں خط بھیجتی بھی تو کیسے؟ سوچتی تھی کہیں تم بھی مجھے قابل اعتناء نہ سمجھو..... تو؟ اور میں..... اسی خوش فہمی میں رہنا چاہتی تھی..... کہ تم .....تم مجھے اب بھی اپنا سمجھتی ہو.....''

''بھابی.....'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میں نے کیسے کیسے جتن نہیں کئے کہ بھیا اپنا فیصلہ بدل ڈالیں..... میں نے انہیں مونا کا واسطہ دیا لیکن وہ تو پتھر بن چکے تھے۔ ابا نے مجھے ساری حقیقت بتا دی تھی بھابی وہ تو اسی روز سے پلنگ سے لگ گئے تھے جب آپ نے گھر کو چھوڑا اور اسی غم نے ان کی جان لے لی۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے میں روز حشر مجیب کو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

''سب کچھ سُن کر کیا تم نے بھی مجھے قصور وار سمجھا تھا راجی؟'' بھابی کی آنکھوں میں ایک التجا تھی رحم کی التجا۔ میں رو پڑی۔

''آپ کا اس میں کیا قصور تھا بھابی' میں جانتی ہوں اس دور میں رقیبوں کو قابل رحم نہیں سمجھا جاتا۔ میں نے آپ کے بھائی کو کئی بار آپ کے پاس آتے دیکھا تھا۔ لیکن مجھے حقیقت حال کی کوئی خبر نہ تھی لیکن یہی سوچتی تھی..... آپ حسب عادت ایک غریب کی مدد کر رہی ہیں اور جب ابا نے مجھے ساری بات بتائی تو میرے دل میں آپ کے لئے عزت زیادہ بڑھ گئی۔

لیکن..... بھیا کو کون سمجھاتا..... مجھے تو ڈر تھا..... مونا اس سارے لمحے کا بہت بُرا اثر لے گی لیکن خدا کا شکر ہے وہ سنبھل چکی ہے۔ میں ذرا سا رُکی' مانی کا کیا حال ہے؟ وہ تو اب خاصا بڑا ہو چکا ہوگا۔'' بھابی کا سر ایک دم جھک گیا اور ان کے چہرے پر یاس کا سایہ کچھ اور گہرا ہو گیا۔

''وہ..... وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے راجی.....''

''بھابی..... ایسا نہ کہئے۔'' میں نے تڑپ کر ہاتھ ان کے منہ پر رکھ دیا۔ وہی تو بھابی کا آخری سہارا تھا۔

''ہاں راجی! اس ظالم دنیا میں رہنا اس نے بھی پسند نہ کیا۔'' ان کی آواز رندھ گئی۔ ''میں ہی اتنی بدقسمت ہوں کہ کسی کو میرا ساتھ پسند نہیں۔''

''یہ حادثہ کب ہوا..... کیسے ہوا.....؟'' میں نے روتے ہوئے پوچھا۔

''اسے ٹائیفائیڈ ہوا تھا راجی..... جو بگڑ گیا..... اور مانی چار مہینے بیمار رہ کر اسی بیماری کی نظر ہو گیا..... اس وقت اس کی عمر تین سال تھی راجی.....'' بھابی نے روتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''اس کے ساتھ دل بہلا رہتا تھا لیکن اب' اب تو پہاڑ سے دن اور راتیں کاٹے نہیں کٹتے۔''

کافی دیر ہم دونوں چپ چاپ آنسو بہاتی رہیں پھر میں نے ہی اس بوجھل سکوت کو توڑا۔

پگڈنڈی

نوشابہ اختر

(قسط:3)

رشتوں کی ڈور انسان کو جینے کی قوت عطا کرتی ہے اور اس سے بندھ کر ہم خود کو زندگی کے جھمیلوں میں مصروف کر لیتے ہیں گویا ہمیں قدرت نے زندگی کے تمام مسائل کا حل تلاش کرنے کا سہارا فراہم کر دیا ہو۔ لیکن بعض اوقات یہی ڈور اُلجھ جاتی ہے اور سفر زیست انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر انسان اپنے رشتوں کی تلاش میں سرپٹختا رہ جاتا ہے۔ نوشابہ اختر کا نام اب سیارہ ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے جانا پہچانا نام ہے' اُن کی کہانیوں میں رشتوں کے بندھن اور اُن سے بندھے انسانوں کا احوال اس قدر پُراثر انداز میں سامنے آتا ہے کہ قاری خود کو کہانی کا کردار تصور کرنے لگتا ہے اور اسی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے جس میں کردار کو دکھایا گیا ہوتا ہے۔ زیر نظر ناول بھی ایسے ہی کرداروں پر مبنی ہے جو ہمیں اپنے آس پاس اور دیکھے بھالے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا بنیادی خیال بھی ایسا ہے کہ لگتا ہے یہ ہماری ہی کہانی ہے۔

''پگڈنڈی'' میں جذبات و احساسات کی اس خوبصورتی سے ترجمانی کی گئی ہے کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کہانی کو پڑھتے ہی جائیں اور جب تک ناول مکمل نہ ہو جائے وقفہ نہ آنے پائے۔ یہی ایک اچھے ناول کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ قاری کو اپنے سحر میں مبتلا کر دے اور پڑھنے والا اُس کی اگلی قسط کے انتظار میں رہے۔ نوشابہ اختر کا یہ یادگار ناول آپ کو یقیناً پسند آئے گا' اپنی رائے سے ہمیں ضرور آگاہ کریں!

(ایڈیٹر)

مونا کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ سنبھالے سنبھل ہی نہ رہی تھی۔ ابا کے ساتھ اسے بہت زیادہ پیار تھا۔ ابا اسے اپنے پاس بٹھائے چھوٹی چھوٹی نصیحتیں کرتے رہتے اور وہ بھی ان کی باتوں کا بہت احترام کرتی۔ آج وہ ہستی بھی اس سے چھن گئی اس کا تڑپنا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے بلک بلک کر اللہ میاں سے شکوہ کیا۔ ہمارے لئے نہیں تو اس دکھیا کے لئے ہی انہیں زندہ رہنے کی کچھ اور مہلت مل جاتی لیکن جانے والی عزیز ہستی ہر دُکھ' ہر پریشانی اور ہر غم سے بے نیاز آنکھیں بند کئے مسکرا رہی تھی۔ ہر لمحہ دعائیں کرنے والے دو اور ہاتھ منوں مٹی تلے دب جائیں گے اور ہم چپ چاپ آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے۔

روتے تڑپتے دوپہر سے شام ہوگئی' جانے والے کی آخری رسوم ادا کی جا رہی تھیں۔ بھیا سب کچھ خود کروا رہے تھے لیکن بالکل بے جان مجسمے کی

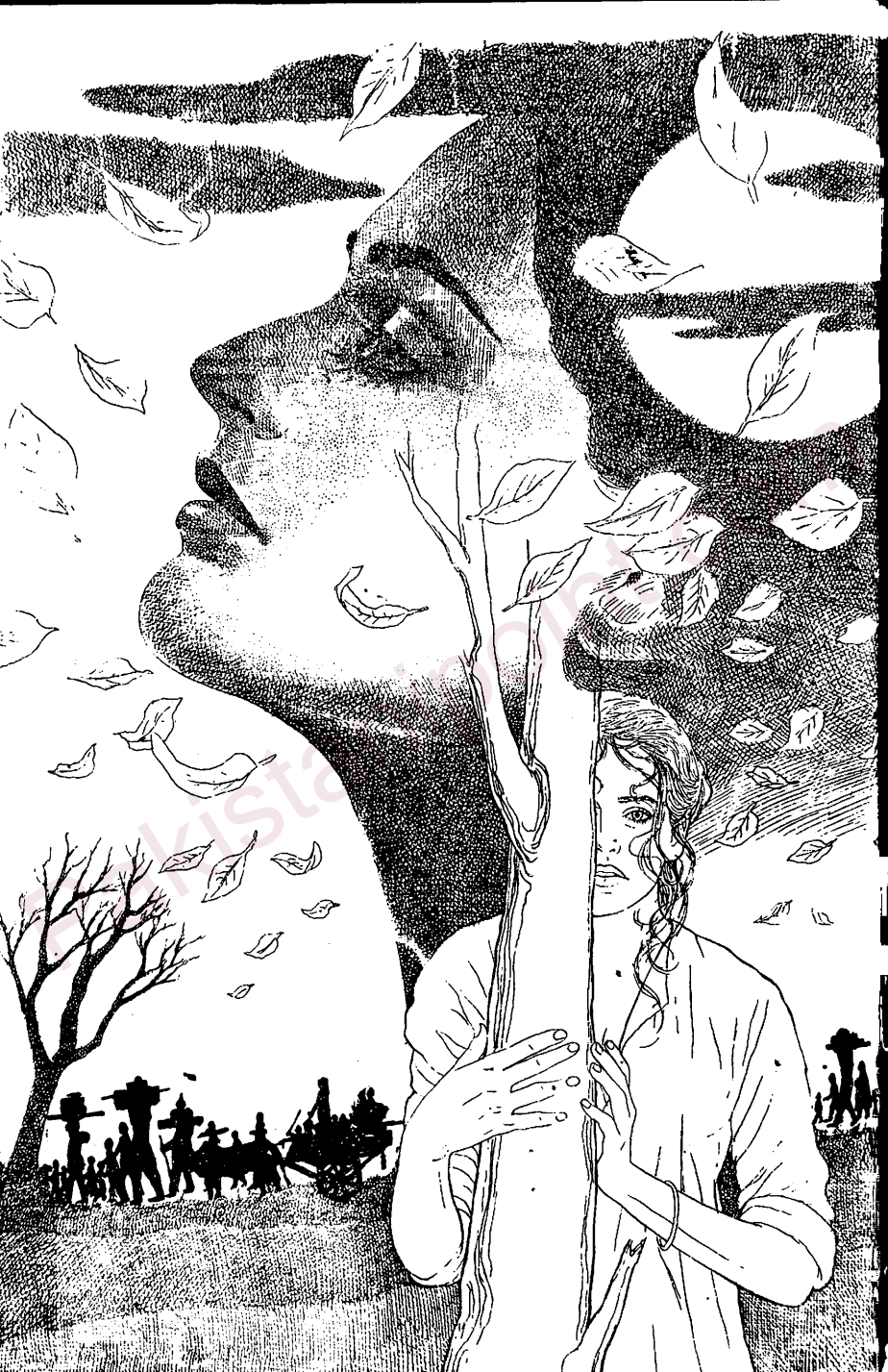

طرح مونا اس وقت سے ابا کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔

''ابا نہ جائیے ابا جان.....'' اس کی آواز روتے روتے بند ہوچکی تھی ''مجھے بھی لے جائیے ابا جان میں یہاں رہ کے کیا کروں گی۔''

وہ بار بار اپنا سر ان کی پٹی سے پٹک رہی تھی ''مجھے کیا پتہ تھا ابا آپ ہم سے روٹھ جائیں گے۔ ہم اور کچھ دیر آپ سے باتیں کرلیتے' میرے ابا بات کیجئے ایک بار صرف ایک بار جواب دے دیجئے۔''

وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی بس اتنا یاد ہے کہ جب ابا کو غسل دینے کے لیے لے جانا تھا تو وہ پٹی کو چھوڑ نہیں رہی تھی اور جب ان کو آخری منزل تک پہنچانے کے لئے اٹھایا گیا تو وہ پائے سے لپٹ گئی۔

''ابو..... مجھے بھی ابا کے ساتھ لے جائیے۔''

میں نے اسے سنبھالنا چاہا تو وہ تڑپ کر بولی۔

''جانے دیجئے پھوپھو..... مجھے جانے دیجئے ..... ہائے میرے ابا.....''

وہ جنازے کے پیچھے کتنی ہی دُور تک چلی گئی پھر کوئی اسے تھام کر واپس لایا تو وہ بے سدھ سی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

ابا کے چلے جانے سے زندگی میں ایک خلاء پیدا ہوگیا تھا' ہر شے کھوکھلی اور اُداس اُداس سی تھی۔ آنکھوں سے تو آنسوؤں تک کا ذخیرہ ختم ہوچکا تھا۔ مونا ہر وقت اُداس سی دیوار کے ساتھ لگی بیٹھی رہتی۔ یا پھر اپنے کمرے میں چلی جاتی اور دروازہ اندر سے بند کرلیتی۔

ابا کی وفات کا دُکھ بھی کوئی معمولی بات نہ تھی اس پر تعزیت کے لئے آئے ہوئے مہمانوں کی سینہ چھلنی کردینے والی باتیں' مرنے والے کی ذات سے ہمیشہ کی جدائی کا غم تو صرف ہم تین ہستیوں کو ہی تھا باقی تو سب تماشا دیکھنے والے تھے اور ان تماشا دیکھنے والوں میں زیادہ تعداد میرے سوتیلے بھائیوں اور ان کی بیویوں کی تھی۔ ان کی باتیں اتنی بے معنی اور دل دکھا دینے والی تھیں' موضوع سخن بھائی کی ذات تھی جن کے کردار پر کیچڑ اچھالی جارہی تھی جنہیں آوارہ اور بدمعاش کہا جارہا تھا اور طرح طرح کے بے بنیاد الزام دیئے جارہے تھے۔ مونا بھی سُن رہی تھی اور پیچ وتاب کھا رہی تھی۔ اتنی بے بنیاد باتیں سُن سُن کر مجھے بھی انتہائی غصہ آرہا تھا۔ لیکن بولنے والوں کی زبان تو پکڑی نہیں جاسکتی اور جب لوگ حقیقت حال سے بے خبر ہوں تو قیاس آرائیاں کیا ہی کرتے ہیں۔ دل جل جل کر کوئلہ ہورہا تھا۔ اس دکھ درد میں ساتھ نہیں دے سکتے تھے تو کم از کم دل کو جلا دینے والی باتیں ہی نہ کرتے۔

مونا تنگ آکر اپنے کمرے میں بند ہوچکی تھی' اس کے سامنے ایزل رکھا رہتا اور وہ تصویریں بناتی رہتی۔ ایک بے جان انسان کی تصویریں ایک ایسی ہستی کی تصویریں جس کے چہرے پر خلوص تھا' شفقت تھی' نرمی اور ملائمت تھی لیکن ..... آنکھوں میں جان نہ تھی اور جب اس کی پہلی تصویر مکمل ہوگئی تو اس نے ایزل پر سر رکھ دیا۔

''ابا' آپ سے کس نے کہا تھا یوں چپکے سے چلے جائیے..... بتائیے اس سر پر دست شفقت کون پھیرے گا..... میں تو پہلے ہی زندگی کی راہوں پر بھٹک رہی تھی ابا اب میری راہبری کون کرے گا..... ابا ..... امی کا غم کیا کم تھا..... کہ آپ بھی روٹھ گئے..... میں..... میں کتنی بدقسمت ہوں..... میرے اللہ..... میں مر کیوں نہیں جاتی.....''

میں اس کے کمرے میں اس کے پاس ہی جارہی تھی' آواز سُن کر دروازے پر ہی رُک گئی۔ وہ ایزل پر سر رکھے تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ میری اپنی حالت ایسی تھی کہ دل سنبھلتا ہی نہ تھا' کوئی تسلی دینے والا نہ تھا۔ کوئی غمگسار نہ تھا۔ بھائی اور بھابیاں بالکل مہمانوں کی طرح تھے۔ انہیں صرف اچھا کھانا چاہئے تھا اور تنقید کے لئے موضوع۔ کس سے دردِ دل کہتی۔

ان حالات میں ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھیں یا بوڑھی سوسن' اس وقت بھی میں نے آگے بڑھ کے اسے سنبھال لیا۔ ایزل پر ابا جان کی تصویر تھی۔ مسکراتے ہوئے لب' کشادہ پیشانی اور بند آنکھیں' دل سے اک ہوک سی اُٹھی۔ جانے والے کو مونا کی انگلیوں نے کاغذ پر منتقل کرلیا تھا۔ ہم کتنی ہی دیر سامنے رکھی تصویر کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہاتی رہیں۔

سات روز سات سال بن کر گزرے۔ اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ہر لمحہ تنقید کرنے والے لوگ چلے گئے۔ سب کے جانے سے کم از کم ذہنی سکون تو ملا تھا لیکن اُداسیاں طویل تر ہوچکی تھیں۔ یاس وغم کے سائے چاروں طرف پھیل چکے تھے اور دن اور راتیں آنسوؤں اور آہوں کی نمی میں ڈوب چکی تھیں پر..... زندگی کی گاڑی بھی کبھی رُکی ہے..... قدرت کے اصول بھی کتنے تلخ لیکن اٹل ہیں..... وہ دُکھ دیتا ہے..... تو مرہم بھی لگاتا ہے۔

اور یوں ہی ہماری زندگی کی گاڑی بھی یاس وغم کے بوجھ تلے دبی آگے بڑھنے لگی۔

کالج کھلے تو مونا نے ایف اے میں داخلہ لے لیا اور میں نے ایم ایس سی جوائن کرلیا۔ وقت گزارنے کے لئے کوئی بہانہ بھی تو چاہئے۔

بھیا تو اب میرے فرض سے سبکدوش ہونے کا سوچ رہے تھے لیکن میری سوچیں ان سے مختلف تھیں۔ مونا کو کسی سہارے کسی دوست وغمگسار کی ضرورت تھی اور ان حالات میں جب ابا بھی دنیا میں نہیں تھے میں اسے اپنی رفاقت میں رکھ کر اسے زندگی کی صحیح اقدار سکھانا چاہتی تھی۔ وقت کا چکر دھیرے دھیرے چلتا گیا اور دو سال بیت گئے۔ ان دو سالوں نے مونا کو ایک نمایاں مقام بخش دیا۔ وہ بہترین طالبہ' بہترین مقررہ' بہترین کھلاڑی اور بہترین آرٹسٹ بن گئی اور اس نمایاں کردار کی وجہ سے وہ بہت سے حلقوں میں سراہی جانے لگی۔ اس کا حلقہ احباب وسیع ہوگیا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں سبھی اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے اور وہ ان دنوں زندگی سے خاصی مطمئن نظر آتی تھی..... میں خوش تھی کہ اس کا ذہن تعمیری کاموں میں مصروف ہوگیا ہے..... اور بھیا خوش تھے کہ میں نے انہیں یہ کہنا چھوڑ دیا ہے کہ مونا کو ان کے پیار کی ضرورت ہے..... وہ تو اکثر گھر سے باہر رہنے لگے تھے ان کی مصروفیات کیا تھیں میں لاعلم تھی۔

نومبر کا مہینہ تھا اور سردیوں کی آمد آمد تھی۔ الحمرا میں نئے فنکاروں کی پینٹنگز کی نمائش تھی۔ مونا نے اپنی پینٹنگز ''ماں اور شفیق مُردہ'' نمائش میں رکھی تھیں۔ ماں میں اس نے بھابی کی شبیہ کو پیش کیا تھا خلوص' محبت' شفقت اور ممتا کا مجسمہ اور ان کے قدموں میں جھکی ہوئی وہ خود تھی۔ ماں کا ہاتھ بیٹی کے بالوں کو سلجھا رہا تھا اور لب مسکرا رہے تھے۔ تصویر دیکھتے ہی دل میں ایک عجیب سا تاثر پیدا ہونے لگتا۔ شفیق مُردے میں ابا جان کی تصویر تھی وہی جو

اس نے ابا جان کی وفات کے بعد بنائی تھی۔ بند آنکھیں اور مسکراتے ہوئے لب اور سامنے بیٹھی ہوئی بکھرے بالوں اور بہتے ہوئے آنسوؤں سے تر چہرہ لئے ایک انتہائی اُداس لڑکی۔ دونوں تصویریں بڑی مکمل اور اچھی تھیں اور ان میں ایک ایسا تاثر تھا جو اس عمر کے کسی دوسرے فنکار کے یہاں نہیں تھا۔ میں کتنی ہی دیر کھڑی تصویروں کو دیکھتی رہی۔ الحمرا میں خاصا رش تھا بہت سی اور بھی تصویریں تھیں۔ ڈوبتے سورج کی' اُبھرتے چاند کی' بہتے پانی کی' گاؤں کی الہڑ دوشیزہ کی' غرض زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نئے فنکاروں نے پیش کیا تھا اور ہر تصویر اپنی جگہ بڑی اچھی تھی لیکن چنا جھمکتا مونا کی تصویروں کے گرد تھا اور کہیں نہیں تھا۔

الحمرا کے در و دیوار روشنیوں میں جگمگا رہے تھے ریشمی لباسوں کی سرسراہٹ تھی اور قیمتی عطروں کی خوشبو' انگریزی' اردو' پنجابی' بنگالی' پشتو ہر قسم کی بولی بولنے والے موجود تھے۔ میں ساری نمائش دیکھ کر باہر نکل رہی تھی کہ سامنے دروازے کے ساتھ مونا کھڑی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ کچھ دیر پہلے روئی ہے۔

''کیا ہوا مونا؟'' میں نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں..... کچھ بھی تو نہیں پھوپھو.....'' وہ گھبرا سی گئی۔ ''تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟''..... وہ..... یوں ہی..... یونہی پھوپھو.....'' وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی تھی اور اس وقت میں نے بھی کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ساری بات مجھ پر ظاہر ہو گئی۔

میں اپنی ایک دوست کے ساتھ راہ سے ذرا ہٹ کر کھڑی تھی رات کی تاریکی پھیل چکی تھی اور روشنیاں' سفید روشنیاں مسکرا رہی تھیں۔ کچھ لوگ اندر جا رہے تھے کچھ آ رہے تھے انہیں آنے جانے والوں میں میرے سامنے سے گزرنے والی ایک دُبلی پتلی عورت نے مجھے چونکا دیا۔ ہلکے آسمانی سوٹ میں ملبوس وہ عورت بڑی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ چہرے پر اُداسی کی دبیز تہہ تھی اور سر کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ چند لمحے میں اس قریب آتے سراپا کا جائزہ لیتی رہی اور پھر..... پھر میں بھاگتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

''بھابی..... بھابی جان.....'' میں ان سے لپٹ گئی۔ میری زبان پر صرف ایک ہی لفظ تھا..... وہ کتنی کمزور لگ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور بے اختیار میری پیشانی' میری آنکھوں اور رخساروں کو چومنے لگیں۔

''راجی..... راضیہ.....''

اور جب ہمارے حواس بجا ہوئے تو ہم سب سے ہٹ کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔ میرا دل ان سے بہت کچھ پوچھ لینے کو چاہ رہا تھا۔

''آپ تو کہیں کھو ہی گئیں بھابی..... میرا کتنا کتنا دل چاہا ہے آپ سے ملنے کو.....'' میں نے کہا ''کہاں کہاں آپ کو تلاش نہیں کیا..... لیکن آپ کہیں بھی نہ ملیں.....'' ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کسی کو منہ دکھانے کے قابل کہاں رہ گئی تھی راجی..... یہ شہر ہی چھوڑ دیا..... اِدھر اُدھر سکون کی تلاش میں بھٹکتی رہی لیکن سکون کوئی خریدی جانے والی چیز تو نہیں۔'' انہوں نے آنسو پونچھے۔

''ابا جان کی وفات کی خبر سنی تو دل اتنا تڑپا.....

اس مشفق ہستی کو ایک بار آخری بار دیکھ لینے کو اتنا جی چاہا تھا راجی لیکن اس گھر کے دروازے مجھ پر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے تھے راجی کیسے چلی جاتی..... مونا کو ملنے کے لئے دل نے تڑپ تڑپ کر خواہش کی..... راتوں کو بستر انگارے بن جاتا تھا لیکن کیسے ملتی؟ پھر یہ بھی خطرہ تھا اگر چوری چھپے اسے کہیں مل بھی لوں تو وہ خدا جانے کیا اثر لے اس لئے اکیلے ہی آنسو بہاتی رہی اس کے سوا کیا کر سکتی تھی۔''

''آپ نے کبھی خط بھی تو نہ لکھا بھابی۔''

''خط..... ہاں..... کئی بار خط لکھے ہیں..... لیکن انہیں پوسٹ کبھی نہ کر سکی..... صبح شام خط لکھا کرتی تھی راجی..... لیکن تمہیں خط بھیجتی بھی تو کیسے؟ سوچتی تھی کہیں تم بھی مجھے قابل اعتناء نہ سمجھو..... تو؟ اور میں..... اسی خوش فہمی میں رہنا چاہتی تھی..... کہ تم .....تم مجھے اب بھی اپنا سمجھتی ہو.....''

''بھابی.....'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''میں نے کیسے کیسے جتن نہیں کئے کہ بھیا اپنا فیصلہ بدل ڈالیں..... میں نے انہیں مونا کا واسطہ دیا لیکن وہ تو پتھر بن چکے تھے۔ ابا نے مجھے ساری حقیقت بتا دی تھی بھابی وہ تو اسی روز سے پلنگ سے لگ گئے تھے جب آپ نے گھر کو چھوڑا اور اسی غم نے ان کی جان لے لی۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے میں روز حشر مجیب کو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

''سب کچھ سُن کر کیا تم نے بھی مجھے قصور وار سمجھا تھا راجی؟'' بھابی کی آنکھوں میں ایک التجا تھی رحم کی التجا۔ میں رو پڑی۔

''آپ کا اس میں کیا قصور تھا بھابی' میں جانتی ہوں اس دور میں رقیبوں کو قابل رحم نہیں سمجھا جاتا۔ میں نے آپ کے بھائی کو کئی بار آپ کے پاس آتے دیکھا تھا۔ لیکن مجھے حقیقت حال کی کوئی خبر نہ تھی لیکن یہی سوچتی تھی..... آپ حسب عادت ایک غریب کی مدد کر رہی ہیں اور جب ابا نے مجھے ساری بات بتائی تو میرے دل میں آپ کے لئے عزت زیادہ بڑھ گئی۔

لیکن ..... بھیا کو کون سمجھاتا..... مجھے تو ڈر تھا..... مونا اس سارے المیئے کا بہت بُرا اثر لے گی لیکن خدا کا شکر ہے وہ سنبھل چکی ہے۔ میں ذرا سا رُکی' مانی کا کیا حال ہے؟ وہ تو اب خاصا بڑا ہو چکا ہوگا۔'' بھابی کا سر ایک دم جھک گیا اور ان کے چہرے پر یاس کا سایہ کچھ اور گہرا ہو گیا۔

''وہ ..... وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے راجی.....''

''بھابی ..... ایسا نہ کہئے۔'' میں نے تڑپ کر ہاتھ ان کے منہ پر رکھ دیا۔ وہی تو بھابی کا آخری سہارا تھا۔

''ہاں راجی! اس ظالم دنیا میں رہنا اس نے بھی پسند نہ کیا۔'' ان کی آواز رندھ گئی۔ ''میں ہی اتنی بدقسمت ہوں کہ کسی کو میرا ساتھ پسند نہیں۔''

''یہ حادثہ کب ہوا..... کیسے ہوا.....؟'' میں نے روتے ہوئے پوچھا۔

''اسے ٹائیفائیڈ ہوا تھا راجی..... جو بگڑ گیا..... اور مانی چار مہینے بیمار رہ کر اسی بیماری کی نظر ہو گیا..... اس وقت اس کی عمر تین سال تھی راجی.....'' بھابی نے روتے ہوئے مجھے بتایا۔ ''اس کے ساتھ دل بہلا رہتا تھا لیکن اب' اب تو پہاڑ سے دن اور راتیں کاٹے نہیں کٹتے۔''

کافی دیر ہم دونوں چپ چاپ آنسو بہاتی رہیں پھر میں نے ہی اس بوجھل سکوت کو توڑا۔

''مونا سے ملیں آپ.....''

اقرار کرتے ہوئے بھابی جھجک رہی تھیں۔

''ہاں کافی دیر پہلے..... جب بہت کم لوگ تھے میں بہت پہلے آ گئی تھی تاکہ اس کی پینٹنگز اور اگر ہو سکے تو اسے بھی ایک نظر دیکھ کے جلد ہی واپس لوٹ جاؤں۔ میں نے اسکی تصویر کشی کی بڑی تعریف سنی تھی۔ میں کھڑی اسی کی تصویریں دیکھ رہی تھی اور حیرانگی میں بھول چکی تھی کہ مجھے واپس بھی جانا ہے اس کی تصویر ماں دیکھ کے میں حیران ہی رہ گئی۔ راجی مجھے تو یقین تھا اتنے سالوں کی تیز دھول نے اس کے ہن سے میرا تصور مٹا دیا ہوگا لیکن' لیکن تصویر' تصویر اپنی زبان سے کہہ رہی تھی کہ نہیں اس نے مجھے اپنے خیالوں میں اب تک بسا رکھا ہے۔''

بھابی کے لبوں پر دُکھ بھری مسکراہٹ تھی۔

''آپ حیران ہوں گی بھابی کہ اس نے ہر وقت ہر لمحہ میں آپ کو یاد کیا ہے۔ اس کی ڈائری میں نے اکثر چوری چوری پڑھی ہے۔ پڑھ کر میں ہمیشہ روئی ہوں۔ بھابی آپ کے چلے جانے سے اس کی زندگی میں اتنا وسیع خلاء پیدا ہو چکا ہے جسے کبھی بھی پُر نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اکثر چھپ کے رویا کرتی تھی اور بہت عرصے تک بالکل کھوئی کھوئی رہی ہے۔ وہ تو بالکل بدل گئی تھی بھابی بالکل سنجیدہ اور خاموش ہوگئی تھی۔ اب میرے ہزاروں وعدے دینے پر اس نے اپنے آپ کو بدلا ہے۔''

''میں ڈرتی ہوں راجی ..... کہیں آج کی ملاقات کا اس پر کوئی بُرا اثر نہ ہو۔'' بھابی گھبرائی ہوئی تھی۔

''نہیں' آپ فکر نہ کیجئے میں اسے سمجھا لوں گی۔''

''اور تمہارے بھائی جان کو بھی اس بات کی خبر نہ ہو۔''

''انشاء اللہ نہیں ہوگی.....''

اسی اثناء میں مونا مجھے ڈھونڈتے ہوئے ادھر آ گئی ''پھوپھو..... آپ یہاں ہیں ..... میں آپ کو .....'' اس نے جملہ پورا نہیں کیا تھا کہ اس کی نظر بھابی پر پڑ گئی۔

''اوہ..... امی..... امی.....'' وہ بڑھ کر ان کے سینے سے لگ گئی ماں بیٹی کا یہ ملاپ بڑا درد انگیز تھا۔ بھابی مونا کے سامنے خاصی عمر رسیدہ لگ رہی تھیں۔ لیکن دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے بھابی کے سراپا سے مونا کا سراپا جنم لے رہا ہے۔ وہ کتنی ہی دیر اپنے رخسار ان کے رخسار سے لگائے کھڑی رہی۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے زبانیں چپ تھی لیکن آنکھیں فریاد کر رہی تھیں بے دردی زمانہ کی فریاد۔

''میں نے کبھی سوچا نہیں تھا امی کہ یوں زندگی میں آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔''

اس نے ان کے شانے سے سر لگا کر درد بھری مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے کہا۔ تو بھابی نے اس کے آنسو پونچھ لئے ''خدا بڑا کارساز ہے بیٹی۔''

''اوہ آج' آج میں کتنی خوش ہوں امی کتنی خوش جی چاہتا ہے یہ نمائش ہمیشہ لگی رہے اور میں آپ کے پاس یوں ہی کھڑی رہوں۔ یہ لمحات امر ہو جائیں امی اور آپ' آپ مجھے اتنی بار بیٹی' بیٹی کہہ کر پکاریں کہ اس دنیا کا سارا شور' سارا ہنگامہ..... سب کچھ صرف اس ایک آواز میں دب کے رہ جائے اور چاروں سمت صرف ایک پکار ہو امی صرف ایک لفظ کی گونج بیٹی' بیٹی' وہ لفظ جو آپ کے مقدس

لبوں سے نکل رہا ہے۔''

وہ اس قدر جذباتی ہو رہی تھی کہ اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔

''میں نے تنہائیوں میں ہمیشہ آپ سے باتیں کی ہیں امی' میں نے آپ کو اتنی بار پکارا ہے امی..... اتنی بار..... کہ آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں..... آخر..... آپ نے میری آواز سُن لی نا..... آپ مجھے ملنے کے لئے آ گئیں امی۔ کاش..... کاش اب ہم کبھی جدا نہ ہوں.....''

وہ اُداس ہوگئی تھی' آنکھوں میں پیدا ہونیوالی خوشی کی جوت یاس وغم کے اندھیروں میں ڈوب گئی تھی۔ ''فانی لمحات کو دائمی نہ سمجھو بیٹی تمہیں واپس لوٹ جانا ہے اور یہ بھول جانا ہے کہ دنیا کے جنگل میں شبنم نام کی کوئی عورت کبھی تمہیں ملی تھی۔'' بھابی کی آواز آنسوؤں کے بوجھ سے بھاری ہو رہی تھی۔

''امی..... یوں نہ کہئے امی..... میری حالت صحراؤں میں بھٹکنے والے پیاسے کی سی ہے۔ مجھے اپنے سینے سے لگا کر اس تشنگی کے احساس کو مٹا دیجئے امی آپ' آپ پھر مجھے راہوں میں چھوڑ کے چلی گئیں تو میں' میں پاگل ہو جاؤں گی امی.....'' وہ پھر رو پڑی۔ ''اسی لئے میں تمہیں ملنے سے ہمیشہ کتراتی رہتی ہوں مونا۔ میرے قدموں میں اتنی بھاری بھاری زنجیریں ہیں بیٹی..... کہ میں تمہاری طرف ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔ تم مجھے کہاں لے جانا چاہتی ہو میری جان۔ بس تنہائیوں میں مجھے یوں ہی ہی پکارتی رہو۔ میری دعائیں' میرا خلوص' میری ممتا سب کچھ تمہارے ہیں بیٹی..... لیکن..... یہ یاد رکھو ہمیں دریا کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے سے دُور رہنا ہے بہت دُور۔''

''اوہ امی..... میں کیا کروں؟'' وہ بے بس آواز میں بولی اور اس کا سر بھابی کے سینے سے جا لگا اور اس وقت مجھے یوں لگا مونا ایک ایسی چھوٹی سی بچی ہے جو سکول سے سزا ملنے پر گھر بھاگ آتی ہے اور ماں کے سینے میں منہ چھپا کر استاد کی تلخ باتوں سے فرار کا راستہ تلاش کرتی ہے۔

رات گہری ہوتی چلی جا رہی تھی' دُور کہیں کلاک ٹاور نے رات کے گیارہ بجنے کا اعلان کیا۔ ہمیں خاصی دیر ہوگئی تھی۔ خنکی بڑھ چکی تھی اور الحمرا کے باغوں میں اور برآمدوں میں اکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔

''رات گہری ہوتی جا رہی ہے مونا..... اب ہمیں گھر جانا چاہئے۔'' میں نے آہستہ سے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ پھر بے بسی سے ماں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی پیشانی چوم لی۔

''جاؤ بیٹی..... اب اپنے گھر چلی جاؤ۔'' شریف گھرانوں کی بچیاں زیادہ رات تک باہر نہیں رہتیں۔''

''اپنے گھر .....؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ہاں اپنے گھر۔'' پھر وہ ایک دم میری طرف مڑ گئی۔ ''چلئے پھوپھو ہمیں کتنی دیر ہوگئی ہے۔'' وہ دو قدم میری طرف بڑھی لیکن پھر یوں بھابی کی طرف مڑ گئی جیسے اسے بجلی کے ننگے تار نے چھو لیا ہو۔ اور ان کی بانہوں میں گر گئی۔

''امی امی اب آپ کو کہاں پاؤں گی امی مجھے اپنے ساتھ لے جائیے مجھے ممتا کی ضرورت ہے' مجھے ماں کے پیار کی پیاس ہے میں' میں تھک گئی ہوں امی'' وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ میں اپنی

سسکیاں دبانے کے لئے ہونٹ کاٹ رہی تھی اور بھابی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی جارہی تھیں۔

''سنبھلو بیٹی خدا کے لئے سنبھل جاؤ صرف یہ سوچ کر سنبھل جاؤ میری جان کہ تمہاری یہ حالت مجھے اور بھی رسوا کردے گی۔ اور میں' میں سوائے موت کے اور کوئی جائے پناہ نہ پاسکوں گی۔''

بھابی کے الفاظ نے جیسے اسے بیدار کردیا..... ''مجھے معاف کردیجئے امی' اور یقین رکھئے..... آپ کی بیٹی اتنی نادان نہیں..... کہ وہ آپ پر کوئی حرف آنے دے.....'' اس نے بھابی کے رخساروں کو کئی بار چوما..... اور پھر میری طرف آگئی۔

''چلئے پھوپھو.....'' وہ آگے بڑھ گئی..... ''خدا حافظ..... امی.....''

''خدا حافظ.....'' بھابی نے مجھے گلے لگا کر پیار کیا۔ ''اسے سمجھانا راجی..... وہ نادان ہے..... وہ ناسمجھ ہے.....'' انہوں نے روتے ہوئے کہا۔

''آپ فکر نہ کیجئے بھابی..... وہ مجھے بھی بے حد پیاری ہے..... میں اسے سمجھالوں گی.....'' خدا حافظ کہہ کر میں دو قدم آگے بڑھی..... پھر مڑ گئی.....

''آپ اتنی رات گئے تنہا کیسے جائیں گی بھابی.....؟''

''تم فکر نہ کرو راجی..... شاہد میرے ساتھ ہی ہے..... جاؤ..... خدا حافظ.....''

تیزی سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو انہوں نے آنچل میں سمولیا..... مونا چند قدم آگے تھی..... اس نے بھابی سے پھر ملنے کا وعدہ نہیں لیا۔ ان کے گھر کا پتہ نہیں پوچھا..... بس یوں لگا جیسے دو اجنبی سر راہ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔

دوسری صبح میں اس کے کمرے میں گئی تو وہ باتھ روم میں گئی ہوئی تھی۔ اس کی ڈائری اس کے پلنگ پر پڑی تھی۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ رات ہی اس نے ڈائری لکھی تھی:

آج ..... آج میری زندگی کا بہترین دن تھا ..... لیکن..... بے انتہا تاریک رات ..... امی ..... خدا نے میری دعائیں سنیں..... لیکن چند لمحوں کے لئے..... ہال میں میں نے دیکھا..... میری پینٹنگ ماں کے سامنے بالکل ویسی ہی شکل وشباہت کی ایک عورت کھڑی تھی۔ میں دُور کھڑی دیکھتی رہی' وہ بار بار آنسو پونچھ رہی تھی۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جھک کر ماں کے قدموں میں جھکی ہوئی بیٹی کو چوم لیا۔

یہ سب دیکھ کر ..... میرے دل نے سرگوشی کی..... یہ تمہاری ماں ہے..... یہی وہ ہستی ہے جسے تم نے دن کے اجالوں ..... اور رات کی تاریکیوں میں پکارا ہے اور میں بے اختیار ان کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے بے اختیارانہ انداز میں سرگوشی کی۔ ''امی'' اور انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا ..... اور پھر ..... پھر بیٹی کہہ کر ..... مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔ انہوں نے مجھے بیٹی کہا تو میری روح جھوم اٹھی ..... انہوں نے مجھے مونا کہہ کر پکارا..... تو مجھے یوں لگا ..... ساری دنیا میرے اردگرد خوشی سے رقص کررہی ہے۔ ان کے سینے سے لگ کر میں ماضی کی ہر تلخی بھول گئی۔ میرا جی چاہا ان بھاگتے ہوئے لمحات کے قدموں میں بھاری بھاری زنجیریں ڈال کے روک لوں اور اس ممتا بھرے سینے سے لگے زندگی گزاردوں ساری زندگی۔

لیکن..... کبھی خواہشیں بھی پوری ہوئی ہیں.....

یہ ملاپ بھی کتنا لحاتی تھا..... آپ پھر دنیا کے جنگل میں گم ہوجائیں گی امی اور میں' میں آپ کو پکارتے پکارتے دنیا کے آخری سرے تک جا پہنچوں گی۔ کاش' کاش وقت کو روکا جاسکتا۔

اس کے بعد آنسوؤں کے نشان تھے۔ مانی' میرے منے بھیا تم نے بھی دنیا سے منہ موڑ لیا۔ اب تک میں یہی سوچا کرتی تھی تم امی کا سہارا بن کے ان کی زندگی میں خوشیوں کے اُجالے بکھیر دو گے۔ لیکن آہ' میری بدقسمت ماں مقدر نے آپ سے وہ آخری سہارا بھی چھین لیا۔ امی میں' میں آپ کا سہارا بن جانا چاہتی ہوں امی لیکن یہ زنجیریں۔

اس کے قدموں کی آواز سن کر میں اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے غم کا اندازہ کرکے میں اپنے آنسو روک نہ سکی۔ اور اسی رات کھانا کھانے کے بعد وہ میرے کمرے میں ہی آگئی۔

''پھوپھو..... اگر آپ سے امی کے متعلق کچھ پوچھوں تو کیا آپ مجھے ٹھیک ٹھیک سب کچھ بتا دیں گی۔''

اس نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ اس کے ہاتھوں میں ریڈرز ڈائجسٹ تھا جس کے صفحے وہ بے چینی سے الٹ رہی تھی۔

میں نے ذرا حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مونی آج تک میں نے تمہیں کوئی غلط بات بتائی ہے؟''

''نہیں پھوپھو.....'' اس نے لاڈ سے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔

''صرف اتنا بتا دیجئے کیا امی آوارہ تھیں کسی غیر آدمی سے ملتی تھیں جس کی وجہ سے ابو نے انہیں گھر سے نکال دیا۔''

میں نے آہستہ سے اس کے بازو علیحدہ کئے اس کی طرف دیکھا تو جیسے وہ پکار پکار کر کہہ رہی تھی اس بات کی تردید کردیجئے پھوپھو مجھ سے صرف یہ کہئے کہ میری امی معصوم تھیں بے گناہ تھیں۔

''اتنی غلط اطلاع تم نے کہاں سے حاصل کی ہے مونا۔ تمہاری امی تو انتہائی معصوم سیرت اور فرشتہ سیرت تھیں۔ انہیں آوارہ کس نے کہا ہے مونا.....؟'' میں نے غصہ میں اس سے پوچھا تو وہ حیرانگی سے بولی ''تو کیا یہ جھوٹ ہے پھوپھو.....؟''

''جھوٹ ..... سراسر جھوٹ..... بات صرف اتنی سی ہے کہ تمہاری سگی نانی نے حالات سے مجبور ہوکر تمہاری امی کو مجیب چچا کی گود میں دے دیا۔ تمہاری امی کے دو بھائی بھی تھے جن میں سے ایک نہایت آوارہ اور بدمعاش ہوگیا اور دوسرا انتہائی بدقسمت۔ جب فاقوں کو نوبت پہنچتی تو وہ تمہاری امی کے پاس مدد لینے کے لئے چلا آتا اور اس بات کو غلط رنگ دے کر یہ کہا گیا کہ بھابی کے اس کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں۔ تمہاری پیدائش کے کئی سال بعد مامون کی پیدائش کو اسی سلسلے کی ایک کڑی بنا دیا گیا اور اس طرح ایک بے گناہ عورت ظلم وستم کی دہکتی آگ میں جھونک دی گئی۔''

وہ حیرانگی سے ساری بات سن رہی تھی۔

''تو اس کا مطلب ہے پھوپھو امی بے گناہ تھیں مظلوم تھیں؟'' اس نے غم وغصہ سے لرزتی آواز میں کہا۔

''ہاں مونا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''کیا ابو کو سارے حقائق کا علم نہیں تھا پھوپھو.....؟''

''انہیں ساری بات ابا جان نے بتا دی تھی مونا لیکن انہیں جن ذرائع سے یہ باتیں پتہ چلی تھیں اس

سے انہوں نے ابا کی بات پر کان نہیں دھرے اور دوسروں کے کہنے میں آ گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اب جبکہ بھائی کا کردار داغدار ہو چکا ہے کہیں اس کا اثر تمہارے مستقبل پر نہ پڑے اس لئے انہوں نے یہ قدم اُٹھایا۔''

''کیا آپ کا خیال ہے ابو کا یہ فعل میرے لئے سودمند تھا یا آیندہ ہوگا؟۔''

سوال بڑا ٹیڑھا سا تھا' میں کیا جواب دیتی لیکن جواب دینا بھی ضروری تھا۔

''انہوں نے تمہاری بہتری ہی سوچی تھی مونا اور اب تک تو خدا کا شکر ہے سب ٹھیک ہی چل رہا ہے آیندہ بھی مجھے امید ہے تم ان کی خواہشات پر پوری اُترو گی۔''

اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور ہونہہ کہہ کر سر جھٹک دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

''مونا'' میں نے آہستہ سے اسے پکارا ''کیا میں تم سے ایک سوال کر سکتی ہوں؟۔''

اس نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا۔

''پوچھنے کی کیا ضرورت ہے پھوپھو۔''

''تاکہ تم اس کا صحیح جواب دے سکو۔''

''تو پھر پوچھئے۔''

''تمہیں اپنے ابو سے کتنی محبت ہے؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا تو وہ کتنی ہی دیر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی ''ایک بیٹی ہونے کے ناطے سے میرے دل میں بھی ان کے لئے وہی تمام جذبات ہیں پھوپھو جو ایک بیٹی کے دل میں باپ کے لئے ہوتے ہیں اور یہ سب اس لئے ہے کہ انہوں نے میری بہتری کے لئے اپنے آپ کو تنہائیوں کی آگ میں جھونک دیا..... لیکن.....''

وہ رُک گئی۔

''لیکن کیا مونا.....؟'' اس کی خاموشی بڑی جان لیوا تھی۔

''لیکن..... مجھے ان سے ہمیشہ شکایت رہے گی پھوپھو۔ وہ میری جسمانی خواہشات تو پوری کرتے ہیں..... لیکن..... انہوں نے میری روح میں جھانک کر کبھی نہیں دیکھا..... انہوں نے مجھے شفقت پدری سے کبھی نہیں نوازا..... انہوں نے میرے دُکھ سکھ کے متعلق جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی..... اور اس طرح..... مجھے کبھی کبھی یوں لگتا ہے پھوپھو..... وہ بڑے ظالم ہیں..... اور اس وقت میرا دل..... میرا دل نہ جانے کیا کیا چاہنے لگتا ہے.....؟''

مجھے اس کی صاف دلی پر تعجب ہوا۔ میں نے سوچا تھا وہ کہے گی ''میں ابو سے بے انتہا پیار کرتی ہوں۔''

''مجھے تمہارے سچ بولنے پر خوشی ہوئی ہے مونا..... لیکن یہ کبھی نہ سوچنا کہ بھیا ظالم ہیں۔ ان کی اپنی کچھ مصروفیات ہیں اور وہ خود کتنے دُکھی ہیں تمہیں اس کا اندازہ بھی نہیں ہے۔''

''لیکن پھوپھو اسکے باوجود وہ میرے والد ہیں اور بہرحال میری زندگی کے دُکھ سکھ ان کی ذات سے وابستہ ہیں۔''

''مجھ سے وعدہ کرو مونا تم بھیا کے جذبات و احساسات کا ہمیشہ احترام کرو گی۔''

''میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے پھوپھو اور آیندہ بھی کروں گی لیکن اتنی بات ضرور ہے پھوپھو کہ میرے اپنے بھی کچھ جذبات ہیں جن کا مجھے خیال رکھنا پڑتا ہے۔''

Pakistanipoint.com

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن خاندان اور باپ کی عزت اپنے جذبات سے فرق نوعیت کی مالک ہوتی ہے مونا۔''

''میں سمجھتی ہوں پھوپھو اور مجھے اس کا احساس ہے۔'' کچھ دیر وہ کچھ سوچتی رہی پھر کھڑی ہوگئی۔ اس بات کا یقین رکھئے پھوپھو کہ میری طرف سے کبھی کسی غلط کام میں پہل نہیں ہوگی۔ اچھا شب بخیر۔''

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں سوچتی رہ گئی مونا کی شخصیت کس قسم کی ہوگی اسے باپ سے محبت بھی تھی اور باپ کو وہ ظالم سمجھنے میں بھی حق بجانب تھی۔ اگر بھیا اسے اپنا سارا پیار دے دیتے تو وہ انہیں شاید کبھی ظالم نہ کہتی۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا مونا کا زیادہ وقت اپنے دوست واحباب کی ضیافتوں میں گزرنے لگا تھا۔ میں نے ایک دوبار اسکی توجہ اس طرف دلائی تو اس نے صرف اتنا کہا ''اگر میں دل بہلانے کا یہ سامان بھی نہ کروں پھوپھو تو میری سوچیں مجھے پاگل کردیں۔''

دوستوں خصوصاً لڑکوں کے حلقے میں وہ بے انتہا پسند کی جارہی تھی بظاہر وہ بہت خوش تھی لیکن بھیا سے خاصی کبیدہ خاطر نظر آتی۔

ایم ایس سی کے بعد میرا تقرر ایک مقامی کالج میں ہوگیا تھا۔ اور مونا ان دنوں بی اے میں تھی۔ جنوری کا تیسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا بارشیں شدید تھیں اور سردی شباب پر تھی۔ مجھے کالج جوائن کئے کچھ زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی ان دنوں تفریحی ٹورز ادھر ادھر جارہے تھے مختلف تقریبات کے ہنگاموں سے کالجوں کی فضائیں پر رونق ہورہی تھیں۔

مونا بھی اپنی فرینڈز کے ساتھ سوات گئی ہوئی تھی۔ کالج میں اور ادھر ادھر ملنے والوں کے حلقوں میں' میں ان دنوں عجیب وغریب سرگوشیاں سُن رہی تھی اور یہ سرگوشیاں بھیا کی شادی کے متعلق تھیں۔ مجھے یقین کسی طرح نہیں تھا بھلا بھابی سے اتنے سالوں کی علیحدگی کے بعد اور اس عمر میں انہیں دوبارہ شادی کی کیا ضرورت تھی۔

لیکن۔

یہ ایٹم بم بھی ایک روز گرنا ہی تھا۔ میں کالج سے لوٹی تو گھر میں عجیب گہما گہمی کا سماں تھا۔ بھیا کے چند دوست بھی آئے ہوئے تھے۔ ٹیکسی سے اُتر کر میں برآمدے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ ایک صاحب کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ ''راوینہ بڑی خوبصورت اور سمجھدار لڑکی ہے یوں سمجھئے راشد صاحب کی زندگی میں رنگ بھر دے گی۔'' مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا لیکن یہ حقیقت تھی اور اب اس سے فرار ناممکن تھا۔ میں تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آگئی اور پلنگ پر گر سی گئی۔ میرا دل کٹ رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو گرتے جارہے تھے۔ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی۔ جی چاہ رہا تھا ہر شے کو آگ لگا دُوں۔ غم اس بات کا تو نہیں تھا کہ گھر کیوں بسا رہے ہیں صرف مونا کا خیال تھا۔ وہ جب آکے یہ سب کچھ دیکھے گی تو اس پر کیا بیتے گی۔ اس نے کہا تھا' ابو نے میری خاطر تنہائیوں کی آگ میں جلنا منظور کیا اس وجہ سے میرے دل میں ان کا احترام ہے اور اب جب بھیا کو اس کی شادی کرنا چاہئے تھی انہوں نے خود دولہا بن کر اس کے نازک احساسات کو کچل دینے کے اسباب مہیا کئے تھے۔ مجھے اس بات کی پریشانی تھی کہ مونا جو پہلے ہی خوفزدہ ہرنی کی مانند رہتی تھی اب ضرور اس ڈرامے

سے کوئی خاص اثر قبول کرے گی۔

بھیا کی آواز کتنی دُور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر وہ میرے کمرے میں آ گئے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں وہ میرے قریب بیٹھ گئے۔

''تم رو رہی ہو راجی؟۔''

''رونے کے سوا اور میں کیا کر سکتی ہوں۔''

میری آواز غصہ اور آنسوؤں کا امتزاج تھی۔

''وجہ؟''

''اس گھر پر منڈلانے والی تباہی کے اثرات دیکھ کر رو رہی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''بچہ نہ بنئے بھیا!'' میں بیٹھ گئی۔ مونا کو اس وقت آپ نے ماں کی ممتا اور شفقت سے بغیر کسی وجہ کے محروم کر دیا۔ جب اسے ماں کی بے انتہا ضرورت تھی۔ آپ نے کہا تھا میں اسے اپنی ساری شفقت اور محبت دے دُوں گا۔ گنوائیے وہ لمحات جب آپ نے اسے اپنی شفقتوں سے نوازا ہو..... اور اب..... جب آپ کو اس کی شادی کرنی چاہئے تھی آپ اپنی شادی رچا کر اس پر ایک ستم ڈھا رہے ہیں۔ اب اتنے سالوں کے بعد آپ کو شادی کی ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی ہے اور اگر یہ مسئلہ ایسا ہی ضروری تھا تو کم از کم پہلے اس کی شادی تو کر دی ہوتی۔''

بھیا نے سر جھکا کر کچھ سوچا۔

''میں تنہا چلتے چلتے تھک گیا ہوں راجی۔ مجھے کسی سہارے، کسی ہمدرد و غمگسار کی ضرورت ہے۔ کیا تمہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''بھیا..... آپ کے سوا بھی میرا دنیا میں کوئی ہے جس سے میں ہمدردی کروں گی..... لیکن..... لیکن آپ نے آگ پر چلنا خود پسند کیا تھا بھیا..... میرے تو روئیں روئیں سے آپ کے لئے دعائیں نکلتی ہیں بھیا..... لیکن میں کیا کروں..... آپ نہ صرف خود تباہیوں کو بلا رہے ہیں بلکہ انہیں گلے لگا رہے ہیں..... خدایا تُو رحم کر.....''

آخر وہ میرے بھائی تھے ان کے دُکھوں پر میں تڑپ تڑپ کے روئی تھی اور ان کی زیادتیوں پر ان سے جھگڑی تھی لیکن اب..... مسئلہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ ایک طرف بھیا تھے اور میں جانتی تھی وہ اپنے حال میں مست ہیں لیکن دوسری طرف مونا تھی جس کا تڑپنا بڑا جان لیوا ہوتا تھا۔

''چند مہمان آ رہے ہیں راجی ان کو ذرا.....''

''پلیز بھیا..... مجھے اس سارے ڈرامے سے کوئی دلچسپی نہیں، خدارا مجھے معاف کر دیجئے میں کچھ نہیں کر سکتی۔'' وہ خاموشی سے اُٹھ کر چلے گئے اور میں کمرہ بند کر کے لیٹ گئی۔ مجھے کچھ خبر نہیں کیا ہوتا رہا۔ کئی بار یاسمین نے دروازے پر دستک دی، سوسن نے پکارا لیکن میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ نہ مجھے بھوک تھی نہ پیاس، مجھے صرف سکون کی تلاش تھی جو نا پید تھا۔

میں نے دو روز کی کالج سے چھٹی لے لی لوگوں کی باتیں سننے کی مجھ میں سکت نہیں تھی۔

اور تیسرے ہی روز مونا لوٹ آئی۔ اس کا چہرہ خاصا اُترا ہوا تھا۔ خلاف توقع ان کا ٹرپ چند روز پہلے لوٹ آیا تھا کیونکہ ایک لڑکی شدید زخمی ہو گئی تھی۔ مونا سیدھی میرے کمرے میں آ گئی ''کیا یہ سچ ہے پھوپھو کہ ابو نے راوینہ سے شادی کر لی ہے؟''

اس نے آتے ہی سب سے پہلا سوال کیا۔

میں اس کے جواب کے لئے بالکل تیار نہیں تھی اس کا

منہ دیکھ کر رہ گئی۔ ''بولئے نا پھوپھو...... بتایئے نا......؟'' اس نے کندھوں سے پکڑ کر مجھے جھنجوڑا۔

''ہاں مونا۔'' میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

اس کے چہرے پر غم کا ایک سایہ سا لہرایا۔ اس نے تکیہ کا سہارا لیا اور چینے پر گر سی گئی۔ اس کی حالت بالکل ایک ایسے مسافر کی سی تھی جسے دن دہاڑے کسی نے لوٹ لیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے لیکن اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور جب تک میں اس کے خیالات سمجھتی وہ گر چکی تھی۔

''مونا......''

میں نے تیزی سے لپک کر اسے سنبھالا۔ ''مونا'' لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ میری آواز کی پہنچ سے دُور۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے اسے سیدھا کر کے لحاف اُوڑھایا اور جلدی سے ڈاکٹر کو فون کیا۔ فون کر کے یاسمین کو بلایا' میں کیا کر سکتی تھی سوائے آنکھوں میں آنسو لئے اسے دیکھتے رہنے کے ''انہیں کیا ہوا بی بی......؟''

یاسمین کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا وہ پودا جسے میں نے محنت سے سینچ سینچ کر اور تند و تیز طوفانوں سے بچا بچا کر پالا تھا ' گر جانے کو ہے۔ میں نے دُکھ اور خوف سے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

''میں تمہیں مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی مونا تم جو میری روح ہو میری زندگی کا ماحصل۔''

میں نے سسکی روکتے ہوئے سوچا اور دعا کے لئے ہاتھ اُٹھا دیئے۔

زندگی دینے والے اسے زندگی عطا کر مجھ سے میری آخری متاع نہ چھین میرے مالک۔

روشن بابا کے ساتھ ڈاکٹر رضوی اندر آ گئے۔

''کیا ہوا راضیہ بٹی۔'' انہوں نے مجھے پریشان دیکھ کر پوچھا۔ ''مونا بے ہوش ہو چکی ہے ڈاکٹر۔''

''او ...... حملہ بڑا شدید ہے۔'' وہ آہستہ سے بڑبڑائے اور میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ وہ کتنی ہی دیر اسے آلے لگا کر دیکھتے رہے اور پھر ایک انجکشن لگا دیا۔

''کوئی بہت بڑی خبر سنی ہے جس کا فوری اثر اعصاب پر ہوا ہے۔''

''یہ بچ جائے گی نا ڈاکٹر۔'' میں نے لرزتی آواز سے پوچھا۔ ''خدا سے دعا کرو بٹی مایوسی کفر ہے۔'' وہ ایک اور انجکشن لگا رہے تھے۔

'' راشد میاں کہاں ہیں کہیں گئے ہوئے ہیں......انہیں بلا لو بٹی اور ان سے کہنا ڈاکٹر عباس کو ساتھ لیتے آئیں۔ بچی کی حالت انہیں بتا دینا......''

میرا جی چاہا پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دوں سر کو دیواروں سے ٹکرا کر پھوڑ لوں لیکن وقت حوصلے سے کام لینے کا تھا۔

میں نے راوینہ کے گھر کا فون نمبر ملایا ''ہیلو بھیا ہیں تو انہیں فون دیجئے۔'' میں نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔ ادھر سے بھیا کی آواز آئی۔

''بھیا میں راجی بول رہی ہوں فوراً گھر آیئے مونا بے ہوش پڑی ہے۔ اس پر کسی بات کا شدید اثر ہو گیا ہے۔'' یہ جملے شاید میں نے صدیوں میں ادا کئے۔

''مونا وہ تو سوات گئی ہوئی تھی۔'' یہ بھیا کے الفاظ تھے۔ ''وہ آ گئی ہے بھیا' ڈاکٹر رضوی آئے ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں ڈاکٹر عباس کو لے کر فوراً پہنچئے وہ ...... وہ ...... اس کی حالت ...... خطرے میں ہے بھیا......'' یہ کہتے کہتے میرے ضبط کے بند ٹوٹ گئے

اور میں کریڈل پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

کتنی دیر میں روتی رہی مجھے کچھ خبر نہیں بھیا کی آواز پر راہداری میں نکل آئی۔

''بھیا میں ان سے لپٹ گئی..... مونا..... میری مونا.....''

'' راجی حوصلہ کرو راجی مجھے دیکھنے تو دو۔''

انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لگالیا اور ڈاکٹر عباس کو لئے ہم بے ہوش مونا کے پاس پہنچ گئے۔

میری حالت پاگلوں کی سی ہورہی تھی۔ ڈاکٹر عباس نے ڈاکٹر رضوی سے کچھ پوچھا اور پھر مونا پر جھک گئے۔ میں ٹکٹکی باندھے ان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی اور ان کے تاثرات سے فوراً کوئی اچھا نتیجہ نکالنا چاہتی تھی۔

بھاری بھاری قدموں سے چلتے ہوئے کئی لمحے گزر گئے اور یہ لمحے میرے لئے قیامت سے کم نہ تھے پھر ڈاکٹر عباس نے ایک انجکشن تیار کر کے سوئی مونا کے بازو میں چبھو دی۔ ہم سب بُت بنے کھڑے تھے۔ موت وحیات کی کشمکش جاری تھی اور ان چپ چاپ گزرتے لمحوں میں کتنے ہی انجانے اندیشے تڑپ رہے تھے۔ کمرے کی خاموشی فضا میں جیسے موت کے فرشتے کے پروں کی سرسراہٹ تھی۔ دل جیسے دھڑکنا بھول چکے تھے۔ میں دم بخود بھیا کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور ہمارے کچھ پیچھے راویہ شوخ سے رنگ کے لباس اور زیوروں میں ملبوس کھڑی تھی اور یاسمین سجدے میں پڑی سسک سسک کر اس کی زندگی کی دعا مانگ رہی تھی۔ سوسن کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہی سوسن جس کی گود میں مونا نے بچپن اور لڑکپن کے دن گزارے تھے اور جس نے لوریاں دے دے کر اسے جوان کیا تھا اور آخر میں روشن بابا تھے آنسوؤں سے تر جھریوں والا چہرہ لئے آسمان کی طرف دیکھے جارہے تھے۔

ان سب دُکھی دلوں سے نکلنے والی دعائیں آخر سن لی گئیں۔ مونا نے کراہ کر سسکی لی' ذرا سی آنکھیں جھپکیں اور پتھرائی ہوئی سی آنکھیں بھیا کے چہرے پر آ کے رُک گئیں۔ اُف ان نظروں میں ایک التجا تھی رحم کی التجا جیسے وہ بھیک مانگ رہی ہوں۔ وہ آنکھیں نہیں کسی بھکاری کے خالی کشکول تھے۔ میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔

بھیا آہستہ سے آگے بڑھ کے اس کے قریب بیٹھ گئے۔ مونا کی نگاہوں کا مرکز اب تک ان کا چہرہ تھا۔ بھیا نے جھک کر اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ مونا کے لبوں سے ایک سسکی نکلی اور اس کے بازو ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح بھیا کی جھکی ہوئی گردن میں حمائل ہوگئے ''ابو.....'' اس نے سسکی لی..... ''ابو جان.....''

''مونا میری بیٹی'' جانے کتنے عرصے کی ترسی ہوئی روح نے ان دو لفظوں سے شفقت کے خزانے لوٹ لئے تھے کہ مونا نے اپنا سر بھیا کے گھٹنے سے لگادیا۔

''آپ' آپ صرف میرے ابو ہیں۔'' وہ بے اختیار رو رہی تھی اور ڈاکٹر عباس کہہ رہے تھے۔

''بچی جتنا زیادہ روئے گی اس کے لئے اچھا ہے۔'' وہ بھیا سے لپٹی بالکل ایک ایسے بچے کی طرح روئے جارہی تھی جس کا لوٹا ہوا قیمتی کھلونا بڑے عرصے بعد اسے واپس مل جائے۔

اور جب روتے روتے وہ نڈھال ہوگئی تو ڈاکٹر عباس نے اسے نیند اور سکون کی دوا دی اور وہ بھیا کے گھٹنے سے لگے لگے سوگئی۔

''اسے کسی قسم کی کوئی بات سوچنے نہ دینا بیٹی۔'' ڈاکٹر عباس نے مجھے آہستہ سے سمجھایا اور پھر سب

سیارہ ڈائجسٹ

آپ سے تحریریں طلب کرتا ہے

اور آپ کو صلاحیتوں کے اظہار کے **بھرپور مواقع** فراہم کرتا ہے

کیا آپ زندگی میں کبھی **عجیب و غریب** واقعات سے دوچار ہوئے ہیں؟

کیا آپ نے کہیں کوئی **دلچسپ** بات پڑھی ہے؟

کیا آپ یا آپ کے کسی واقف کار کے ساتھ کچھ **ان ہونے واقعات** گزرے ہیں؟

تو زیادہ سے زیادہ دو ہزار الفاظ میں ہمیں لکھ بھیجئے، ہم اسے آپ کی تصویر اور تعارف کے ساتھ شائع کریں گے

کہانی کوئی دلچسپ کہانی جو پڑھنے والوں پر تاثر چھوڑ جائے

تاریخی کہانی اسلامی تاریخی پس منظر میں لکھی جانے والی کہانی

ترجمہ انگریزی یا کسی اور غیر ملکی زبان سے ترجمہ شدہ کہانی

شرائط

1- کاغذ کے ایک طرف لکھئے۔
2- کھلا اور صاف ستھرا لکھئے۔
3- بہتر ہے ٹائپ کروالیجئے۔
4- اقتباس یا تلخیص کی صورت میں اصل حوالے یا کتاب کا نام مع مصنف لکھئے۔
5- کہانی کے اختتام پر اپنا نام، پتا لکھنا نہ بھولئے۔
6- مختصر تعارف اور پاسپورٹ سائز تصویر مسودہ کے ساتھ منسلک کریں۔
7- مسودہ واپس چاہیے ہو تو جوابی لفافہ ساتھ بھیجئے۔

Pakistanipoint.com

کمرے سے نکل گئے۔ ڈاکٹر عباس اسی وقت واپس لوٹ گئے تھے لیکن ڈاکٹر رضوی بھیا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھے رہے تھے۔ ان کے درمیان کوئی نہایت اہم بات ہورہی تھی۔ جس کے متعلق مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا۔

مونا سورہی تھی اور میں اس کے قریب بیٹھی سوچ رہی تھی آخر مونا کب تک سوتی رہے گی اس کی آنکھ کھلے گی اور اس کے سامنے سارے حقائق ہونگے۔ ان کا سامنا وہ کب تک بے ہوش ہوکر کرتی رہے گی۔

بھیا کے راوینہ سے شادی کرنے کا قدم میرے لئے صرف اسی وجہ سے پریشانی کا باعث بنا تھا ورنہ مجھے یہ احساس کب نہ ہوا تھا کہ وہ تنہا ہیں۔ اپنا دُکھ درد کسی سے نہیں کہہ سکتے اور ان کی دلچسپیاں منتشر ہوکر رہ گئی ہیں لیکن اگر وہ اسی وقت شادی کرلیتے تو شاید مونا اس کا اتنا گہرا اثر نہ لیتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت وہ ایک خاص حادثے سے گزر رہی تھی اب تو وہ یہ جانتی تھی کہ بھیا اگر آج اس سے زیادہ محبت کا اظہار نہیں کررہے تو کچھ عرصہ بعد انہیں اسی کی طرف لوٹنا پڑیگا اس لئے کہ وہ ان کی تنہا اولاد تھی اور اب اس کے لئے ان کے ساتھ کسی اور کو منسوب کرنا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔

اور شادی کی خبر سُن کر یہ سُن کر کہ کوئی اور ہمیشہ کے لئے اس کے ابو کا ساتھی بن گیا ہے اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔

اور میں کل کے متعلق سوچ سوچ کے پریشان ہوتی رہی۔

اس سیاہ پریشان کن رات کے دس بجنے والے تھے۔ میں سوچوں کے اتھاہ گہرے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی کہ قدموں کی آواز نے مجھے خیالوں کی دنیا سے نکال دیا۔ میں نے دیکھا راوینہ میرے قریب کھڑی تھی۔

''اب کیا حال ہے مونا کا..... راجی.....''

میں گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ اب تک میری راوینہ سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی بلکہ سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے مونا کی بے ہوشی کے وقت صرف ایک نظر اسے دیکھا تھا اب وہ میرے بالکل سامنے تھی۔ گہرے میک اپ کی تہوں میں چھپا ہوا چہرہ کٹے ہوئے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اور گہرے تربوزی رنگ کی ساڑھی' وہ یوں سج بن کر آئی تھی جیسے کسی شادی میں شرکت کے لئے تیار ہوئی ہو۔

''سورہی ہے۔'' میں نے آہستہ سے اس کی بات کا جواب دیا۔ وہ میرے اور قریب آگئی۔

''تم ادھر ہمارے پاس آجاتیں اس وقت سے یہاں تنہا بیٹھی ہو۔'' اس کی آواز میں خاصا طنز تھا۔

''میں..... میں ان تنہائیوں کی عادی ہوں۔'' میں نے پھر آہستہ سے کہا تو وہ ہنس پڑی۔ ''بیٹھیے'' میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا تو وہ ذرا سا تن گئی۔

''انسان کو تو انجمنوں کی ضرورت ہوتی ہے راجی' تم کیوں تنہائی پسند ہو۔ ویسے راشد کہہ رہے تھے.....'' اس نے ذرا چبا کر کہا ''کہ راجی بڑی سمجھدار لڑکی ہے۔''

میں اس کا طنز سمجھ گئی تھی۔

''یہ ان کا اپنا خیال ہے ورنہ میں اتنی سمجھدار نہیں۔ دراصل حالات نے مجھے کبھی کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔'' میرے الفاظ میں گہری تلخی تھی اس نے فوراً موضوع بدل دیا۔

''اس کے لئے سکون کی نیند اچھی ہے..... ویسے اسے ہوا کیا تھا.....'' میں نے ذرا غور

سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے خود کچھ خبر نہیں اور سکون گولیوں کے سہارے مل ہی جاتا ہے۔''

''راشد بتا رہے تھے ہونا سوات گئی ہوئی ہے اور کافی دنوں میں لوٹے گی۔''

''جی ہاں پروگرام تو ان کا یہی تھا لیکن ایک لڑکی کے زخمی ہوجانے کی وجہ سے وہ جلد لوٹ آئی۔''

کچھ دیر وہ بے مقصد دیواروں کو گھورتی رہی ''بڑی خوبصورت پینٹنگز لگا رکھی ہیں۔''

''مونا نے بنائی ہیں۔''

''میں نے نئے فنکاروں کی نمائش میں اس کی پینٹنگز دیکھی تھیں بڑی اچھی تھیں۔''

''جی ہاں وہ پیدائشی فنکار ہے۔''

''لیکن ایک بات ہے راجی وہ ہمیشہ المیہ تصاویر بناتی ہے اس عمر میں اسے اتنا یاس پسند نہیں ہونا چاہئے۔''

''جو کچھ اس کے ماحول نے اسے دیا اس کے ذہن نے اپنا لیا۔ جب انسان کی زندگی بذات خود تصویر الم ہو تو اس کا فن خوشیوں کا مرقع کیسے بن جائے گا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں اب اس کے غم اور خوشیاں آپ کے ہاتھ میں ہیں' کوشش کیجئے گا کہ وہ اپنے نظریات بدل ڈالے۔'' شاید وہ مجھ سے اتنا کچھ سننے کی متوقع نہ تھی۔ فوراً کھڑی ہوگئی ''اچھا اب میں چلوں راشد منتظر ہوں گے.....'' اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے واپس پلٹ گئی اور اس کے جانے کے بعد میں ہلتے ہوئے پردوں کو دیکھتی رہی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے جب کھسر پھسر کی آواز پر میری آنکھ کھل گئی۔ میں وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ بھیا اور راوینہ کھڑے تھے۔ راوینہ نے ہلکے آسمانی رنگ کا سلک کا نائٹ سوٹ پہن رکھا تھا اوپر چائنا ورک کا نائٹ گاؤن تھا ''تم نے کھانا تو کھالیا ہوتا راجی' ہم نے تمہارا بہت دیر انتظار کیا لیکن تم آئی ہی نہیں۔'' وہ بڑے باتکلف انداز میں بول رہی تھی۔

''بھوک نہیں تھی۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کچھ اور کھالو کیا رات بھر بھوکی رہوگی؟'' یہ بھیا کی آواز تھی۔ میں نے آہستہ سے ان کی طرف دیکھا۔ ''فی الحال تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے بھیا۔''

''مونا کیسی ہے؟'' انہوں نے دوبارہ سوال کیا۔

''سو رہی ہے۔''

''تم سو جاؤ اب راوینہ اس کے پاس بیٹھے گی۔'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور مسکرادی۔

''مجھے کوئی تکلیف نہیں بھیا یہاں بیٹھنے میں..... اور پھر مونا سو رہی ہے انہیں تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''تکلیف کیسی بھئی۔'' وہ بڑے شائستہ سے بولی۔ ''رات بھر جاگنا خاصا مشکل کام ہے آپ سو جایئے میں بھی سو رہی ہوں۔''

دوبارہ انہوں نے رات بھر جاگنے کی پیش کش نہیں کی اور گڈ نائٹ کہہ کر دونوں کمرے سے نکل گئے۔

اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ مونا کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا تو بھیا کے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہوجاتی تھی اور وہ اسے اپنے سینے سے لگائے پہروں بیٹھے رہتے تھے اور ہزاروں روپے کے کھلونے' سکٹ اور ٹافیوں کے ڈھیر لگا دیتے تھے۔

اور آج صرف دو الفاظ کہنے کے سوا انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کچھ نہیں پوچھا تھا۔ کون جانے اس کی یہ بظاہر پرسکون نیند اس کے ذہن میں کیسے کیسے بھونچال اٹھا رہی تھی۔ پر انہوں نے اس کے پاس چند لمحے بیٹھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ وہ بیمار تھی اور کچھ دیر پہلے موت و حیات کی کش مکش سے نبرد آزما تھی وقت کتنی تیزی سے بدل جاتا ہے میں یہی سوچتی رہی اور رات بھر سو نہ سکی۔

صبح سورج کی پہلی کرنوں کے ساتھ مونا نے کروٹ بدلتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

''اُف میں کس قدر سوئی ہوں۔'' اس نے تکیوں کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں جاءنماز پر ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُٹھتے ہوئے میں نے دیکھا وہ سویٹر دیکھ رہی تھی جو میں نے اس کے لئے کل ہی مکمل کیا تھا ''اوہ پھوپھو ہاؤ سویٹ یو آر..... اس قدر شاندار پل اوور میں تو میں کس قدر سمارٹ لگوں گی۔''

یوں لگتا تھا جیسے وہ رات والے واقعہ کو بالکل بھول چکی تھی یا دانستہ اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہ رہی تھی۔ میں نے بھی اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا اور اس سے سوات کی باتیں پوچھتی رہی۔

''اوہ..... پھوپھو..... اس قدر مزا آیا نا کہ بس کیا بتاؤں۔ وادی سوات اتنی حسین ہے کہ دل چاہتا تھا وہیں رہ جاؤں اس قدر سیر کی کہ پل بھر کو ٹک کر نہیں بیٹھے ہم لوگ۔ وہاں کے چپے چپے کو دیکھا وہاں کے لوگ اتنے پرخلوص ہیں پھوپھو اور عورتیں اور بچے اتنے خوبصورت کہ بس دیکھتے ہی جائیں۔ میں نے ایک بچے کی اور ایک عورت کی تصویریں بنائی ہیں اور بھی بنانے کو جی چاہتا تھا لیکن ایک تو وقت نہیں تھا دوسرے پیسہ بہت مانگتے ہیں۔'' اور وہ زور سے ہنس پڑی ''جیب اجازت نہیں دیتی تھی۔''

اس نے اٹھ کر اٹیچی کھولا اور دو پینٹنگز سامنے رکھ دیں۔

چھ سات سال کے بچے کی تصویر تھی جو اپنے سامنے چھابڑی لگائے بیٹھا تھے۔ پوشیدہ' پھٹے ہوئے لباس میں سے جھانکتا ہوا جسم' ننگے پاؤں اور نگاہوں کے زاویئے اس کی غربت کی داستان کہہ رہے تھے۔ دو آنکھیں منتظر تھیں' کسی گاہک کی منتظر تھیں اور اس کے پیچھے گھاس پھونس کی بنی کٹیا میں سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا اور یاس کے سائے اندھیروں کے ساتھ پھیلتے محسوس ہوتے تھے پس منظر اتنا اُداس اُداس سا تھا جیسے ہر شے اشک افشاں ہے۔

اس کی بولتی ہوئی نگاہوں میں میں کھو گئی غربت و افلاس کی منہ بولتی تصویر۔ کئی لمحے گزر گئے تو مونا نے آہستہ سے دوسری پینٹنگ میرے سامنے کر دی۔

ایک انتہائی حسین و جمیل عورت نہایت بوسیدہ لباس میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی گود میں چند ماہ کا گول مٹول سا بچہ تھا۔ ماں بچے کی طرف انتہائی پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور بچہ اس کے سینے سے لگا زندگی کی حرارت اپنے جسم میں کھینچ رہا تھا۔ وہ اس پیار بھری دید میں اتنی محو تھی کہ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ ایک بہت بڑا سیاہ ناگ اس کے پاؤں کے بالکل قریب پہنچ چکا ہے۔ ماں اور بچے کے درمیان ایک خاص قسم کا اخلاص اور ممتا کا احساس اُبھرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پہلی تصویر کے نیچے انتظار اور دوسری کے نیچے ممتا لکھا تھا۔

(جاری ہے)